پاکستان میں اسلام اور لبرل ازم کی کشمکش

www.KitaboSunnat.com

ڈاکٹر اشتیاق احمد گوندل

شیخ زاید اسلامک سینٹر
پنجاب یونیورسٹی، قائداعظم کیمپس، لاہور

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ...عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

www.KitaboSunnat.com

پاکستان میں اسلام اور لبرل ازم کی کشمکش

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان میں اسلام اور لبرل ازم کی کشمکش

ڈاکٹر اشتیاق احمد گوندل

شیخ زاید اسلامک سینٹر
جامعہ پنجاب قائداعظم کیمپس، لاہور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

کتاب	:	پاکستان میں اسلام اور لبرل ازم کی کشمکش
مصنف	:	ڈاکٹر اشتیاق احمد گوندل، اسسٹنٹ پروفیسر شیخ زاید اسلامک سینٹر، جامعہ پنجاب، لاہور
ترتیب وتبییض	:	حافظ خبیب محمود
ناشر	:	شیخ زاید اسلامک سینٹر، جامعہ پنجاب، لاہور
کمپوزنگ	:	عظیم سرور شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور
صفحات	:	۲۶۲
تعداد	:	۵۰۰
سال اشاعت	:	اگست ۲۰۱۱ء ــ رمضان ۱۴۳۲ھ
قیمت	:	۴۰۰ روپے

فہرست مضامین

حرفِ آغاز	i
باب اول: پاکستان کی فکری بنیادیں	1
فصل اول	3
اسلام یا لبرل ازم	3
قیادت اور تحریک	3
فکری کشمکش	15
فصل دوم	20
تعمیرِ پاکستان میں مسلم لیگ کا کردار	20
حوالہ جات باب اول	30
باب دوم: لبرل ازم اور حکمران	33
فصل اول	35
قیادت کا بحران (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء)	35
فصل دوم	48
جنرل ایوب اور جنرل یحییٰ کے ادوار	48
جنرل یحییٰ خان	59
فصل سوم	63
بھٹو ازم	63
فصل چہارم	75
جنرل ضیاء سے جنرل مشرف	75
حوالہ جات باب دوم	88
باب سوم: پاکستان میں لبرل ازم کا فروغ	93
فصل اول	95

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان کا سیاسی کلچر	95
سیاسی جماعتیں	98
فصل دوم	105
میڈیا(Media)اور لبرل ازم	105
فصل سوم	131
لبرل ازم کے فروغ میں این جی اوز کا کردار	131
فصل چہارم	147
تحریک آزادئ نسواں	147
فصل پنجم	161
نظامِ تعلیم	161
حوالہ جات باب سوم	183
باب چہارم: پاکستان کی بقاء—امکانات و مسائل	189
فصل اول	191
لبرل جمہوریت اور اسلام	191
پاکستان میں جمہوریت کا تجربہ	193
فصل دوم	205
جمہوری جدوجہد اور اسلامی حکومت	205
لبرل جمہوریت افسانہ اور حقیقت	209
حوالہ جات باب چہارم	212
خلاصۂ بحث	215
حوالہ جات خلاصۂ بحث	228
مصادر و مراجع	229
اشاریہ	237
اسماء و اماکن	239

پیش لفظ

۱۸۰۱ء میں برصغیر کو دارالحرب قرار دینے کے بعد مسلمانوں نے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کے لیے جس جدوجہد کا آغاز کیا اس کو تاریخ میں تحریکِ پاکستان سے قیامِ پاکستان تک کے سفر کے نام سے جانا جاتا ہے۔

مسلمانوں نے یہ ملک اپنے ایمان، تہذیب اور تمدن کی حفاظت کے لیے لیا تھا، مگر بد قسمتی سے قیام پاکستان سے آج تک کی داستان عملی طور پر نہ سہی نظری طور پر اسی فکری کشمکش کے کرب سے گزرنے کا نام ہے جو قیام پاکستان سے قبل تھی۔

جس کی وجہ ایک محدود طبقہ نظریہ پاکستان، دستور پاکستان اور عوامی امنگوں کے برعکس اس کے فکری دھارے کو مغربی فکر و فلسفہ یعنی لبرل ازم اور سیکولرازم سے منسلک کرنا چاہتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ اقلیتی رائے اگرچہ جمہوریت کا دم بھرتی ہے مگر چونسٹھ برس گزرنے کے باوجود نظریہ پاکستان اور عوامی امنگوں کی ترجمانی سے انحراف کی راہ اپنائے ہوئے ہے۔

اس اقلیتی لبرل طبقہ کو شاید یہ بات معلوم نہیں کہ عالم اسلام اور پاکستان کے مسلم معاشرہ میں لبرل ازم اور جبر ساتھ ساتھ چل رہے ہیں، وگرنہ امتِ مسلمہ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد پر عمل پیرا ہونے کے لیے اور ایسا نظم حکومت تشکیل دینے کے لیے تڑپ رہی ہے کہ اسلام اور حکومت و ریاست دو جڑواں بھائی ہیں۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔ پس اسلام کی مثال ایک عمارت کی ہے اور حکومت گویا اس کی نگہبان ہے۔ جس عمارت کی بنیاد نہ ہو وہ گر جاتی ہے اور جس کا نگہبان نہ ہو اسے لوٹ لیا جاتا ہے:

"الاسلام والسلطان أخوان توأمان لا یصلح واحد منهما الا بصاحبه فالاسلام أسّ والسلطان حارس وما لا أسّ له یهدم وما لا حارس له ضائع" (کنز العمال)

محترم ڈاکٹر اشتیاق گوندل کی زیر نظر کتاب جو دراصل پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے قیامِ پاکستان سے آج تک اسلام اور لبرل ازم کی فکری کشاکش کی تصویر ہے جس میں مقاصدِ پاکستان سے انحراف کی وجوہات، اسباب و علل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور نظریہ پاکستان پر پڑی گرد کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الحمدللہ سنٹر اب تک کم و بیش اکیس کتب شائع کر چکا ہے۔ یہ کتاب ان میں اہم اضافہ ثابت ہو گی۔ سنٹر کی آئندہ بھی یہی کوشش رہے گی کہ علمی موضوعات پر مزید مطبوعات سامنے لاتا رہے۔

ڈائریکٹر

محمد اعجاز

حرفِ آغاز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حرفِ آغاز

جکارتہ سے مراکش تک پھیلی ہوئی مسلم دنیا میں پاکستان کا امتیاز اور انفرادیت جغرافیہ، قدرتی وسائل، افرادی قوت، شرح خواندگی، زرمبادلہ کے ذخائر، نسل، زبان اور رنگ نہیں نظریہ ہے۔ اس نظریے کے کھرے اور ٹھوس ہونے کے باوجود مادیت، منافقت اور تجدد کے کئی التباس بھی پاکستان کی قسمت میں ہیں جن کے باعث مملکت خداداد کا نظریاتی تشخص میلا کر دیا گیا ہے۔ ہر برس ۱۴ اگست کی تقاریر، تجدید عہد اور نعرے بازی ہی پاکستان کا رشتہ مدینے سے جوڑتی ہے تو دوسری طرف ظلم، استحصال اور ناانصافی اسلام اور پاکستان کے مستقبل سے مایوس کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اس میں کیا شک ہے کہ تحریک پاکستان میں اگر اسلام کو بنیاد نہ بنایا جاتا تو پاکستان کا قیام ناممکن تھا۔ کیا پاکستان کے بانی محمد علی جناحؒ ایک کھرے اور سچے انسان نہ تھے جن کی دیانتداری اور سچائی کا ثبوت کافر دنیا بھی فراہم کرنے پر مجبور ہے مگر یہ حادثہ نہیں منظم سازش ہے کہ پاکستان کی نظریاتی اور فکری بنیادوں کو اول روز سے ہی چیلنج کر دیا گیا پاکستان کی اسلام کے ساتھ وابستگی کے حوالے سے سوال اٹھانے والے یہ تو نہ کر سکے کہ قائداعظم اور ان سے محبت کرنے والے عوام کے بارے میں کہہ دیتے کہ اسلام کو محض ایک جھوٹے نعرے کے طور پر بنیاد بنایا گیا۔ تاہم اقتدار پر قابض ہونے کے باعث ان سیکولر اور لبرل طبقات نے پاکستان کو اسلامی ریاست کی منزل سے دور رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ دوسری طرف یہ بھی ایک امید افزا سچائی ہے کہ لبرل طبقات اور تحریکوں کی جڑیں عوام کی بجائے چند مغرب زدہ جدید تعلیم یافتہ اور سیکولر سیاسی جماعتوں کی قیادت میں تھیں اس لیے پاکستان میں اول برس سے آج تک فکری کشمکش جاری ہے۔

عوام تو لبرل ازم، اس کی اصطلاحات اور اہداف کو نہیں جانتے مگر خواص یعنی مفکرین اور دانشور بھی لبرل ازم کی درجنوں تعریفات کرتے ہیں۔ ان تعریفوں کا اگر مزید گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو کئی علوم سے متعلق ہیں جن میں سیاسیات، فلسفہ، تاریخ اور معاشیات خاص طور پر قابل ذکر ہیں اس لیے تحقیقی و علمی بنیاد پر لبرل ازم کا مفہوم متعین کرنا مشکل ہے البتہ لبرل ازم کو جو عنوان بھی دیا جائے یہ "خواہش نفس" اور "لذت کے معبود کی پوجا" کی کئی شکلوں کا نام ہے جس کے لیے مادی سطح سے بلند ہو کر روحانی پاکیزگی اور اخلاقی اقدار کے لیے سوچنا ہی ناممکن ہے، بقول اقبال

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستانی معاشرے کے دین کے ساتھ لگاؤ کے باعث لبرل طبقے نے سمجھ لیا کہ براہِ راست دین پر نقب لگانے کی بجائے اسلام کو عیسائیت کی طرح کا مذہب ثابت کر دیا جائے جس کا کوئی سیاسی، معاشی اور معاشرتی کردار نہ ہو۔ اس لبرل طبقے کے پاس ریاست اور اس کے اداروں کے طاقتور ذرائع کیسے آئے اور انہوں نے اپنے اہداف کے لیے ان اداروں کو کیسے استعمال کیا یہ اس مقالے کی تحقیق کا اصل ہدف ہے ترجیحاً معاشرے کو علماء سے بدظن کرنے کی کوشش کی گئی اور مؤثر پروپیگنڈے سے ثابت کرایا گیا کہ علماء نے پاکستان کی مخالفت کی تھی یہ بھی کہا گیا کہ پاکستان میں کون سا اسلام نافذ کیا جائے۔ حتیٰ کہ اقبالؒ اور جناحؒ کی شخصیت پرستی کی آڑ میں اپنی من مانی تعبیرات اور فلسفوں کو اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا تصورِ اسلام قرار دیا گیا جبکہ علماء کرام میں سے ان کا ذکر تک کرنے سے گریز کیا گیا جنہوں نے محض اسلام کے سماجی اور سیاسی کردار کے فروغ کے لیے ریاست پاکستان کے قیام کی حمایت ہی نہ کی بلکہ عملی جدوجہد بھی کی۔

لبرل ازم کے حواریوں کے جارحانہ طرزِ عمل اور ریاستی اداروں پر قابض لادین عناصر نے یہ کامیابی تو حاصل کر لی کہ بعض نمایاں مذہبی تنظیمات اور جماعتوں نے اسلام کے معاشی، سیاسی اور سماجی کردار کو اپنے ایجنڈے سے ہی خارج کرا دیا لیکن یہی ارضِ پاک ۱۹۴۷ء سے اسلامی تحریکات اور جہادی مراکز کے باعث عالم اسلام کی امیدوں کا مرکز بن گئی پاکستان کے ایٹم بم کو اسلامی بم قرار دیا گیا۔ اپنوں کو تو پاکستان کے حوالے سے مایوسی میں مبتلا کیا گیا مگر عالمِ کفر نے پاکستان کی نظریاتی حیثیت اور مستقبل کے امکانات کو سمجھنے میں کوئی تاخیر نہ کی۔ لبرل قیادت، تنظیمات، ذرائع ابلاغ، نظامِ تعلیم اور سیاستدانوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر مغرب کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہم امن عالم، روشن خیالی، عالمگیریت، مکالمہ بین المذاہب، آزادی، مساوات اور تہذیب کے نعروں میں تمہارے ہم نوا ہی نہیں بلکہ شاہ سے بڑھ کر شاہ کے وفادار ہیں مگر پاکستان کی تاریخ کا نصف صدی سے زائد کا عرصہ شاہد ہے کہ "وہ" نہیں مانے وہ مان ہی نہیں سکتے اس لیے کہ

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرۃ، ۱۲۰)

"آپ سے یہود و نصاریٰ ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے تابع نہ بن جائیں۔"

اس علمی و تحقیقی کاوش کے ہر موڑ پر ایک دوراہا نہیں چوراہا تھا اس لیے کہ تاریخ بہت بڑی نعمت ہونے کے باوجود ایک غیر مستند ذریعۂ علم ہے اس ذریعۂ علم سے استفادے کے لیے مسلمان طالبعلم اور محقق کی پوزیشن اس لحاظ سے مستحکم ہے کہ وہ تاریخی حقائق کی تلاش علومِ نبوت کی روشنی میں کر سکتا ہے چنانچہ اپنی انسانی کاوش کو غلطی سے مبرّا قرار تو نہیں دیا جا سکتا تاہم کہا جا سکتا ہے کہ علومِ نبوت کی روشنی نے حق و باطل کے امتیاز میں جو مدد فراہم کی ہے اس کا نتیجہ یہ چند صفحات ہیں۔

پی ایچ ڈی کی ڈگری کے اعزاز سے بڑھ کر اعزاز یہ ہے کہ مقالے کے ممتحن حضرات نے اپنی تحریری رپورٹ میں پنجاب یونیورسٹی کو مقالہ شائع کرنے کی سفارش کی تاہم ایک عشرہ ہی گزر گیا۔ شیخ زاید اسلامک سینٹر نے دو برس قبل اس کی اشاعت کا فیصلہ کر لیا مگر تاخیر ہوتی چلی گئی اور باعثِ تاخیر کی فہرست بے حد طویل ہے۔ ڈائریکٹر شیخ زاید اسلامک سینٹر جناب ڈاکٹر محمد اعجاز صاحب کی ۲۰۱۱ء کی یاد دہانی کی تاثیر ہے کہ "مقدمہ" کی یہ چند سطریں لکھنے کی نوبت آگئی۔

مسلمانوں کو انسانوں کا شکریہ ادا کرنے کی تہذیب سکھائی گئی ہے اس روایت کے تسلسل میں محترمہ ڈاکٹر جمیلہ شوکت صاحبہ کا خاص طور پر ممنون ہوں جنہوں نے حوصلہ افزائی اور باز پرس میں کوئی کسر نہ چھوڑی تو یہ کام مکمل ہوا اللہ انہیں اجر عظیم عطا کرے۔ شعبہ علومِ اسلامیہ اور شیخ زاید اسلامک سینٹر کے اساتذہ، لائبریریوں کا عملہ اور ملازمین سب نے تعاون کیا اللہ ان سب کو جزائے خیر دے تاہم مقالے کی کمپوزنگ اور دیگر فنی ضرورتوں میں برادرِ عزیز حافظ عثمان احمد صاحب کا خاص تعاون حاصل رہا۔ موجودہ کتابی شکل میں لانے کے لیے ڈاکٹر حافظ عبدالقیوم صاحب اور حافظ خبیب محمود کا تعاون بھی قابل ذکر ہے۔ والدہ مرحومہ کی خاموش دعائیں اور اہلیہ کی خاموش خدمت اور تعاون نعمتِ خداوندی ہیں۔ آخر میں اس امر کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ سو فیصد (100 %) حق صرف اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ ہے میں نے اپنی مجلسی زندگی میں کسی بڑے تعطل کے بغیر یہ کام آگے تو بڑھایا ہے مگر مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ پاکستان اللہ کی نعمت ہے اور اس نعمت کی شکر گزاری واجب ہے لہٰذا

جشنِ بادِ صبا نہیں رُکتا
پھول کا قافلہ نہیں رُکتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھول جب کبھی سُوکھ جاتے ہیں
اور آتے ہیں اور آتے ہیں

ڈاکٹر اشتیاق احمد گوندل
۹۔سی اسلامک سینٹر کالونی پنجاب یونیورسٹی لاہور
۱۴ اگست، ۲۰۱۱ء

باب اول

پاکستان کی فکری بنیادیں

فصل اول: اسلام یا لبرل ازم
فصل دوم: تعمیرِ پاکستان میں مسلم لیگ کا کردار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فصل اول

اسلام یا لبرل ازم

قیادت اور تحریک

نصف صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود پاکستان کی نظریاتی بنیادوں اور تشخص کے بارے میں جو مباحثہ و مناظرہ جاری ہے اس کے اسباب اور محرکات کا جائزہ لیے بغیر پاکستانی قوم کی فکری کشمکش کا ادراک بے حد مشکل ہے۔ یہ امر قابل تعجب ہی نہیں قابل افسوس بھی ہے کہ اپنی پہلی منزل (قیام پاکستان) پر پہنچنے کے بعد سے اب تک تعمیر پاکستان کی اگلی منزلوں کو طے کرنے کی بجائے یہ جھگڑا پورے زور و شور سے جاری ہے کہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانا تحریکِ پاکستان کا مقصد تھا یا ایک لبرل جمہوری ریاست ہمارا ہدف تھی لہٰذا بقول منیر نیازی:

منیر اس ملک پہ آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے مگر سفر آہستہ آہستہ

اس تناظر میں تحریکِ پاکستان کا بے لاگ تجزیہ کیے بغیر اصل صورتحال کو سمجھنا ناممکن ہے اور یہ تجزیہ تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں متضاد، متنازعہ اور فکری مغالطوں سے بھری ہوئی تاریخ کی بناء پر پروان چڑھانا کوئی آسان کام نہیں۔ ایک کثیر طبقہ اسلام کا شعور اور حقیقی فہم نہ رکھنے کے باوجود ۶۳ سالوں سے پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ کا ورد کر رہا ہے، نعرے لگا رہا ہے ہر برس چودہ اگست کو نئے سرے سے اسلامی ریاست کے قیام کا عہد بھی کرتا ہے اور مطالبہ بھی۔ جبکہ دوسرا طبقہ اس ساری نعرے بازی کو محض جذباتی پن قرار دے کر ناممکن الحصول قرار دیتا ہے ان کی منزل پاکستان میں ایک روشن خیال معاشرے کی تشکیل اور لبرل جمہوریت (Liberal Democracy) کا قیام ہے۔ پہلا طبقہ اپنے مؤقف کے حق میں دلائل دیتا ہے جبکہ دوسرا طبقہ بانئ پاکستان قائدِ اعظم کے اقوال اور علامہ اقبال کے کلام کا ایسا انتخاب پیش کرتا ہے کہ پاکستان کے مستقبل کا تعین کرنا تو مشکل ہے ہی موجودہ پاکستان کی فکری و تہذیبی سمت اور کلچر کی شناخت بھی مشکل ہو جاتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بانیٔ پاکستان اور تحریکِ پاکستان کو الگ الگ کر کے زیرِ بحث لانا ایک نامناسب رویہ ہوگا کیونکہ محمد علی جناحؒ کی شخصیت کے آخری سات سال تو تحریکِ پاکستان کے علاوہ کسی بھی اور رنگ اور علامت کی ترجمانی نہیں کرتے نیز تحریکِ پاکستان پر آپ کا شخصی اثر بہت قوی تھا تاہم یہ ٹھوس حقیقت ہے کہ تحریک پاکستان کے علاوہ جناحؒ کی زندگی میں مذہبی رنگ اگر تھا بھی تو نمایاں نہ تھا اس لیے پاکستان کے سیکولر طبقات اور لبرل طبقات کے لیے جناحؒ کی شخصی زندگی اور چال چلن ایک طاقتور دلیل کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپؒ نے مغربی تعلیم حاصل کی، طرزِ زندگی مغربی معاشرے کے قریب تھا اور مغربی جمہوریت کے ہمنوا بھی رہے۔ اس طرح اپنی سیاسی زندگی کے آغاز میں کانگرس میں شامل ہونا اور ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کے طور پر جدوجہد کرنا پاکستان میں لبرل فکر کے ہمنواؤں کے لیے ایسی بنیادیں فراہم کرتا ہے جس سے بانیٔ پاکستان کو مغربی تہذیب کی مخصوص اصطلاحات کے مطابق سیکولر، لبرل اور روشن خیال ثابت کرنا آسان ہو جاتا ہے مگر دوسری طرف ۱۹۳۰ء کے علامہ اقبال کے خطبہ الٰہ آباد کے بعد جس جناح نے مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی وہ ایک سیکولر یا لبرل قائد نہیں تھا بلکہ وہ اپنی شخصی زندگی میں ایک عالمِ دین مذہبی سکالر نہ ہونے کے باوجود اپنی قوم کا مزاج شناس بنا۔ رشید الدین خان قائداعظم کا موازنہ برصغیر کے معروف عالم اور راہنما مولانا ابوالکلام آزاد سے کرتے ہیں۔

مولانا آزاد کا سفر سیاسی محدود سے وسیع کی طرف ہوا۔ فرقہ سے قوم کی طرف، مذہبی سیاست سے سیکولر سیاست کی طرف اور بالکل اس کے برعکس قائداعظم محمد علی جناح کا سیاسی سفر جو وسیع سے محدود کی طرف۔ قوم سے فرقہ کی طرف سیکولر سیاست سے مذہبی سیاست کی طرف۔(۱)

تحریکِ پاکستان کے کارکن معروف صحافی زیڈاے سلہری لکھتے ہیں:

Insistance on the Muslim way of life automatically brought out the Islamic character of the future state. The word Muslim was synonymous with Islam. Where the Muslim League differed from its opponents was that while a Muslim state or a state sustained by Muslims could be easily converted into an Islamic state, a non-Muslim (a Hindu majority state like the British and Congress were planning for the subcontinent) could never be turned into an Islamic State. Apparently the

difference between the two was political --- which way the Muslims should take? --- but its essence and effect was Muslim freedom struggle, the Quaid was par excellence an Islamist. He had visualized Pakistan as the key to Islamic country.(۲)

جناب سلہری کے انتقال کو ابھی چند برس ہوئے ہیں پاکستان کے صحافتی حلقوں میں آپ کا نمایاں مقام ہے اس لیے موصوف کی مذکورہ بالا شہادت اور تجزیہ محض ایک علمی کاوش اور تحقیق نہیں ہے بلکہ قیامِ پاکستان کے بعد سلہری صاحب کی زندگی کی ترجیحِ اول تحریکِ پاکستان کو لادینی تحریک اور جناح کو سیکولر ثابت کرنے والوں کے خلاف جہاد رہی ہے۔ ایسا ہی معتبر نام مرحوم پروفیسر منور مرزا کا ہے تحریکِ پاکستان کی اسلامی شناخت ختم کرنے کے لیے ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ پاک و ہند کے مسلمان ہندو اکثریت کے ہاتھوں معاشی استحصال کا شکار تھے اس لیے معاشی مجبوریوں سے پاکستان بنانے پر مجبور ہوئے۔ پروفیسر منور لکھتے ہیں:

پورے ہندوستان میں مسلمانوں نے ہندو اور انگریز کے خلاف کبھی ایجی ٹیشن اس سبب سے نہ کی کہ ان کی زمینیں چھین لی گئیں یا انہیں نوکریاں نہیں دی گئیں لیکن جب کانپور کی مسجد یا لاہور کی شہید گنج یا سکھر کی مسجد کا مسئلہ ہوا تو مسلمان جانیں قربان کر دیتے اس کا واضح مطلب ہے کہ مسلمان کے نزدیک اس کا ایمان اور اسکے عقائد پر استوار تمدن باقی ہر شے پر فوقیت رکھتا ہے چنانچہ یہ کہنا کہ پاکستان فقط معاشی مجبوریوں کی بناء پر وجود میں آیا تھا، غلط ہے۔(۳)

ڈاکٹر صفدر محمود لکھتے ہیں:

During Pakistan movement the Muslim League had given commitment to the people that Pakistan will be an Islamic democratic State based on social justice of Islam, the Muslims will be able to lead a life under the Divine law and the non-Muslims will also enjoy an equal status.(۴)

اگرچہ قائداعظم کے ارشادات اور اقوال کی صحت کا معیار بعض افراد کے نزدیک بہت بہتر نہیں ہے تاہم کسی بھی راہنما یا مصلح کی شخصیت اور فکری پرواز کی ترجمانی اس کے اقوال سے ہی ہوتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قائداعظم کے اقوال متعدد کتب اور دستاویزات کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اور تحریکِ پاکستان کی شناخت میں کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔

> From the different statements of Quaid-i-Azam, it becomes crystal clear that the land of Pakistan was going to be the laboratory of experiment of total Islamization of laws, an Islamic country in true sense. He was a man of principles, a law abiding citizen, a man who loved constitutionalism. Had he been spared a few more years to live and serve Pakistan, that democratic values loving man would have steared nation safe to the goal of a definite shape of a constitution, with insertions of definite objectives of shaping an Islamic order in Pakistan.(۵)

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ جناحؒ نے اپنی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز سے بالآخر جان لیا کہ یہ ملت اسلام کے بغیر نہ تو منظم اور متحرک ہو سکتی ہے اور نہ ہی برصغیر میں اپنے انفرادی و اجتماعی مستقبل کا تحفظ کر سکتی ہے لہذا ۱۹۴۰ء کے بعد کی مسلم لیگ اور اس کی قیادت کا رخ بہت واضح تھا۔

اس جدوجہد کے آخری زمانے میں جبکہ مسلم لیگ کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنی حیثیت کو بالکل واضح اور مبرہن کر دے کہ وہ اسلامیانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور پوری مسلمان قوم یکسوئی کے ساتھ اس کے جھنڈے تلے جمع ہے تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ تھا کہ وہ مسلمانانِ ہند کے دینی جذبات کو اپیل کرتی اور اسلام سے ان کی محبت اور دلی تعلق کو کام میں لاتی چنانچہ یہی وہ زمانہ ہے جس میں پورا ہندوستان "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" کے نعروں سے گونج اٹھا اور اسلامی حکومت، اسلام کے اصول مساوات و اخوت، اسلام کا نظام عدل اجتماعی، اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی قانون و دستور کی اصطلاحات کا استعمال مسلم لیگ کے رہنماؤں کی تقریروں میں عام ہو گیا گویا اس دور میں تحریک مسلم لیگ مسلمانوں کے صرف قومی مفادات کی محافظ ہی نہیں بلکہ دین کے ساتھ ان کی محبت اور اسلام کے ساتھ ان کے قلبی تعلق کا مظہر

تحریک پاکستان میں مذہب کا عنصر

بھی بن گئی چنانچہ پوری قوم مجتمع ہو کر اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی اور خود مذہبی طبقات میں سے بھی کچھ لوگ اس کی امداد کے لیے میدان میں نکل آئے۔(۶)

معروف مذہبی سکالر ڈاکٹر اسرار احمد نے مذکورہ بالا پیراگراف میں واضح کیا ہے کہ مسلم لیگ نے شعوری طور پر اسلام اور اسلامی اصطلاحات کو تحریکِ پاکستان میں نمایاں ترین جگہ اس لیے دی کہ "خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی" کے مصداق مذہب مسلمانوں کی بداعمالی کے باوجود ان کے خمیر کا حصہ تھا۔ آگے چل کر مسلم لیگ پر اسی مذہبی رنگ کے غالب آنے کے باعث علماء میں سے بعض نامور علماء نے اپنے ہی ہمسفروں سے راستے الگ کر کے یعنی کانگرس چھوڑ کر مسلم لیگ کی حمایت کی۔ اس سلسلے میں مولانا اشرف علی تھانویؒ اور ان کے ساتھیوں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جنہوں نے نہ صرف قیامِ پاکستان بلکہ اس کے بعد بھی پاکستان کے اسلامی تشخص کے لیے گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔

علماء کی حمایت

> قوم پرست علماء کی تحریک کے سارے دور میں ممتاز علماء کی صف میں مولانا اشرف علی تھانویؒ ایسے نمائندہ بزرگ تھے جنہوں نے ہندوؤں اور کانگرس کے ساتھ اس مشترکہ جدوجہد میں شرکت سے انکار کر دیا اور اسے مسلمانوں کے حق میں بہتر نہیں سمجھا۔ انہوں نے عملاً سیاست اور اجتماعی جدوجہد میں شرکت نہیں کی لیکن دینی اور روحانی راہنمائی کے ساتھ ساتھ سیاسی امور پر قوم کو مشورہ دیتے رہے۔ ان علماء میں آپ نمایاں امتیاز رکھتے تھے جنہوں نے دو قومی نظریہ کی حمایت پر زور دیا تقسیمِ ہند کا مطالبہ کیا اور پاکستان کی بھرپور تائید کی، یہی وجہ تھی کہ آپ کے زیر اثر علماء کی ایک بڑی تعداد نے تحریکِ پاکستان میں شمولیت اختیار کی خود علماءِ دیوبند میں سے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی محمد شفیعؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ جیسے علماء کی کوششوں سے تحریکِ پاکستان کو مؤثر تائید حاصل ہوئی۔(۷)

موجودہ پاکستان کے اسلام پسند طبقات میں مولانا تھانویؒ کے عقیدت مندوں کی کثیر تعداد اپنا ایک خاص اثر رکھتی ہے جو کوئی بھی تھانوی صاحب اور ان کے مکتبِ فکر سے آگاہ ہے اس کے لیے یہ دلیل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کافی ہے کہ جناحؒ اگر تحریکِ پاکستان کو ایک لبرل ریاست کے قیام کے لیے منظم کرتے تو اس مکتبِ فکر کی طرف سے تحریکِ پاکستان کی حمایت کا نہ تو کوئی امکان تھا اور نہ ہی جواز۔ مگر آج کے پاکستان میں علمی بددیانتی کی انتہا یہ ہے کہ سب علماء کے لیے ایک ہی جملہ بولا اور لکھا جاتا ہے کہ علماء نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی۔ دیانتداری کا تقاضا تو یہ ہے کہ جن علماء نے مخالفت کی ان کا مؤقف سامنے آئے، اس کا تجزیہ ہو اور کم از کم یہ کہ جنہوں نے حمایت کی ان کے عظیم کردار کا اعتراف کیا جائے مگر تاریخِ پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ لبرل ازم کے حمایتیوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہمیشہ قوم کو علماء سے بدظن کرنے کی سازش اور کوشش کی ہے لہذا تحریکِ پاکستان میں علماء کے کردار کی نفی اور علماء پر مبالغہ آمیز تنقید دراصل تحریکِ پاکستان کو اسلام کی بجائے لبرل ازم اور سیکولرازم کی بنیادوں پر استوار کرنے کی منظم کوشش ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مسلم لیگ کے ابتدائی سالوں میں مغربی اندازِ فکر رکھنے والے افراد ہی کرتا دھرتا تھے مگر فیصلے کی گھڑی میں علماء نے جب جان لیا کہ پاکستان اسلام کے لیے ہے تو پھر انہوں نے اپنا وزن تحریکِ پاکستان کے پلڑے میں ڈالنے سے گریز نہیں کیا۔ اس سلسلے میں "جمعیت علمائے اسلام" کا قیام پاکستان کی جدوجہد کی تاریخ کا ایک نمایاں واقعہ ہے اس کی جدوجہد سے پاکستان کے لیے فضا بڑی تیزی سے سازگار ہوئی اس کے قیام کے وقت پاکستان بننے یا نہ بننے کے متعلق فیصلہ کن انتخابات بھی قریب آرہے تھے۔ جمعیت علمائے ہند اپنی تمام توانائیاں کانگرس کے حق میں صرف کر رہی تھی جمعیت علمائے اسلام کے اراکین نے کانگرسی علماء کا پورا پورا جواب دیا علماء نے جمعیت اور مسلم لیگ دونوں کے ذریعے پاکستان کی پرزور حمایت کی اور تحریک کو تقویت پہنچائی۔ (۸)

ڈاکٹر وحید قریشی پاکستان کی نظریاتی اساس واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> پاکستان کے بارے میں قائداعظمؒ نے خطبۂ لاہور میں بڑے پتے کی بات کہی تھی ان کے نزدیک جداگانہ وطن کا مطالبہ محض ایک جغرافیائی تصور نہ تھا بلکہ اس احساس کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کو کوئی خطہ ایسا ملنا چاہیئے جس میں وہ اپنے مذہب اور تہذیبی اقدار کو محفوظ رکھ سکیں۔ برطانوی تسلط کے زمانے میں سیاسی سطح پر اس ضرورت کا احساس ہو گیا تھا کہ جغرافیائی قومیت مسلمانوں کے وجود کے منافی ہے وہ اکثریت کے رحم و کرم پر رہ کر اپنی ہستی فنا نہیں کرنا چاہتے۔ انگریزی عہد

> میں مسلمانوں کے خلاف سیاسی محاذ زیادہ تیز تھا اس میں برطانیہ کی شاطرانہ پالیسی بھی اپنا کام کر رہی تھی ہندوؤں اور مسلمانوں کا تصادم برطانوی رویے نے زیادہ سخت کر دیا اس طرح وہ تاریخی عمل جس نے مسلمانوں کے تشخص کو اس سے پہلے زندگی کے دوسرے شعبوں میں اہم کر دیا تھا مثلاً فقہی، مذہبی، تاریخی، ثقافتی، ادبی، اب سیاسی سطح پر بھی ابھرنے لگا اس جدوجہد کی بنیاد مذہب پر ہے پاکستان کا وجود مذہبی اور تہذیبی اقدار کے حوالے کے بغیر ناممکن ہے کیونکہ اگر مذہبی اقدار کا حوالہ باقی نہیں رہتا تو پاکستان کے بھارت سے الگ ہونے کا جواز ہی غائب ہو جاتا ہے اور ہماری آزادی کی تمام جدوجہد ہی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ (۹)

قیامِ پاکستان کی عملی جدوجہد میں محمد علی جناحؒ کو اللہ نے عظیم کامیابی اور عظمت عطا کی مگر ایک دور وہ بھی تھا کہ جناحؒ ہندوستان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر انگلستان جا بسے اور پاکستان کی خالق جماعت ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تھی یہی وہ زمانہ ہے کہ جب حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں مسلمانانِ پاک و ہند کے مستقبل کے لیے ٹھوس لائحہ عمل یہ دیا کہ "میری نگاہیں مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں اسلام کی بنیاد پر ایک الگ مملکت کے قیام کو دیکھ رہی ہیں" علامہ اقبال میں بھی فکری اعتبار سے تدریجی طور پر تغیر رونما ہوا کہ وطنیت کے ترانے گانے والے ملت اور امت کے تصورات کے ترجمان بن گئے۔ قومیت اور وطنیت سے برأت کا اعلان کر کے جمال الدین افغانی کی طرح پان اسلام ازم کے علمبردار ٹھہرے۔ اس تناظر میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا تبصرہ قابلِ غور ہے علامہ اقبال کے حوالے سے ڈاکٹر جالبی کا خیال ہے:

> "اقبال اس امر پر متفکر ہوتے ہیں کہ مسلمان حکومت سے کیوں محروم ہیں جبکہ انگریز غیر مسلم ہونے کے باوجود حاکم کیسے بن گئے

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گری ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کافی ہے کہ جناحؒ اگر تحریکِ پاکستان کو ایک لبرل ریاست کے قیام کے لیے منظم کرتے تو اس مکتبِ فکر کی طرف سے تحریکِ پاکستان کی حمایت کا نہ تو کوئی امکان تھا اور نہ ہی جواز۔ مگر آج کے پاکستان میں علمی بددیانتی کی انتہا یہ ہے کہ سب علماء کے لیے ایک ہی جملہ بولا اور لکھا جاتا ہے کہ علماء نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی۔ دیانتداری کا تقاضا تو یہ ہے کہ جن علماء نے مخالفت کی ان کا مؤقف سامنے آئے، اس کا تجزیہ ہو اور کم از کم یہ کہ جنہوں نے حمایت کی ان کے عظیم کردار کا اعتراف کیا جائے مگر تاریخِ پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ لبرل ازم کے حمایتیوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہمیشہ قوم کو علماء سے بدظن کرنے کی سازش اور کوشش کی ہے لہذا تحریکِ پاکستان میں علماء کے کردار کی نفی اور علماء پر مبالغہ آمیز تنقید دراصل تحریکِ پاکستان کو اسلام کی بجائے لبرل ازم اور سیکولرازم کی بنیادوں پر استوار کرنے کی منظم کوشش ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مسلم لیگ کے ابتدائی سالوں میں مغربی اندازِ فکر رکھنے والے افراد ہی کرتا دھرتا تھے مگر فیصلے کی گھڑی میں علماء نے جب جان لیا کہ پاکستان اسلام کے لیے ہے تو پھر انہوں نے اپنا وزن تحریکِ پاکستان کے پلڑے میں ڈالنے سے گریز نہیں کیا۔ اس سلسلے میں "جمعیت علمائے اسلام" کا قیامِ پاکستان کی جدوجہد کی تاریخ کا ایک نمایاں واقعہ ہے اس کی جدوجہد سے پاکستان کے لیے فضا بڑی تیزی سے سازگار ہوئی اس کے قیام کے وقت پاکستان بننے یا نہ بننے کے متعلق فیصلہ کن انتخابات بھی قریب آرہے تھے۔ جمعیت علمائے ہند اپنی تمام توانائیاں کانگرس کے حق میں صرف کر رہی تھی جمعیت علمائے اسلام کے اراکین نے کانگرسی علماء کا پورا پورا جواب دیا علماء نے جمعیت اور مسلم لیگ دونوں کے ذریعے پاکستان کی پرزور حمایت کی اور تحریک کو تقویت پہنچائی۔ (۸)

ڈاکٹر وحید قریشی پاکستان کی نظریاتی اساس واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> پاکستان کے بارے میں قائداعظمؒ نے خطبۂ لاہور میں بڑے پتے کی بات کہی تھی ان کے نزدیک جداگانہ وطن کا مطالبہ محض ایک جغرافیائی تصور نہ تھا بلکہ اس احساس کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کو کوئی خطہ ایسا ملنا چاہیئے جس میں وہ اپنے مذہب اور تہذیبی اقدار کو محفوظ رکھ سکیں۔ برطانوی تسلط کے زمانے میں سیاسی سطح پر اس ضرورت کا احساس ہو گیا تھا کہ جغرافیائی قومیت مسلمانوں کے وجود کے منافی ہے وہ اکثریت کے رحم و کرم پر رہ کر اپنی ہستی فنا نہیں کرنا چاہتے۔ انگریزی عہد

> میں مسلمانوں کے خلاف سیاسی محاذ زیادہ تیز تھا اس میں برطانیہ کی شاطرانہ پالیسی بھی اپنا کام کر رہی تھی ہندوؤں اور مسلمانوں کا تصادم برطانوی رویے نے زیادہ سخت کر دیا اس طرح وہ تاریخی عمل جس نے مسلمانوں کے تشخص کو اس سے پہلے زندگی کے دوسرے شعبوں میں اہم کر دیا تھا مثلاً فقہی، مذہبی، تاریخی، ثقافتی، ادبی، اب سیاسی سطح پر بھی ابھرنے لگا اس جدوجہد کی بنیاد مذہب پر ہے پاکستان کا وجود مذہبی اور تہذیبی اقدار کے حوالے کے بغیر ناممکن ہے کیونکہ اگر مذہبی اقدار کا حوالہ باقی نہیں رہتا تو پاکستان کے بھارت سے الگ ہونے کا جواز ہی غائب ہو جاتا ہے اور ہماری آزادی کی تمام جدوجہد ہی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ (۹)

قیامِ پاکستان کی عملی جدوجہد میں محمد علی جناحؒ کو اللہ نے عظیم کامیابی اور عظمت عطا کی مگر ایک دور وہ بھی تھا کہ جناحؒ ہندوستان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر انگلستان جا بسے اور پاکستان کی خالق جماعت ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تھی یہی وہ زمانہ ہے کہ جب حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں مسلمانانِ پاک و ہند کے مستقبل کے لیے ٹھوس لائحہ عمل یہ دیا کہ "میری نگاہیں مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں اسلام کی بنیاد پر ایک الگ مملکت کے قیام کو دیکھ رہی ہیں" علامہ اقبال میں بھی فکری اعتبار سے تدریجی طور پر تغیر رونما ہوا کہ وطنیت کے ترانے گانے والے ملت اور امت کے تصورات کے ترجمان بن گئے۔ قومیت اور وطنیت سے برأت کا اعلان کر کے جمال الدین افغانی کی طرح پان اسلام ازم کے علمبردار ٹھہرے۔ اس تناظر میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا تبصرہ قابل غور ہے علامہ اقبال کے حوالے سے ڈاکٹر جالبی کا خیال ہے:

> "اقبال اس امر پر متفکر ہوتے ہیں کہ مسلمان حکومت سے کیوں محروم ہیں جبکہ انگریز غیر مسلم ہونے کے باوجود حاکم کیسے بن گئے

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گری ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"جواب شکوہ" میں وہ سرسید کی طرح اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ انگریزوں کی ترقی کا سبب یہ ہے کہ وہ اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہیں اور مسلمانوں کے زوال کا سبب یہ ہے کہ وہ اسلامی اصولوں کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔

مسلم آئین ہو کافر تو ملیں حور و قصور

"خضر راہ" میں ان کی یہی فکری کشمکش بہت تفصیل سے موجود ہے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ وہ انقلابِ روس کو بہت دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری

جمال الدین افغانی کے اثر سے پان اسلام ازم بھی ان کے گلدستہ فکر میں موجود ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

اور یہیں سے اقبال کے ہاں وطنیت کی مخالفت کا دھارا پھوٹتا ہے۔"(۱۰)

چنانچہ اس تناظر میں خطبہ الٰہ آباد بے حد اہم موڑ ہے گو ۱۹۳۰ء میں علامہ کے اس خطبے کو خاص پذیرائی حاصل نہ ہوئی لیکن قیامِ پاکستان کے بعد مبصرین کی ایک بڑی تعداد نے اس خطبے کی قدر و منزلت کا اندازہ کیا اور قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں اس خطبے کو سنگِ میل قرار دیا:

In his presidential address at the 1930 annual session of the Muslim League, Iqbal asserted that the Muslims of India had every right to full and free development on the lines of their culture and traditions. To apply the western democracy to India without recognizing the fact of different communal groups would be a mistake and it could lead India to a civil war. He stressed that Islam alone could be the moral basis of a Muslim polity and sole measure of Muslim brotherhood.(11)

قیامِ پاکستان کے بعد اسلامی ریاست کا قیام ہی وہ خواب تھا جس کے لیے پاک و ہند کے مسلمانوں نے عظیم جدوجہد کی یہ کہا جا سکتا ہے کہ عوام تو اسلامی شعور اور فہم نہیں رکھتے مگر علماء کرام کی کثیر تعداد کا تحریکِ پاکستان میں کردار اس امر کا بین ثبوت ہے کہ اسلام کی اساس کے علاوہ قیامِ پاکستان کا کوئی جواز نہ تھا وگرنہ مغربی جمہوریت اور سیکولرازم کے قریب تر فارمولا تو کانگرس کے پاس تھا اور کانگرس متحدہ قومیت کی علمبردار تھی۔ جی ڈبلیو چوہدری لکھتے ہیں:

From all the views expressed by the leading Ulema (religious teachers) as well as by Muslim intelligentsia and scholars, it is quite evident that the muslims of Pakistan – including former East Pakistan, now Bangladesh – the –Bangladesh constitution abolished secularism, as originally introduced by its founder, Mujib, in 1973 and declared Islam the state religion of Bangladesh in 1988, sincerely believe that politics and religion can not be separated in Islam in order to preserve Islamic values and ideals, it is essential that Pakistan should be an Islamic state. By and large, the consensus has been that Pakistanis would like to see their country Islamic.(12)

اگرچہ قائداعظمؒ اور تحریکِ پاکستان لازم و ملزوم ہیں مگر پھر بھی یہ وضاحت ضروری ہے کہ مسلمانوں پر دینِ اسلام کے جو تقاضے لازم ہیں ان کے لیے وہ محمد علی جناحؒ یا علامہ اقبالؒ سے نہیں محمد رسول اللہ ﷺ سے راہنمائی کے محتاج ہیں۔ اسی حقیقت کی وضاحت پروفیسر منور مرزا اس طرح کرتے ہیں:

بہر حال ایک امر واضح ہے کہ اسلام اس بات پر مبنی ہرگز نہیں کہ قائداعظم یا علامہ اقبال سیکولر تھے یا پکے مسلمان، وہ الحمدللہ پکے اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے مگر اسلام ان دو پر مبنی نہیں۔ اسلام قائداعظم کا نہیں، اسلام اقبال کا نہیں، اسلام مولانا مودودی کا نہیں، اسلام اولیاء کا نہیں، تابعین و تبع تابعین کا نہیں، حتی کہ اسلام کسی صاحب رسول ﷺ کا بھی نہیں، اسلام فقط اور فقط محمد رسول اللہ ﷺ کا اسلام ہے۔ آفتاب آپ ﷺ ہیں باقی آپ کے سارے نام لیوا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنیں ہیں اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لے کر قائدِ اعظم اور علامہ اقبال تک سب کرنیں ہیں۔ آفتابِ رسالت کی کرنیں۔ کوئی کم چمکدار، کوئی زیادہ چمکدار اور کوئی بہت زیادہ چمکدار۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی ست !

چلیئے اگر ہمارے ملک میں آباد "نمک شناس" گروہ ثابت بھی کر دے کہ بالفرض محال قائدِ اعظم سیکولر تھے، دینِ اسلام کو پاکستان کے سرکاری دین کے طور پر لاگو نہیں کرنا چاہتے تھے اور اسی طرح علامہ اقبال بھی۔۔۔ تو پھر کیا ہوگا۔ یہ پاکستان لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ کے آفاقی نعرے اور افلاکی للکار پر بنا ہے اس کی بناء مضبوط ہے۔ یہ اسلام کا قلعہ ہے، خواہ یہ بات منافقوں، مرتدوں، دہریوں اور مشرکوں کو کتنی ہی ناگوار گزرے۔

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا(۱۳)

پروفیسر منور اپنی ایک اور کتاب دیوارِ برہمن میں لکھتے ہیں:

یہ کام اللہ تعالیٰ نے قائدِ اعظم سے لیا جن میں قیادت کی بہت سی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں جن میں مسلمانوں کے حق میں بات کرنے کی جرأت تھی وہ بات خواہ انگریزوں سے کرنا پڑی خواہ ہندو قائدین سے جن کے الفاظ میں "اگریت"، "مگریت"، "چنانچیت"، "بشرطیت" نہ تھی، جو چپڑاسی سے لے کر وائسرائے تک ایک صاف اور واضح زبان بولتے تھے انہوں نے کبھی یہ نہ کہا کہ فلاں موقع پر میں نے جو یہ کلمہ کہا تھا تو در حقیقت میرا مفہوم یہ تھا، وہ نہ تھا۔۔۔ قائدِ اعظم جو کہتے تھے وہی ان کا مفہوم بھی ہوتا تھا انہیں بعد میں کبھی کوئی تاویلی مفہوم اختراع نہیں کرنا پڑا۔(۱۴)

قائدِ اعظم جیسے کھرے اور صاف گو لیڈر سے کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنی قوم کو جس کے بہتر مستقبل کے لیے انہوں نے اپنی صحت داؤ پر لگائی، مغالطے میں رکھتے۔ اس لیے جناحؒ کی حد تک تو پاکستان

کا مستقبل اسلام ہی کے ساتھ وابستہ تھا یہی وجہ ہے کہ پاکستانی معاشرے کا سوادِ اعظم آج بھی اسلام پسند ہے جیسا کہ پروفیسر محمد عثمان تجزیہ کرتے ہیں۔

پاکستان کی آبادی شدید مذہبی رجحان رکھتی ہے اس لیے اپنی سیاست میں اسلام کی معاشرتی، معاشی اور اخلاقی قدروں کو رائج دیکھنے کی آرزومند ہے اور مذہب سے بے تعلق بیزار سیاست کی طرف اس کا میلان کم ہے اس رجحان کی نمائندگی مختلف طریق اور مختلف انداز سے ہو رہی ہے۔(۱۵)

ظاہر ہے قائدِ اعظم کی زندگی میں مغربی رنگ غالب تھا مگر بعض ایسے ٹھوس شواہد موجود ہیں جن کی بناء پر معلوم ہوتا ہے کہ آپؒ ابتدائی زمانے سے ہی اسلام کے ساتھ گہری جذباتی وابستگی رکھتے تھے جس کا مظہر درج ذیل واقعہ بھی ہے:

To set the record straight, Islam did not come to him late in his life: his sense of Muslimness surfaced when he was hardly sixteen. Fatimas his sister is a privy to his religious essence. He opted for Lincon's Inn because as he told her, he saw the Prophet's name engraved on its entrance as among the greatest law givers. This visual experience that he underwent must have given him the intellectual grasp of Islam as the Shariah (law) – relevant to life beyond rituals and dogmas.(۱۶)

علامہ اقبال کی ملی خدمات کا عظیم ترین پہلو پاک و ہند کے مسلمانوں کی قیادت کے لیے محمد علی جناحؒ کا انتخاب ہے اور اقبال نے اگر جناحؒ کا انتخاب کیا تو اس کی وجہ قائدِ اعظم کا سیکولر ہونا نہیں مسلمان ہونا تھا۔

This was known to Iqbal who could eulogize Jinnah for his Islamic essence as someone who is the only muslim in India today to whom the community has the right to look up for safe guidance and share, with him, his belief that "the enforcement and development of the Shariat of Islam is impossible in this country without a free Muslim state or states.(۱۷)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس اعتبار سے تاریخ نے ثابت کیا کہ مسلمانوں کی راہنمائی کے لیے علامہ اقبال کا جناحؒ کو ترغیب دینا بے حد موزوں تھا چنانچہ وہی محمد علی جناحؒ جو کسی زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کہلاتے تھے اب اپنی جرأت مندانہ اور نڈر آواز میں ۱۹۳۹ء کی قانون ساز اسمبلی میں ہندو قیادت پر یوں گرج رہے تھے:

> You may be the largest number; you may be more advanced; and you may be stronger economically ..... but let me tell you (he was sounding Hindus) .... you will never be able to destroy that culture which we have inherited, the Islamic culture and that spirit will live, is going to live and has lived. You may over power us, you may oppress us; and you can do your worst. But we have come to the conclusion and we have not made a grim resolve that we shall go down, if we have to go down, fighting.(۱۸)

سچی بات تو یہ ہے کہ محمد علی جناحؒ کے موقف میں قوت نہ تو مغربی تعلیم کے باعث تھی اور نہ ہی مغربی جمہوریت کے تصورات کے باعث بلکہ یہ عظیم قانون دان اگر پاکستان کا بانی قرار پایا تو اسلام اور فقط اسلام نے ہی اس کے موقف کو استحکام اور کامیابی عطا کی وگرنہ بالعموم پوری دنیا اور بالخصوص انگلستان میں رائج جمہوری نظام بھی تحریکِ پاکستان کی کامیابی کی راہ ہموار نہ کر سکتا۔ پروفیسر منور مرزا لکھتے ہیں:

> سیدھی سی بات تھی اگر مجرد جمہوریت نافذ ہوتی جو انگلستان میں کارفرما تھی تو نتیجہ کیا ہوتا؟ انگلستان میں جمہوریت، سیاسی پارٹیوں کے منشور اور پروگرام کو عمل میں لانے کا نام ہے آج ایک سیاسی پارٹی جیت گئی تو کل دوسری، مگر قائداعظم نے انگریزوں، ہندوؤں اور ساتھ ہی مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ برصغیر میں سیاسی پارٹیاں ان معنوں میں ہیں ہی نہیں جن معنوں میں انگلستان میں ہیں۔ یہاں اکثریت مذہبی اکثریت ہے اور دائمی، یہاں اقلیت مذہبی اقلیت ہے اور دائمی، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ تصورِ جمہوریت کے زیرِ پردہ ہندو ہمیشہ حاکم

رہیں اور مسلمان ہمیشہ محکوم۔ یہ پریشان کن صورتحال تھی جس کا مداوا مطالبۂ پاکستان تھا"۔(۱۹)

فکری کشمکش

آج کے پاکستان میں عظیم الشان تاریخی شواہد کے باوجود بہر حال روشن خیال اور لبرل طبقوں کو پھر بھی اتنی جرأت اور اعتماد حاصل ہے کہ وہ تحریکِ پاکستان کو لادینی جدوجہد اور قائداعظم کو ایک لبرل اور آزاد خیال لیڈر ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں ڈاکٹر اسرار لکھتے ہیں:

> چنانچہ ایک طرف اپنا حال یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کے اغراض و مقاصد ہی بحث و نزاع کا موضوع اور اختلاف و انتشار کا عنوان بنے ہوئے ہیں اور اس ضمن میں بڑوں کے انتشارِ ذہنی کا نتیجہ یہ ہے کہ نئی نسل حیران و پریشان ہے کہ پاکستان کیوں معرضِ وجود میں آیا تھا اور آیا اس قافلۂ ملی کی کوئی منزلِ مقصود تھی بھی یا نہیں جس نے پاکستان حاصل کیا بلکہ یہاں تک کہ آیا تقسیمِ ہند کا کوئی جواز تھا بھی کہ نہیں نتیجتاً ملی و قومی سطح پر ہم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں چنانچہ زعماء و قائدین اور اصحابِ فکر و دانش تک کی سعی و جدوجہد اور تگ و تاز کا حال اس مصرعہ کا مصداق ہے کہ عمر آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف! تو بے چارے عوام کا کیا قصور اگر وہ اس شعر کے مصداق کامل بن گئے ہوں کہ
>
> چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک تیز رو کے ساتھ
> پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں (۲۰)

اس فکری انتشار نے ہمارا ماضی تو خراب کیا ہی ہے بدقسمتی سے مستقبل کے امکانات بھی مخدوش ہیں کیونکہ نوجوان نسل کی کوئی فکری سمت نہیں ہے جو مستقبل کی ضمانت ہوتے ہیں کج فہم اہلِ دانش نے تحریکِ پاکستان کی من مانی تشریح سے نئی نسلوں کا حافظہ اور فہم کمزور کیا ہے۔ آزاد کوثری کا دعویٰ ہے کہ یہ بات شروع ہی سے واضح ہے کہ پاکستان کے قیام کی وجوہات مذہب کے علاوہ سیاسی اور اقتصادی بھی تھیں لیکن بدقسمتی سے کچھ عناصر بدستور مصر ہیں کہ قیامِ پاکستان کی وجوہات محض مذہبی تھیں۔(۲۱)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس طرح کے دعوؤں کی حقیقت جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم آزاد کوثری جیسے اہلِ فکر و دانش کی اپنی فکر کی بنیاد کے ساتھ تجزیہ کریں کہ آیا وہ اسلام کو دین سمجھتے ہیں یا مذہب، دین اور مذہب میں فرق کیا ہوتا ہے یا تو موصوف دین کے وسیع تر تصور سے ناواقف ہیں یا اپنے مقاصد کے حصول کے لیے دین کو رکاوٹ سمجھتے ہیں وگرنہ سیاسی و اقتصادی وجوہات اگر قیامِ پاکستان کا محرک تھیں تو ایک مسلمان ان کا حل دینِ اسلام کے علاوہ اور کہاں سے حاصل کرے گا پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانانِ ہند اگر سیاسی و مذہبی طور پر استحصال کا شکار تھے تو اس کی اصل وجہ بھی اسلام کی بنیاد پر آزاد مملکت کا نہ ہونا تھا لہذا یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ برصغیر کے مسلمان اپنے سیاسی معاشی اور معاشرتی مسائل کے لیے اسلام کو ہی مکمل ضابطۂ حیات خیال کرتے تھے اس لحاظ سے تحریکِ پاکستان کا محرک اول و آخر اسلام ہی قرار پاتا ہے۔

پاکستان کے لادین عناصر کا فکری میلان یہ ہے کہ جہاں وہ دیگر معاملات میں مغرب کے پیمانوں کو معیار بناتے ہیں وہاں اسلام کو بھی ان کے معیارات اور اصطلاحات کی روشنی میں پرکھتے ہیں جس سے تاریخی طور پر ثابت شدہ حقائق بھی فکری انتشار کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں مثلاً سید مسعود زیدی اپنی کتاب پاکستان کا مقدمہ میں قائداعظم کے خیالات کی تشریح درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

> قائداعظم ایک ایسی ماڈرن ریاست کے خواہاں تھے جہاں سے روشن خیال ماہرینِ تعلیم، انجینئر، ڈاکٹر، سیاستدان، ماہرینِ اقتصادیات، سائنسدان، مفکر نکلیں اور احیاءِ اسلام کا باعث بنیں۔(۲۲)

مغرب کے روشن خیالوں نے پہلے تو مذہب کو نجی معاملہ قرار دیا اور اجتماعی اداروں سے نکال باہر کیا بعد ازاں فرائیڈ وغیرہ نے تو اسے بدترجرم کی پیداوار قرار دیا نیز خدا کے وجود کا ہی انکار کر دیا ہمارے ہاں کے دانشور روشن خیالی اور آزاد خیالی وغیرہ کی اصطلاحات کو بڑے خوبصورت اور پُرکشش انداز میں پیش کرتے ہیں مگر ساتھ اسلام کا لیبل چسپاں رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ پاکستانی روشن خیال بھی پاکستانی معاشرے کے مزاج اور ضمیر کو نظر انداز نہیں کر سکتے وگرنہ روشن خیالی اور احیائے اسلام! اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا بلکہ تری سادگی بھی ایک فریب ہے۔ مصنف آگے رقمطراز ہیں:

> اللہ رب العالمین اور اس کے پیارے رسول ﷺ رحمۃ للعالمین ﷺ کا عقیدہ رکھنے والا مسلمان تو فطری طور پر سیکولر ہے کیا دوسری قوم کے بت کی آنکھ پھوڑنے کی سزا مسلمان کو سزا دینے کا فیصلہ اور ہمارے نبی کریم ﷺ کی نصرانیوں کو مسجدِ نبوی ﷺ میں اپنے طریقے سے نماز ادا کرنے کی اجازت دینے سے بہتر مثال سیکولر ذہنیت کی تاریخ عالم پیش کر سکتی ہے۔(۲۳)

دیدہ دلیری کا عالم یہ ہے کہ خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں کے مصداق پاکستان کو سیکولر اور لبرل بنانے کے چکر میں اسلام کو اور رسولِ رحمت ﷺ کو ہی سیکولر بنانے پر تل جاتے ہیں۔ ایسی ہی کئی دوراز کار تاویلات کے ذریعے روشن خیال پاکستانی معاشرے میں آزاد خیالی (Liberalism) کو فروغ دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ قائداعظم کا ایک بیان جو لبرل افراد کے لیے کلیدی اہمیت کا حامل ہے اور جس سے وہ تحریک پاکستان کا اپنے تئیں حقیقی رخ متعین کرتے ہیں وہ دستور ساز اسمبلی کے اجلاس منعقدہ ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کراچی سے قائداعظم کا خطاب ہے جس میں آپ نے فرمایا:

> You are free to go to your temples, you are free to go to your mosques or to anyother places of worship in this state of Paksitan. You may belong to any religion or caste or creed that has nothing to do with the business of the state. Now I think we should keep that in front of us as our ideal and you will find that in course of time Hindus would cease to be Hindus and Muslims would cease to be Muslims, not in the religious sense, because that is personal faith of each individual, but in the political sense as citizens of the state.(۲۴)

کسی بھی فرد کے خیالات کو جاننے کے لیے اس کے اقوال اور بیانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا چنانچہ جناحؒ کا درج بالا بیان اگر ان کی زندگی کے دیگر خیالات، اقوال اور بیانات سے کاٹ کر دیکھا جائے تو اس میں سیکولرازم کی گنجائش نکل سکتی ہے مگر امرِ واقع یہ ہے کہ ایک طرف سینکڑوں بیانات اور شہادتیں تحریکِ پاکستان کا جذبہ محرکہ اسلام کو قرار دیتی ہیں اور اس سلسلے میں ہزاروں لاکھوں عینی شاہد بھی ہیں تو دوسری طرف محض ایک بیان کو کھینچ تان کر اپنی مرضی کا مفہوم دینا علمی و تحقیقی بددیانتی ہے یا پھر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خدانخواستہ محمد علی جناحؒ کے بارے میں روشن خیالی کا تقاضا یہ بھی ہو کہ قیام پاکستان سے قبل ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۷ء آخری دم تک قائداعظم اسلام کا نام محض دکھاوے کے لیے اور قوم کو دھوکہ دینے کے لیے استعمال کرتے رہے اور قیام پاکستان کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے اصل خیالات کو طشت از بام کیا مگر قائداعظم کا کٹر ترین مخالف بھی ایسی اخلاقی اور قومی بددیانتی کا تصور نہ کرے گا اس سلسلے میں سابق چیف جسٹس آف پاکستان نسیم حسن شاہ کا تبصرہ صورتحال کی وضاحت کے لیے کافی ہے:

Undoubtedly this first speech in the Constitutional Assembly was an important declaration containing guidelines for the constitution makers. But this speech simpliciter is a far cry from establishing that the Quaid was a secularist. A careful consideration of the speech and the context in which it was made shows that it was bringing in sharp relief and to draw attention to the ideal of Islam namely that all citizens in an Islamic state must be treated as equal, that herein no discrimination is allowed amongst the citizens. Furthermore this speech was not a repudiation of what Quaid had been declaring all through the struggle for Pakistan but was merely a reminder to an important Islamic principle that Pakistan would be adhering to namely that herein all citizens would have equal rights and would enjoy equal protection. It should be remembered that the opponents of the Pakistan movement were virulently denouncing Pakistan as a purely fanatical and communical state in which minorities would be treated unfairly as opposed to the liberal treatment which all citizens living in india would be enjoying in the secular state visualized by the Congress wherein equal rights will be given to all people in India. The Quaid had therefore also to reassure all non-Muslim inhabitants of Pakistan, whose number when Pakistan was created numbered around 25 percent, that they would be treated justly, fairly, without discrimination, as equal citizens of the state. Therefore to make a proper assessment of the significance of the speech of August 11, 1947 this background has to be kept in mind.(۲۵)

قائداعظم اور تحریکِ پاکستان پر اس بحث کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ فرض کریں جناح اور مسلم لیگ دونوں لبرل فکر کے علمبردار تھے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے بیانات، تقاریر اور دعوؤں کی حد تک ہی سہی اسلام ہی کو اوڑھنا اور بچھونا کیوں ظاہر کیا چنانچہ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ قائداعظم کی تصویر کو لبرل تشخص دینے والے قائداعظم پر لبرل ازم کے ساتھ ساتھ قوم کو اندھیرے میں رکھنے کا الزام بھی چسپاں کر دیں جبکہ حقیقی صورتحال یہ ہے کہ مسلم لیگ اپنے قیام سے قیام پاکستان تک اور اس کی قیادت کئی نشیب و فراز سے گزری ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے کئی طرح کے فارمولے زیر بحث آئے یہ تدریجی عمل ہے مگر جو نسخہ کارگر ثابت ہوا وہ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اگر مسلم لیگ اور قائداعظم دونوں ایک لبرل ریاست کے قیام کا خواب دکھاتے تو نہ تو راسخ العقیدہ علماء (مولانا تھانوی وغیرہ) مسلم لیگ کی حمایت کرتے اور نہ ہی یہ قوم کسی ایسی بنیاد پر متحرک اور منظم ہو کر آزادی کی منزل سے ہمکنار ہوتی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

تعمیرِ پاکستان میں مسلم لیگ کا کردار

بدقسمتی سے قیامِ پاکستان کے بعد جس فکری انتشار نے جنم لیا اس کی ذمہ داری محض لادین عناصر پر ہی عائد نہیں ہوتی بلکہ اسلام پسند بھی کسی حد تک ذمہ دار ہیں لیکن سب سے بڑھ کر پاکستان کا خالق ہونے کی دعویدار جماعت مسلم لیگ جو وقتی جذبے کے تحت ایک عظیم ہدف کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی مگر تعمیرِ پاکستان اور اسلامی ریاست کی تشکیل کا کوئی ٹھوس منصوبہ نہ بنا سکی بلکہ ۶۴ سال بعد۔

مسلم لیگ کی ریاستی اسلام کی ناکامی۔

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

بقول ڈاکٹر اسرار احمد:

وجہ — قوم پرست جماعت

اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ ایک قومی جماعت ہونے کی بناء پر مسلم لیگ کی صفوں میں ہر نقطہ نظر اور مکتبۂ فکر کے لوگ پائے جاتے تھے حتیٰ کہ خالص ملحد اور دہریے بھی موجود تھے۔(۲۶)

مسلم لیگ کے اس اعزاز کے باوجود قیام پاکستان کے فوراً بعد کی صورتحال پر مولانا ابوالکلام آزاد کا درج ذیل تجزیہ قابل غور ہے۔

مسلم لیگ پر خود غرض افراد کا قبضہ

میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ کس طرح کانگرس کی مخالفت کے لیے شروع میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی اس لیے لیگ میں مشکل ہی سے کوئی ایسا رکن رہا ہو گا جس نے ملک کی آزادی کے لیے جنگ لڑی ہو نہ تو انہوں نے کوئی ایثار کیا تھا نہ ہی وہ کسی جدوجہد کی ڈسپلن سے گزرے تھے ان میں یا تو ریٹائرڈ حکام تھے یا ایسے افراد جو انگریزوں کی سرپرستی کے تحت عوامی زندگی میں لائے گئے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ جب نئی ریاست کی تشکیل ہوئی تو اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو خدمت یا قربانی کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھتے تھے نئی ریاست کے بہت سے حکمران خود غرض لوگ تھے جو صرف ذاتی مفاد کی خاطر عوامی زندگی میں آئے تھے۔ نئی

ریاست کے لیڈروں کی اکثریت یو پی، بہار اور بمبئی سے تعلق رکھتی تھی بہت سوں کے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ وہ ان علاقوں کی زبان بول تک نہیں سکتے تھے جن پر اب پاکستان مشتمل تھا۔(۲۷)

گو مولانا آزاد نے پاکستان کی حمایت نہیں کی بلکہ ڈنکے کی چوٹ پر مخالفت کی مگر قیامِ پاکستان کے بعد ان کی مخالفت کی شدت میں کمی آگئی تاہم ان کا ذاتی موقف کچھ بھی ہو۔ پاکستانی قیادت پر ان کا تبصرہ اس شعر کے مصداق ہے۔

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

معروف دانشور ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ پاکستان کی تحریک بھی ملی احساس کا نتیجہ تھی یعنی "جغرافیہ" کے اندر رہتے ہوئے بھی غیر جغرافیائی، جس میں احساسِ ملی کے ذریعے پھیلنے اور بڑھنے کا زبردست حوصلہ موجود تھا پاکستان کا آدرش اور اسکا موجودہ جغرافیہ دراصل ذریعہ تھا ملی آدرش کو حاصل کرنے کا۔ ہماری تنگ نظری دیکھئے کہ جب یہ حاصل ہو گیا تو ہم نے ذریعے کو منزل بنا کر قناعت کر لی اور یہی وہ تضاد ہے جس نے معاشرتی، اخلاقی اور تہذیبی بساط الٹ دی ہے۔(۲۸)

اصل راستے سے انحراف اور کج روی پر مبنی اس صورتحال نے جس کشمکش کو جنم دیا ہے وہ بداعتمادگی، مایوسی اور خدشات کے عنوانات سے عبارت ہے قومی و ملی وسائل کا ضیاع اور ارضِ پاک میں بے مقصد نوجوان نسل کا تباہی کے دھانے پر کھڑا ہونا اسی وجہ سے کہ آج ہمیں اپنی شناخت کا مسئلہ درپیش ہے۔ بقول شاعر:

رکوں تو منزلیں ہی منزلیں ہیں
چلوں تو راستہ کوئی نہیں ہے
میں ایسے جمگھٹے میں کھو گیا ہوں
جہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے
کسی سے آشنا ایسا ہوا ہوں
مجھے پہچانتا کوئی نہیں ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چنانچہ ضروری ہے کہ ہم اگر موجودہ پاکستان کے مسائل کی حقیقی نشاندہی چاہتے ہیں تو پھر سچائیوں کا اعتراف کریں چاہے وہ شیریں ہوں یا تلخ۔ نوائے وقت کے مضمون نگار پروفیسر عثمان کا تجزیہ قابل غور ہے۔

> پاکستان کی سیاست کے بارے میں سب سے پہلی سیاسی سچائی جاننے کے قابل یہ ہے کہ پاکستان کو ایک سیاسی جماعت نے سیاسی طریقے سے جمہوری اصولوں کے مطابق جدوجہد کر کے مسلمان عوام کو اپنی جماعت کے جھنڈے تلے جمع کر کے ان کے ووٹ اور رائے کے زور پر بنایا تھا پاکستانی سیاست کے بارے میں دوسری بڑی سچائی (جو تلخ بھی ہے) یہ ہے کہ اس ملک کو بنانے والی جماعت ہی نے اپنی کرتوتوں سے تھوڑے ہی عرصے میں اس کے زوال کا آغاز کر دیا اور ملک میں سیاسی تنظیم کی کوئی اعلیٰ روایت قائم نہ ہو سکی حکمران جماعت مسلم لیگ کے رہنما اور بعض کارکن نئے اور یکدم پیدا ہونے والے وسائل کی فراوانی سے بوکھلا گئے اور ان کے قدم ڈگمگانے لگے اور وہ اقتدار کا مزہ لوٹنے اور دولت سمیٹنے کے پیچھے لگ گئے اور وہ سیاست جس کو اپنی زندگی اور توانائی کے لیے اصولوں اور ضابطوں کی ضرورت تھی ہوس اقتدار کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ملک میں مسلم لیگ کے علاوہ بھی کچھ سیاسی جماعتیں تھیں اور کچھ جلدی میں معرضِ وجود میں آ گئیں مگر مسلم لیگ کی طاقت اور پھیلاؤ کے سامنے ان کا چراغ نہ جل سکتا تھا لہذا چند سال تک پاکستان مسلم لیگ، پاکستان کے مرکز اور صوبوں پر بلا شرکت غیرے مسلط و قابض رہی اور اس مدت میں اس نے اس قدر ٹھوکریں کھائیں اس قدر غلطیاں کیں کہ کرنے کے بہت سے کام نہ کیے اور نہ کرنے کے بہت سے کام کر ڈالے۔ (۲۹)

پاکستان کی خالق جماعت قیام پاکستان کے بعد سب سے بڑھ کر نہ صرف مسلمانانِ پاکستان بلکہ مجموعی طور پر پوری امتِ مسلمہ کی امنگوں کا مرکز تھی مگر افسوس کا مقام ہے کہ امنگوں پر تو پانی پھرا ہی غیروں اور مخالفین کے خدشات بھی مسلم لیگ کے کردار سے ہی سچ ثابت ہونے لگے۔ قائد اعظم کے بعد

ان کے جانشینوں میں سب سے نمایاں نام پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کا ہے جنہوں نے فکری و عملی انتشار کی ساری فضا کے باوجود قیام پاکستان کے فوراً بعد قرارداد مقاصد کی منظوری کے لیے قائدانہ جدوجہد کی۔ تحریکِ پاکستان کے مقاصد کے بارے میں برملا اعلان کیا:

> جہاں تک لوگوں کی اس امنگ کا تعلق ہے کہ پاکستان میں اسلامی اصولوں کے مطابق حکومت ہونی چاہیے دستور ساز اسمبلی کی پاس کردہ قرارداد مقاصد اس کی کافی ضمانت ہے میرا یہ ایمان ہے کہ اگر ہم نے پاکستان میں اسلامی حکومت قائم نہ کی تو پاکستان زندہ نہیں رہ سکے گا۔ (۳۰)

اگرچہ نوابزادہ لیاقت علی خان نے قرارداد مقاصد کی منظوری کی صورت میں دستوری اور قانونی سطح پر پاکستان کے لیے ایک اسلامی ریاست کا ہدف واضح طور پر متعین کر دیا تھا مگر ان کی قیادت ہی میں مسلم لیگ کی صفوں میں اسلام پسندی کا رنگ پھیکا پڑتا گیا وہی مسلم لیگ جس نے ۱۹۴۰ء کے بعد اپنے سفر کا آغاز اسلامی حکومت کے خوابوں کے ساتھ کیا تھا انہی خوابوں کے باعث وہ اسلام پسند اہل دانش اور علماء کے لیے بھی قابل قبول بنی تھی اور مسلمان عوام کی توجہ بھی حاصل کر پائی تھی آل انڈیا مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری مولانا ظفر احمد انصاری کو جناحؒ کا خاص معتمد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ شہادت دیتے ہیں کہ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے اسلامی حکومت کا خواب کس طرح آنکھوں میں سجایا گیا تھا۔

> دراصل پاکستان کی قرارداد سے پہلے ہی مختلف گوشوں سے "حکومت الٰہیہ"، "مسلم ہندوستان" اور "خلافت ربانی" وغیرہ کی آوازیں اٹھنے لگی تھیں۔ علامہ اقبال نے ایک آزاد مسلم ہندوستان کا تصور پیش کیا تھا مودودی صاحب کے لٹریچر نے حکومت الٰہیہ کی آواز بلند کی تھی چوہدری افضل الحق نے اسلامی حکومت کا نعرہ لگایا تھا۔ مولانا آزاد سبحانی نے خلافت ربانی کا تصور پیش کیا تھا جگہ جگہ سے اس آواز کا اٹھنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مسلمان اپنے مخصوص طرز فکر کی حکومت قائم کرنے کی ضرورت پوری شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ (۳۱)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گویا کہ قرارداد پاکستان ۱۹۴۰ء سے قبل ہی علامہ اقبال کے علاوہ بھی اسلامی حکومت کے لیے طلب کئی گوشوں سے ظاہر ہو رہی تھی اور اس طلب کو ایک کامیاب عملی جدوجہد اور تحریک کی شکل مسلم لیگ ہی نے دی۔ مولانا انصاری جہاں علماء اور دانشوروں کا حوالہ دیتے ہوئے گواہی دیتے ہیں کہ وہ اسلامی حکومت کا شعور پیدا کر رہے تھے وہاں جدید تعلیم یافتہ طبقے میں بھی اسلام کے احیاء کی تڑپ کا تذکرہ کرتے ہیں۔

> اس زمانے میں علمی کوتاہی اور فکری الجھن کے باوجود انگریزی داں طبقہ کی بہت بڑی تعداد کی وفاداریوں کا شعوری طور پر مرکز و محور اسلام ہی تھا اور ان میں خاصی تعداد ایسی تھی جو اسلام کو پوری طرح مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں حکمران دیکھنا چاہتی تھی پرانے تعلیم یافتہ افراد تو اس مسلک کے داعی تھے ہی لیکن جدید طبقہ بھی پورے اخلاص کے ساتھ اسلام ہی کے احیاء کے لیے کوشاں تھا اور یہ تمام اصحاب اس بات کی کوشش کر رہے تھے کہ علماء زیادہ سے زیادہ تعداد میں لیگ میں شامل ہوں تاکہ اس قومی تنظیم کے مزاج پر اسلامی رنگ غالب رہے۔ (۳۲)

اسلامی حکومت کا احساس اتنا بڑھ گیا تھا کہ خود یو پی مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء میں جید علماء اور مفکرین پر مشتمل ایک کمیٹی اسلامی نظامِ حکومت کا خاکہ بنانے کے لیے قائم کی۔ اس کمیٹی میں سید سلیمان ندوی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی وغیرہ شامل تھے۔ (۳۳)

مولانا مودودیؒ کا کردار

مولانا مودودیؒ جنہیں مسلم لیگ کا ایک خاص طبقہ ہمیشہ (کئی دیگر علماء کی حقیقی مخالفت کو نظر انداز کر کے) پاکستان کا مخالف ثابت کرتا رہتا ہے اور جنہوں نے قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی اسلامی حکومت کے قیام کے لیے ٹھوس اور منظم جدوجہد کا کام تیز کر دیا بالکل ابتدائی برسوں ہی میں مسلم لیگ سے دردمندانہ اپیل کرتے ہیں:

> میں اپنے مسلم لیگی بھائیوں سے کہتا ہوں کہ آپ نے پاکستان اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے مانگا تھا آپ نے سب کچھ اسلام کے نام پر کیا اب آپ آزمائش میں ڈال دیے گئے ہیں اس آزمائش پر آپ پورا اترنا چاہتے ہیں تو اس مطالبہ کو اپنا مطالبہ

> بنایئے اسے ابتدائی مسلم لیگیوں سے پاس کرایئے پھر صوبائی مسلم لیگیوں کے سامنے یہ مسئلہ لایئے اور پھر جو لوگ اس مطالبے سے متفق نہ ہوں انہیں مسلم لیگ سے باہر نکال دیجئے اب اشتراکیوں اور ملحد قسم کے لوگوں کے مسلم لیگ پر قابض رہنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ (۳۴)

گویا کہ مولانا مودودی ایک طرف تو اسلامی حکومت کے قیام کے لیے مسلم لیگ کی جدوجہد کا اعتراف کر رہے ہیں مگر ان کا احساس یہ ہے کہ اب پاکستان کی خالق جماعت نے اصل ہدف کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا ہے اسی طرح اسلامی حکومت کے قیام کی ذمہ داری بھی مولانا مودودی مسلم لیگ ہی کے کندھوں پر ڈالنا چاہتے ہیں اس سے اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جانا چاہیے کہ علماء بالعموم اور مولانا مودودی بالخصوص اپنے لیے اقتدار کی خواہش کر رہے تھے بلکہ وہ یہ اعزاز مسلم لیگ ہی کو دینا چاہتے تھے تاہم ان کے خیالات میں اس امر کا اشارہ بھی ہے کہ اسلامی حکومت کے وعدوں اور دعوؤں کے ساتھ قائم ہونے والی مسلم لیگ پر اب لبرل (Liberal) عناصر کا قبضہ ہے چنانچہ وہ مسلم لیگی کارکنان کو اپنا بھائی تصور کر کے مسلم لیگ کی صفوں سے الحاد سے وابستہ افراد کو صاف کرنا چاہتے ہیں مزید یہ کہ مسلم لیگ سے ہی توقع ہے کہ وہ اپنے وعدے وفا کرے گی مگر بدقسمتی سے "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا" کے مصداق مسلم لیگ وعدے تو کیا وفا کرتی خود ہی ہائی جیک ہو گئی وہ علماء جو مسلم لیگ کے ہمنوا تھے اب مسلم لیگ کی صفوں میں ان کے لیے گنجائش ختم کر دی گئی قیامِ پاکستان کے بعد لیگی قیادت اسلام کا نعرہ اور اسلامی حکومت کی اصطلاح کی محض آڑ لینا چاہتے تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ شعوری طور پر مغربی فکر کو پروان چڑھانے کی کوشش شروع کر دی گئی اور پھر دیدہ دلیری کی یہ انتہا بھی سامنے آنے لگی کہ جناح اور اقبال کو بھی لادین مقاصد کے حصول کے لیے سیکولر ثابت کیا جانے لگا۔ پھر اس روش کی ٹھوس وجہ مسلم لیگ کا رویہ ہے جناحؒ کی وفات کے بعد لیگی قیادت کی اولین ذمہ داری یہ تھی کہ تحریکِ پاکستان کی اساسی فکر کو واشگاف انداز میں نمایاں رکھا جاتا اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے اقدامات کیے جاتے مگر اسکے برعکس مسلم لیگ ہی کے اپنے خدوخال بدلنے لگے پھر مسلم لیگ میں روشن خیال اور لبرل ازم کے حواری اپنے قدم جمانے میں اس حد تک کامیاب ہوئے کہ قیامِ پاکستان کی نظریاتی بنیادیں ہی غیر مستحکم کی جانے لگیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس کا پس منظر بیان کرتے ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

What kind of Pakistan Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah wanted is a valid question for, afterall, he was its co-founder and had definite ideas about it. But unfortunately, two things make it rather difficult. First, the whole set off his speeches is not yet available in one place. The ones we have either belong to the period before 1929 or to 1947-48 Second, selective reading of the Quaid's mind by political groups and their using bits and pieces to support their preferred idealogies has clouded his real image.(۳۵)

چنانچہ بانیٔ پاکستان کے اقوال اور تقاریر میں سے بہت قلیل حصے کو سیاق وسباق سے کاٹ کر اسی طرح اقبال کے کلام سے ملّا کے عنوان سے پائے جانے والے اشعار کو بنیاد بنا کر ایک فلسفہ تراشا جاتا ہے جو ایک روشن خیال اور لبرل ریاست کی تشکیل ہے نہ کہ اسلامی ریاست اور جو لوگ اسلامی ریاست کے قیام پر زور دیتے ہیں انہیں دلیل دی جاتی ہے کہ قائدِاعظم اور علامہ اقبال دونوں تھیوکریسی کے خلاف تھے جس میں ریاست پر ملّا یا علماء کا قبضہ ہوتا ہے۔ مولانا مودودی اس عذر کے جواب میں لکھتے ہیں:

ایک عذر یہ تراشا گیا ہے کہ اسلامی حکومت تو ملاؤں کی حکومت ہوگی اور ملّا دنیا کے معاملات کو کیا جانیں میں اس عذر کے گھڑنے والوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم آپ کے اس بادبان سے ہوا نکال چکے ہیں پاکستان میں اب جو لوگ اسلامی نظام کے مطالبے کو لے کر اٹھے ہیں وہ ملّا ہی نہیں آپ کی طرح دنیا کے معاملات کو بھی خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔(۳۶)

جہاں تک ریاست میں ملّا یا علماء کے کردار سے تھیوکریسی کا خطرہ ہے اور اقبال کی فکر کو بنیاد بنا کر علماء کے کردار کی نفی کی جاتی ہے۔ یہ رویہ بھی اقبال ہی کے خیالات کی غلط ترجمانی کی روش پر مبنی ہے۔ خود اقبال کے خیال میں:

One more question may be asked as to the legislative activity of a modern Muslim assembly which must consist, at least for the present, mostly of men possessing no knowledge of the subtleties of Mohammedan law. Such an assembly may make grave mistakes in their interpretation of law. How can we exclude or at least reduce the possibilities of

erroreous interpretation? The Persian constitution of 1906 provided a separate ecclesiastical committee of ulema-conversant with the affairs of the world – having power to supervise the legislative activity of the Mejlis.(۳۷)

اس امر سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ جناحؒ اور اقبالؒ دونوں کے قیامِ پاکستان کی تحریک پر بے حد گہرے اثرات تھے اور بادی النظر میں دونوں خاص طور پر جناحؒ ایک مذہبی شخصیت کا تشخص نہ رکھتے تھے مگر دونوں ہی شخصیات اقوامِ عالم کی تہذیبوں، مذاہب اور قوانین کا مطالعہ کرنے کے بعد اسلام ہی کو نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں بلکہ پوری دنیا کے انسانوں کا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ ریگینالڈ (Reginald) نے قائدِاعظم کے بارے میں بڑی حقیقت پسندانہ رائے دی ہے:

Jinnah is a sword of Islam resting in secular scabbard.(۳۸)

مرحوم جسٹس گل محمد خان اسی سلسلے میں لکھتے ہیں:

Quaid-i-Azam, right from the start of his campaign, for a separate homeland for the Muslims had in his mind the type of state which was to be governed in accord with the provisions and principles of Islam.(۳۹)

قائدِاعظم رحمۃ اللہ علیہ محض عقیدت کی بناء پر نہیں بلکہ ٹھوس مطالعے اور حقائق کی بنیاد پر اسلام ہی کو نہ صرف مسلمانانِ پاک وہند بلکہ تمام انسانوں کا نجات دہندہ اور قابلِ عمل دین سمجھتے تھے مگر قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی محض ایک خطے کے حصول کو منزل سمجھ کر خود ان ہی کے ساتھیوں نے جس کردار اور رویے کا مظاہرہ کیا پاکستان تو آج بھی اس کی سزا بھگت رہا ہے مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ محسن پاکستان بھی اپنی بیماری کے آخری لمحوں میں بے بسی اور مظلومیت کی جس کیفیت سے گزرے وہ احسان فراموشی کا تلخ ترین باب ہے جب مرض کی شدت میں ۱۱ ستمبر کو آپ کو طیارے کے ذریعے کراچی ایئرپورٹ پر لایا گیا تو آپ کو گورنر جنرل ہاؤس لانے والی ایمبولینس کا پٹرول ختم ہو گیا چنانچہ مادرِ ملت نے ملٹری سیکرٹری کو متبادل نظام کے لیے کہا چنانچہ ڈاکٹر ایم اے مستری بھی ساتھ چلے گئے اس کے بعد کی صورتحال کے بارے میں خالد محمود رانی لکھتے ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کرنل نولز اور ڈاکٹر مستری کو گئے ہوئے بڑی دیر ہو گئی تھی لیکن نہ فوجی ایمبولینس کا انجن درست ہوا اور نہ کوئی اور متبادل انتظام ہو سکا ڈاکٹر الٰہی بخش اور ڈاکٹر ریاض بار بار قائد کی نبض دیکھتے تھے جو بتدریج کمزور ہو رہی تھی محسنِ قوم کو ایمبولینس سے کار میں منتقل کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ سٹریچر کار میں نہیں رکھا جا سکتا تھا اور خود قائد میں بھی اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ کار میں بیٹھ یا لیٹ سکتے۔ اس موقع پر یہ امر تعجب خیز ہے کہ دارالحکومت کراچی میں کسی بھی بڑی شخصیت نے یہ جاننے کی زحمت ہی نہ کی کہ قائداعظم سوا چار بجے سہ پہر ماڑی پور کے ایئرپورٹ پر پہنچنے کے بعد ابھی تک گورنر جنرل ہاؤس کیوں نہیں پہنچے ان کا قافلہ کہاں ہے اور قائداعظم کا کیا حال ہے؟ یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ کوئٹے سے قائداعظم کی روانگی کی اطلاع کراچی نہ پہنچی ہو۔ (۴۰)

مسٹر ربانی اس صورتحال کا مزید تجزیہ کرتے ہیں:

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ماڑی پور ایئرپورٹ میں ٹیلی فون نہیں تھا کہ کسی نے اپنے طور پر قائد کی آمد سے متعلق اطلاع حاصل نہ کی؟ کیا ان دنوں وی آئی پی گاڑیوں کے ساتھ وائرلیس کے ذریعے کنٹرول روم سے رابطہ نہیں ہوتا تھا ملک کے گورنر جنرل اور مسلمانوں کے قائداعظم کا محدود قافلہ ایئرپورٹ اور گورنر جنرل ہاؤس کے درمیان مختصر سے سفر میں لاپتہ ہو جاتا ہے مگر کسی ذمہ دار شخصیت کو تشویش نہیں ہوتی کیا یہ نکات رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی نہیں کہ خصوصی طیارہ کوئٹہ پہنچتا ہے تو اس میں آکسیجن پوری نہیں ہے نرس کے بغیر آرمی ایمبولینس ایئرپورٹ پر آتی ہے تو راستے میں محض چند منٹ سفر کرنے کے بعد جو ابدے دیتی ہے مستزاد یہ کہ دوسری ایمبولینس کے حصول میں ناقابل قیاس اور افسوسناک تاخیر ہوتی ہے کہیں قائداعظم کی علالت کی شدید ترین نوعیت کا خیال کرتے ہوئے دارالحکومت کراچی میں جوڑ توڑ تو شروع نہیں ہو چکی تھی کہ سب لوگ نفسا نفسی کے عالم میں تھے اور کسی کو قائد کا ہوش نہیں تھا۔ (۴۱)

اس چونکا دینے والی صورتحال کا یقین کرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے مگر یہ تلخ حقیقت ہے کہ قیامِ پاکستان کے بالکل ابتدائی دنوں میں ہی ایسے عناصر اور گروہ مسلم لیگ کی صفوں میں گھس کر اپنے مفادات کے حصول کی حکمت عملی طے کر چکے تھے جس کے تحت قائداعظم کی صحت اور زندگی سے زیادہ اقتدار کو اولیت حاصل تھی چنانچہ خوش گمانی سے نکل کر صورتحال کا حقیقی ادراک واضح کر دیتا ہے کہ جو مسلم لیگ اپنے محسن اور عظیم راہنما کے ساتھ علالت کے عروج بلکہ مرض الموت کی حالت میں انتہائی غیر ذمہ دارانہ بلکہ مجرمانہ رویہ اختیار کر سکتی تھی اس سے اسلامی حکومت کے قیام کی توقع رکھنا اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا کے مصداق ہے مسلم لیگ کی ترجیحات بدل چکی تھیں چوہدری ظفر علی کے بقول قیامِ پاکستان کے بعد مقتدر طبقوں اور بعض مسلم لیگیوں کا بڑا مسئلہ کسی ایسے راستے کی تلاش تھا جو عوام کی حمایت کے بغیر انہیں زیادہ دیر تک اقتدار میں رکھ سکے۔ (۴۲)

دوسری بڑی سچائی (جو تلخ بھی ہے) یہ ہے کہ اس ملک کو بنانے والی جماعت ہی نے اپنی کرتوتوں سے تھوڑے ہی عرصے میں اس کے زوال کا آغاز کر دیا اور ملک میں سیاسی تنظیم کی کوئی اعلیٰ روایت قائم نہ ہو سکی حکمران جماعت مسلم لیگ کے راہنما اور بعض کارکن نئے اور یکدم پیدا ہونے والے وسائل کی فراوانی سے بوکھلا گئے اور ان کے قدم ڈگمگانے لگے اور وہ اقتدار کا مزہ لوٹنے اور دولت سمیٹنے کے پیچھے لگ گئے اور وہ سیاست جس کو اپنی زندگی اور توانائی کے لیے اصولوں اور ضابطوں کی ضرورت تھی ہوس اقتدار کی بھینٹ چڑھ گئی۔ (۴۳)

گو کہ قائداعظم نے قیامِ پاکستان کی بنیاد اسلام اور صرف اسلام کو قرار دیا مگر آج تک ان کے ہی بعض بیانات کی مخصوص تاویل کر کے پاکستان کو اس کی حقیقی منزل سے دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے چنانچہ آخر میں پاکستان کے بارے میں محمد علی جناحؒ کے حقیقی تصورات کا جائزہ لینے کے لیے درج ذیل بیانات قابل غور ہیں جس سے قائد کے اسلام پسند ہونے کا بین ثبوت مل جاتا ہے۔

ڈاکٹر ریاض علی شاہ لکھتے ہیں کہ قائداعظم کے آخری الفاظ "اللہ — پاکستان" تھے۔ جبکہ مادرِ ملت کہتی ہیں کہ قائداعظم نے میرے ساتھ بات کرنے کی آخری کوشش کی اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگے۔ فاطمی۔ خدا حافظ۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ (۴۴)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

حوالہ جات باب اول

[1] -خان، رشید الدین، ابوالکلام آزاد، شخصیت، سیاست، پیغام مکتبہ قدوسیہ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور، ۱۹۹۲ء، ص: ۸۷، ۸۸

[2] -Saleri, Z.A, My Leader, Pakistan Times Press, 1982, P:342, 343

[3] -مرزا محمد منور، پروفیسر، دیوار برہمن، مکتبہ وحدت ملی اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص: ۲۵۶، ۲۵۷

[4] - Safdar Mahmood, Dr, The Constitution of Pakistan, A.H Publishers Urdu Bazar, Lahore, 1994, P:3

[5] - Ansari, Zia-ud-Din, The Analytical and Critical Essays on Pakistan Affairs, Azeem Academy Lahore, 1995, P:369

[6] -اسرار احمد، ڈاکٹر، اسلام اور پاکستان، مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص: ۱۹، ۲۰

[7] - عقیل، ڈاکٹر معین الدین، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص: ۳۶۱، ۳۶۲

[8] -ایضاً، ص: ۳۶۵

[9] -قریشی، ڈاکٹر وحید، پاکستان کی نظریاتی بنیادیں ایجوکیشنل ایمپوریم لاہور، ۱۹۷۳ء، ص: ۲۶

[10] -جالبی، ڈاکٹر جمیل، پاکستانی کلچر، نیو مجاز پریس، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص: ۱۵۳، ۱۵۴

[11]- Ishtiaq Ahmad, The Concept of an Islamic State, Frances Printer (Publisher), London, 1987, P:74

[12] - G.W Chaudhary, Pakistan Transition from military to civilian rule, Scorpion Publishing Ltd, England, 1988, P:83

[13] -مرزا، محمد منور، پروفیسر، پاکستان حصار اسلام، گوہر سنز اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص: ۳۶

[14] -مرزا، محمد منور، پروفیسر، دیوار برہمن، مکتبہ وحدت ملی، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص: ۱۱۸

[15] -محمد عثمان، پروفیسر، پاکستان کی سیاسی جماعتیں، سنگ میل لاہور، ۱۹۹۰ء، ص: ۲۴

[16] -Jamil-ud-Din Ahmad, Speeches and Writings of Mr. Jinnah (Lahore, Sheikh Mohammad Ashraf) vol: 2, P:143

[17] - Bashir Ahmad Dar, Letters of Iqbal (Lahore: Iqbal Academy, 1978), P: 285

[18] - Speeches and writings of Mr. Jinnah, P:145

[19] -مرزا، محمد منور، پروفیسر، دیوار برہمن، ص: ۲۳۳

[20] -اسرار احمد، ڈاکٹر، استحکام پاکستان، مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص: ۲۱

[21] -کوثری، آزاد، پاکستان کلچر کی مختلف جہتیں، ری پبلکن بکس ٹمپل روڈ، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص: ۴۰

[22] -زیدی، سید مسعود، پاکستان کا مقدمہ، کلاسیک لاہور، ۱۹۸۸ء، ص: ۷۲

[23] -ایضاً، ص: ۷۴

[24]- Dr. G. H Zulfiqar, Pakistan as visualized by Iqbal and Jinnah (selected and Compiled) Bazm-i-Iqbal, Lahore, P:223

[25] - Dr. Nasim Hassan Shah, Quaid-i-Azam Whether Secularist or Fundamentalist published in Al-Hibba (Journal) Lahore, May 2000, P: 10, 11

[26] -اسرار احمد، ڈاکٹر، اسلام اور پاکستان، ص: ۲۶

[27] -آزاد، مولانا ابوالکلام آزادی ہند مرتبہ ہمایوں کبیر، ارشد بک سیلرز میرپور کشمیر، ۱۹۹۶ء، ص: ۳۱۴

[28] -جالبی، ڈاکٹر جمیل، پاکستانی کلچر، ص: ۲۳

[29] -محمد عثمان، پروفیسر، مسعود اشعر، پاکستان کی سیاسی جماعتیں، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۰، ۱۱

[30] -پاکستان ٹائمز، ۹ دسمبر ۱۹۴۹ء

[31] -انصاری، مولانا ظفر احمد، نظریہ پاکستان اور علما، چراغ راہ نظریہ پاکستان، کراچی، دسمبر ۱۹۶۰ء، ص: ۲۳۳

[32] -ایضاً، ص: ۲۳۴

[33] -ایضاً، ص: ۲۳۳

[34] -مودودی، ابوالاعلیٰ، مولانا، مطالبہ نظام اسلامی، ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، اگست، ۱۹۴۹ء، ص: ۲۳

[35] - Qureshi, Dr. Wahid, Jinnah's and Iqbal's Pakistan, Published in Pakistan between secularism and Pakistan by Tank Jan Institute of Policies studies Islamabad, 1998, P:73, 74

[36] -مولانا مودودی، مطالبہ نظام اسلامی، ص: ۳۱

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

37- Iqbal, Allama Mohammad, Reconstruction of Religious Thought in Islam, Sixth lecture, Sh, Mohammad Ashraf, New Anarkali, Lahore, 1988, P:175

38 - Reginald Sorensen, My impression of India, London, 1946, P:109 with reference Quest for Islamization by Justice (Retd) Gul Mohammad Khan, Pakistan Study Centre Punjab University Lahore, 1999, P:8

39 -Khan, Gul Mohammad, Justice (Retd), Quest for Islamization, Pakistan Study Centre Punjab University Lahore, 1999, P:8

40 - ربانی، خالد محمود، قائداعظم کے آخری ۵۰ دن اور ان کے ذاتی معالج، پاکستان سٹڈی سنٹر، قائداعظم کیمپس پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص: ۴۲

41 - ایضاً، ص: ۴۳

42 - ظفر علی، چوہدری، پاکستان کی ترقی پسند تحریکیں اور تنظیمیں گندھارا، راولپنڈی، ۱۹۹۱ء، ص: ۱۱

43 - محمد عثمان، پروفیسر، مسعود اشعر، پاکستان کی سیاسی جماعتیں، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۰، ۱۱

44 - ربانی، خالد محمود، قائداعظم کے آخری ۵۰ دن اور ان کے ذاتی معالج، ص: ۴۷

باب دوم

لبرل ازم اور حکمران

فصل اول: قیادت کا بحران

فصل دوم: جنرل ایوب اور جنرل یحییٰ کے ادوار

فصل سوم: بھٹو ازم

فصل چہارم: جنرل ضیاء سے جنرل مشرف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فصل اول

قیادت کا بحران (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء)

اگرچہ قائداعظم کی علالت کے دنوں میں ہی نظر آنے لگا تھا کہ قیادت کے میدان میں جناحؒ کے بعد اجالا نہیں اندھیرا ہے جیسا کہ قدرت اللہ شہاب نے فاطمہ جناح کی کتاب "My Brother" سے ایک اقتباس شہاب نامے میں نقل کیا ہے جس سے قائداعظم کے معتمد ترین قائدین کے رویے کا اظہار ہوتا ہے جب سابق وزیراعظم لیاقت علی خان اور سیکرٹری جنرل چوہدری محمد علی قائداعظم کی عیادت کے لیے بغیر اطلاع زیارت پہنچے:

> Towards the end of July, without prior notice, Mr. Liaqat Ali Khan, the prime Minister, arrived in Ziarat accompanied by Chaudhary Mohammad Ali. He asked Dr. Ilahi Bux about his diagnosis of Quaid's health. The doctor said that as he had been invited by me to attend to the Quaid, he could only what he was thought of his patient to me. But as Prime Minister I am anxious to know about it. The doctor politely replied "Yes, Sir, but I can not do it without the patient's permission.
>
> As soon as I was told, as I was sitting with the Quaid, that the Prime Minister and the Secretary-General wanted to see him, I informed him. He smiled and said "Fati, do you know why he has come? I said I would'nt be able to guess the reason. He said "he wants to know how serious my sickness is. How long I will last." After a few minutes he said "Go down. Tell the Prime Minister I will see him."
>
> "It is late, Jin. Let them see you tomorrow morning."
>
> "No, Let him come now. Let him see for himself."
>
> The two were together for about half an hour, and as soon as Liaqat Ali Khan come down, I went upstairs to my brother. I found him absolutely tired, and he wore a sickly look. He asked me to

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

give him some fruit juice, and then said, "Send Mr. Mohammad Ali". The Secretary-General of the Cabinet was with him for about fifteen minutes, and when he was once again alone, I went into his room. I asked him if would have juice or coffee, but his mind was too pre-occupied to answer me. By now it was dinner time, and he said "You better go down. Have dinner with them."

No, I said emphatically, I would rather be with you, and have dinner upstairs.

No, that is not correct. They are our guests here. Go Eat with them. "I found the Prime Minister at dinner table in a jolly mood, cracking jokes and laughing, while I shivered with fright about his health, who was alone in his sick bed."(۱)

مسلم لیگ۔ وفاداری و غداری کا معیار

قائداعظم کی وفات کے بعد ہمارے حکمرانوں نے اپنے مخصوص مفادات کے حصول کے لیے ایک طرف تو مسلم لیگ کو مقدس گائے کا درجہ دیا چنانچہ پاکستان کی خالق جماعت ہونے کا اعزاز حاصل ہونے کے باعث اس کے اندر رہ کر اس پر قبضہ کر کے جو بھی کیا جائے وہ تعمیر پاکستان اور اس پارٹی سے باہر کوئی کتنا ہی مخلص کیوں نہ ہو وہ غدار۔ سید مودودیؒ نے اس رویے پر ماہنامہ ترجمان القرآن میں درج ذیل تبصرہ کیا ہے۔

عالم یہ ہو گیا ہے کہ اس ملک میں وفاداری ان لوگوں کا اجارہ ٹھہری ہے جو کسی کرسی پر تشریف فرما ہوں اور جو لوگ کسی کرسی پر نہ بیٹھے ہوں بلکہ فرشِ خاکی پر چل پھر رہے ہوں وہ سب کے سب اس صورت میں غدار ہوتے ہیں جبکہ ان کے نظریات، آراء اور لائحہ عمل حکمران بزرگوں سے اختلاف رکھنے والے ہوں حد یہ ہے کہ کل تک جو کوئی کرسی تک رسائی نہ رکھنے کی وجہ سے خود غدار کہلاتا تھا وہ آج کرسی پا لیتے ہی وفا کا پتلا بن کر دوسروں پر غداری کا ٹھپہ لگانے بیٹھ جاتا ہے یہ ایک طرح کی سیاسی تکفیر کی فتویٰ بازی ہے جو روایتی مفتیوں اور فقیہوں کی شان سے مشغلہ عام بنی ہوئی ہے اب کوئی نہیں رہا جس پر سیاسی مفتیوں نے ایک نہ ایک بار کفر کا فتویٰ چپک نہ چھوڑا ہو۔ پہلے پہل صرف کمیونسٹ غدار کہلاتے تھے یا پھر

فتویٰ سابق کانگرسیوں پر لگایا جاتا تھا بعد میں آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں" خاکسار غدار ٹھہرے، خدائی خدمتگار پاکستان دشمن شمار ہوئے، آزاد پاکستان پارٹی والے روس کے ایجنٹ گنے گئے، احراری مخالف ریاست اور غیر امن پسند سرگرمیوں کے ملزم گردانے گئے، تحفظ ختم نبوت والے قانون شکن اقدامات کے مجرم شمار ہوئے، ناظم الدین اور دولتانہ اور ان کی وزارتیں ملکی مفاد سے بے نیازی کی قصوروار بنیں سابق دستور یہ بحیثیت مجموعی سازشوں اور جوڑ توڑ کے کوڑھ کی مریض سمجھی گئی پھر میاں افتخار الدین سے لے کر میر غلام علی تالپور تک، قیوم خان سے لے کر سردار عبدالرشید تک اور مولوی فضل الحق صاحب سے لے کر سہروردی اور بھاشانی تک ایک ایک کر کے ہر نمایاں آدمی کے ماتھے پر غداری کی مہر لگتی رہی۔(۲)

اس تناظر میں جب حکمران جماعت نے اپنے آپ کو تقدس کے گنبد میں بند کر کے باقی سب کو غدار قرار دیا تو یہ اخلاقی دیوالیہ پن کی علامت کے علاوہ حریت فکر کا راستہ روکنے کی کوشش بھی تھی جمہوری راستے سے قائم ہونے والے پاکستان کی قیادت اپنے سوا کسی کو آزادئ رائے اور تنقید کا حق دینے کے لیے تیار نہ تھی چنانچہ اس رویے کی ایک بڑی وجہ سیاست کا مفادات کے تابع ہو جانا تھا اور ستم تو یہ ہے کہ بانیٔ پاکستان کی شخصیت اور ذات کے لیے تو ہر طرح کے تحفظات حاصل کیے جا رہے تھے مگر ان کے واضح اور صاف ذہن کی غلط ترجمانی پہ کوئی روک ٹوک نہ تھی لہٰذا پاکستان کے ابتدائی حکمران استحکام پاکستان کے لیے جدوجہد کرنے کی بجائے اقتدار ہی کو اپنا ہدف قرار دیتے رہے جس کے لیے وہ ہر اخلاقی حد پامال کرنے اور ہر اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کے لیے تیار تھے۔ مسلم لیگ کی کوکھ سے نئے سیاسی گروہ ابھر آئے جنہوں نے بعد میں سیاسی جماعتوں کا روپ دھار لیا یہ اقتدار پرست افراد پر مشتمل گروپ تھے جو راتوں رات پیدا ہوتے تھے اور اقتدار ختم ہو جانے پر حباب کی طرح ختم ہو جاتے تھے۔ سیاسی جوڑ توڑ، محلاتی سازشوں اور فلور کراسنگ کی عام وباء سے ملک میں سیاسی استحکام پیدا نہ ہو سکا۔ سیاسی ڈسپلن کے فقدان کی وجہ سے سیاسی بے وفائی عام ہو چکی تھی۔ ملی سیاست جمہوری روایات کے استحکام کی بجائے علاقائیت پرستی، نسلی تعصبات اور لسانی اختلاف و نزاع کا شکار ہو گئی۔ قائداعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خان کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرپرستی سے محروم ہو جانے کے بعد ملک میں قیادت کا جو بحران پیدا ہوا اس کی وجہ سے ایک مفاد پرست گروہ ملکی اقتدار پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ ملک کی باگ ڈور ایسے مفاد پرست اور لادین عناصر کے ہاتھوں میں آ گئی جو اسلام کے بارے میں خیر خواہ تھے اور نہ جمہوریت سے مخلص تھے۔(۳)

چنانچہ سید مودودیؒ نے ۱۹۵۵ء میں لیگی قیادت کے طرزِ عمل پر بڑا حقیقت پسندانہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

> تاریخ پاکستان کے ابتدائی آٹھ سال جس کشمکش میں گزرے ہیں اس کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اگست ۱۹۴۷ء سے مارچ ۱۹۴۹ء تک ساری قوم چیختی رہی کہ اپنی مملکت کے اس نصب العین کا آئینی طور پر اعلان کیجئے جس کی امید دس سال سے آپ ہم کو دلا رہے تھے اور جس کی امید دلا کر ہی آپ نے اس مملکت کے قیام کی خاطر ہم کو آگ اور خون کی بازی کھیلنے پر آمادہ کیا تھا۔ ایک مخلص اور دیانت دار قیادت کو جو کام خود کرنا چاہیے تھا اسکے لیے قوم کی طرف سے مطالبے کی ضرورت پیش آنا ہی کم شرم ناک نہ تھا کجا کہ اسے ٹالنے اور دبانے کی کوششیں کرنا اور اس کو ناکام کرنے کے لیے ہر طرح کی چالیں چلنا مگر افسوس کہ سب کچھ ہوا اور اس حد تک ہوا کہ قوم کا وہ حسنِ ظن بری طرح مجروح ہو گیا جو وہ اپنے راہنماؤں سے رکھتی تھی۔ آخر کار جب تمام تدبیروں کے باوجود یہ مطالبہ نہ دبا تو قیامِ پاکستان کے پورے انیس مہینے بعد قراردادِ مقاصد پاس کی گئی جس میں مملکت کے اسلامی نصب العین کا اقرار اور اعلان تھا۔(۴)

قیامِ پاکستان کے بعد تقریباً پہلے دس برس میں حکمران اسلام اور اسلامی نظام کے نعرے کو چھوڑ تو نہ سکتے تھے مگر ان کی تجدد پسندی اور لبرل ازم بھی اسلام کی آڑ میں کبھی کبھی ظاہر ہو جاتے تھے جیسا کہ پاکستان میں تحریکِ تجدد کے اہم مفکر پروفیسر شریف المجاہد کی رائے میں بعد میں آنے والے خود ساختہ رواداروں کے مقابلے میں پاکستان کے ابتدائی ادوار کے تجدد پسند مسلمان اپنے رویے اور طرزِ عمل میں زیادہ روادار تھے مارچ ۱۹۴۹ء میں جب آئین ساز اسمبلی میں قراردادِ مقاصد کے مسودے پر بحث شروع ہوئی تو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر محمود حسین اور پروفیسر عمر حیات نے اسلام کی جدید

تفسیر اور ترجمانی کی۔ یہی انداز خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی تصانیف میں اور پروفیسر احمد شاہ بخاری نے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے دورہ امریکہ (۱۹۵۰ء) میں ان کی تقریر لکھتے ہوئے اختیار کیا۔ یہ تقریریں "پاکستان-ایشیاء کا دل" (Pakistan – The Heart of Asia) کے عنوان سے ہارورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کی ہیں۔ فکرِ جدید کے حامل مسلمانوں نے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں مذہبی جنونیوں اور لاطائل گفتگو کرنے والے عناصر کو پسپا کر دیا تھا کیونکہ وہ اسلام کو سمجھتے تھے بعد میں آنے والے روشن خیال افراد کی طرح اسلام کی تفسیر کے لیے انہیں ملّاؤں سے رجوع نہیں کرنا پڑتا تھا۔(۵)

مذکورہ بالا تجزیے میں درج ذیل امور قابل غور ہیں:

- ابتدائی برسوں میں لبرل افراد حکمرانوں اور اداروں کے معاملے میں بے حد مؤثر تھے۔
- اسلام کو جدیدیت کے روپ میں پیش کرنے کے لیے عملی دلائل سے مسلح تھے۔
- لیاقت علی خان کی دورہ امریکہ کی تقاریر ایک لبرل فرد احمد شاہ بخاری نے تخلیق کی تھیں جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پہلے وزیر اعظم کی زبان سے کس فکر کی ترجمانی ہوئی تھی اور وہ کس کی زبان بولتے تھے۔

تاہم پروفیسر شریف المجاہد کا یہ کہنا کہ فکرِ جدید کے حاملین نے مذہبی جنونیوں کو پسپا کر دیا تھا اس لیے درست نہیں ہے کہ قیادت کے لبرل رویّوں کے باوجود قراردادِ مقاصد منظور ہوئی گویا کہ پاکستان آئینی طور پر بھی مسلمان قرار پایا جیسا کہ نعیم صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

> جہاں تک ریاست پاکستان کے وجود کو پیشِ نظر رکھ کر قراردادِ مقاصد کی حیثیت متعین کرنے کا سوال ہے اس قرارداد کی نوعیت بالکل وہی ہے جو کسی فرد کے کلمہ طیبہ ادا کرنے کی ہوتی ہے کہ وہ خدا کی حاکمیت اور اس کے نبی کی شریعت کی پابندی میں زندگی بسر کرنے کا وعدہ و اقرار کرتا ہے اور اس اقرار کی بنیاد پر اسے مسلمان ہونے کے حقوق حاصل ہو جاتے ہیں ریاست کی زبان دستور ساز اسمبلی ہوتی ہے اور اس نے بھی خدا کی حاکمیت اور اس کے نبی کی بتائی ہوئی حدود اللہ کی پابندی کا اقرار کر کے گویا پوری ملت اور ریاست کی اجتماعی ہستی کی طرف سے کلمہ طیبہ ادا کیا ہے۔(۶)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۹۴۹ء میں قراردادِ پاکستان کا منظور ہونا قیام پاکستان کے بنیادی ہدف کی طرف اہم پیش رفت بھی تھی اور قیام پاکستان کا جواز بھی لہٰذا پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے دوٹوک الفاظ میں واضح کیا:

> جہاں تک لوگوں کی اس امنگ کا تعلق ہے کہ پاکستان میں اسلامی اصولوں کے مطابق حکومت ہونی چاہیے دستور ساز اسمبلی کی پاس کردہ قراردادِ مقاصد اس کی کافی ضمانت ہے میرا یہ ایمان ہے کہ اگر ہم نے پاکستان میں اسلامی حکومت قائم نہ کی تو پاکستان زندہ نہیں رہ سکے گا۔(۷)

قراردادِ مقاصد کی منظوری کے بعد ۱۹۵۶ء کے دستور کا سامنے آنا پاکستان میں اسلامی نظریہ حیات کے فروغ کی طرف ایک اور اہم قدم تھا مگر جس قیادت سے یہ فریضہ سرانجام پا رہا تھا وطنِ عزیز کے اسلام پسند اس کے بارے میں کسی خوش گمانی کا شکار نہ تھے جیسا کہ سید مودودیؒ نے برملا تحریر کیا:

> نیا دستور تیسری خواندگی کے مرحلے سے گزر کر ملک کے حاکم اعلیٰ کی منظوری حاصل کر چکا ہے اور ۲۳ مارچ سے نافذ ہو جانے والا ہے یہ دستور نقائص کے متعدد تشویشناک پہلو اپنے اندر رکھنے کے باوجود اس معنی میں اسلامی دستور ہے کہ اس نے تعمیر و ارتقاء کا رخ اسلام کی طرف پھیر دیا ہے لیکن اس رخ پر عملاً تعمیر و ارتقاء کا کام جبھی ہو گا کہ کرنے والے اسے کریں ورنہ مجرد دستور کے الفاظ میدان میں آکر کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتے۔(۸)

اس قانونی اور آئینی بنیاد کے قائم ہونے کے باوجود حکمرانوں کے لبرل اور مفاد پرستانہ طرز عمل کے باعث بداعتمادی کی فضا بڑھتی چلی گئی اور پاکستان کے ابتدائی عشرے میں ہی ایک ایسی فکری کشمکش نے زور پکڑا جو آج تک شدت سے جاری ہے۔

پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی ملکی سیاست میں دو گروہ سرگرم عمل ہو گئے پہلا گروہ اصلاح پسندوں کا تھا جو سیکولر جمہوری نظریات کا حامل تھا دوسرا گروہ بنیاد پرستی کا علمبردار تھا اور نوزائیدہ مملکت میں ایسے آمرانہ طرزِ حکومت کے احیاء کا حامی تھا جو سول اور فوجی بیوروکریسی کے حکم کے تابع ہو اصلاح پسندوں کے

نزدیک اسلام ایک قوت متحرکہ ایک نظریہ حیات اور تخلیقی سوچ کے لیے مستقل سرچشمے کا نام تھا وہ اسلام کو جامد قانون یا اوامر و نواہی کا مجموعہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے اصلاح پسندوں کے گروہ سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کا خیال تھا کہ قرآن پاک میں کسی خاص قسم کے طرزِ حکومت کی نشاندہی نہیں کی گئی اور نہ ہی اس میں ریاست کے مختلف اداروں کی تشکیل کے لیے کوئی ناقابل تغیر اصول اور ضوابط بیان کئے گئے ہیں ان لوگوں کے خیال میں اسلامی ریاست کی بنیاد قرآن میں بیان کئے گئے مساوات اور عدل کے اصولوں پر استوار کی جانی چاہیے اور اسے عوام کی تخلیقی روح کے لیے مکمل آزادی کا ماحول فراہم کر کے وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینا چاہیے مساوات اور آزادی کے یہ اصول ناقابل تغیر ہیں مگر ذہنی، سیاسی اور سماجی ترقی کے لامحدود امکانات کے حصول کے لیے جدت اور اجتہاد کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اصلاح پسندوں نے نظریاتی سطح پر اپنا مؤقف مؤثر انداز میں پیش کیا مگر جب عوام کی ضروریات سے ہم آہنگ کسی قابل عمل نظام کی نشاندہی کا مسئلہ درپیش ہوا تو ان کی نگاہ ذرا سا بھی ان روایتی اداروں سے آگے نہ دیکھ سکی جن سے وہ برطانوی دور میں مانوس ہو چکے تھے۔

دوسری طرف بنیاد پرستوں کا اصرار تھا کہ قرآن اور حدیث میں رہتی دنیا تک انسانوں کے لیے درکار قوانین موجود ہیں اور یہ قوانین زمان و مکان سے بے نیاز دنیا کے ہر معاشرے کے لیے قابل عمل ہیں اس نقطہ نظر کے مطابق قرآن اور حدیث میں تمام اصولی اور بنیادی سوالات کا شافی جواب دے دیا گیا ہے اور اب اس سلسلہ میں کسی قسم کے انحراف یا اختلاف کی گنجائش نہیں ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم آئمہ اور فقہاء کے فیصلوں اور فتوؤں کی روشنی میں ان قوانین کا کھوج لگائیں ہمارا کام اسلامی قوانین دریافت کرنا ہے، نئے قوانین ایجاد کرنا نہیں اصلاح پسندوں کو مغربی تعلیم سے متاثر طبقوں کی حمایت حاصل تھی اور بنیاد پرستوں کا زیادہ تر تعلق نچلے درمیانے طبقے سے تھا یوں اصلاح پسند مغرب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے وراثت میں ملے ہوئے اداروں کو سینے سے لگائے رہے اور بنیاد پرست ماضی کی یادوں کا دامن چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے المیہ یہ تھا کہ اصلاح پسند اور بنیاد پرست دونوں جمود کی قوتوں کے علمبردار بن گئے۔(۹)

جناب الطاف گوہر کو ایک دانش ور اور مفکر کے طور پر نمایاں مقام حاصل ہے مگر پاکستان کے ابتدائی برسوں کی فکری کشمکش کے اس تجزیے میں گوہر صاحب کا جھکاؤ قدرے تجدد پسندی ہی کی طرف ہے وہ سلیم الفطرت اسلام پسندوں اور مغربی اصطلاح کے مطابق بنیاد پرستوں میں فرق کرنا بھول گئے نیز موصوف نے اسلام پسندوں کے افکار کی ایسی ترجمانی کی ہے جو انصاف پر مبنی نہیں ہے کیونکہ علمائے اسلام تو پاکستان میں بھی اور دیگر خطوں میں بھی اجتہاد کو دین کے فروغ میں نہ صرف جائز بلکہ لازم قرار دیتے ہیں تاہم اسلام کے قابل قدر علمی کام کو دنیائے مغرب کی تقلید میں اول تا آخر شک کی نظر سے دیکھ کر اجتہاد کی آڑ میں بے سمت تحقیق کا تیشہ چلانا تجدد ہی کا رویہ ہے۔ اسلام یہ حق فی الواقع نہ تو علماء کو دیتا ہے اور نہ ہی علمائے حق اس پر اصرار کرتے ہیں کہ ان کی رائے کو حرفِ آخر مان لیا جائے مگر دیگر علوم میں جب ان علوم کے ماہرین کو قائدانہ اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے تو علوم اسلامیہ میں علماء کی برتری تسلیم کیے بغیر فکری انتشار سے بچنا محال ہے۔ جہاں تک اصلاح پسندوں کی طرف سے مساوات اور عدل کے قرآنی اصولوں کی بناء پر اسلامی ریاست کی تشکیل کے دعوے اور مطالبے کا تعلق ہے وہ ان کی تہذیب، طرزِ عمل اور قرآن وسنت کی من مانی تاویلات سے ظاہر ہے دراصل قرآن کو بنیاد بنا کر مساوات اور عدل کے نظام کے قیام کا دعویٰ پاکستانی معاشرے کے اسلامی خمیر کے باعث ہے کیونکہ غیر اسلام اور لادین افکار کی قبولیت کا براہِ راست امکان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے روشن خیال اصلاح پسند اپنی بات کو اللہ اور رسول کی نسبت دے کر اسلامائز (Islamize) کرنے پر مجبور ہیں جیسا کہ سید مسعود زیدی درج ذیل الفاظ میں "اجتہاد" کرتے ہیں۔

> اللہ رب العالمین اور اس کے پیارے رسول رحمت للعالمین کا عقیدہ رکھنے والا مسلمان تو فکری طور پر سیکولر ہے کیا دوسری قوم کے بت کی آنکھ پھوڑنے کی سزا مسلمان کو سزا کا حکم دینے کا فیصلہ اور ہمارے نبی کریم ﷺ کی نصرانیوں کو

> مسجدِ نبوی میں اپنے طریقے سے نماز ادا کرنے کی اجازت دینے سے بہتر مثال سیکولر ذہنیت کی تاریخ عالم پیش کر سکتی ہے؟(۱۰)

گویا کہ لبرل اور سیکولر فکر کو معتبر بنانے کے لیے نعوذ باللہ اجتہاد کی ایک شکل یہ ہے کہ سیکولرازم کی سب سے مؤثر اور بہتر مثال تو خود رسول کریم ﷺ کا اسوہ ہے۔

جب مسعود زیدی جیسے مفکرین کے "اجتہادی کارناموں" کا علماءِ حق نے مواخذہ کیا تو "ملاں" کے لفظ کو منفی انداز میں استعمال کیا گیا تجدد پسند اپنے لبرل افکار کی ترویج واشاعت کی راہ میں علماء کو رکاوٹ سمجھنے لگے جس کا اظہار درج ذیل انداز میں کیا جانے لگا۔

> پاکستان جس طرح کے حالات میں قائم ہوا ان سے علماء کا حوصلہ بڑھا اور انہوں نے مسلم لیگ کی مذہبی نعرے بازی کو نہ صرف یہ کہ اپنے حصولِ اقتدار کے لیے استعمال کیا بلکہ ان علماء نے اسلام کی وہی تفسیر پیش کی جو ان کے گروہی مفادات کے مطابق تھی۔(۱۱)

پاکستان کے معروف لبرل مفکر آئی اے رحمان نے اپنے مذکورہ بالا تبصرے میں اپنی مخصوص فکر کے باعث مسلم لیگ کی قیادت میں تحریکِ پاکستان کو محض مذہبی نعرے بازی قرار دیتے ہوئے علماء کی اسلامی نظام زندگی کے لیے کاوشوں اور جدوجہد کو پاپائیت (Theocracy) کے مماثل قرار دے کر حصولِ اقتدار کی حکمتِ عملی قرار دیا ہے لہٰذا علماء کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اس طرح کے فکری مغالطوں اور پروپیگنڈے کے صحیح علاج کے لیے گروہی مفادات سے بالاتر ہو کر بداعتمادی کی اس فضا کو ختم کریں۔ دوسری طرف اسلام نے ہر زمانے کے اعتبار سے اجتہاد کے لیے آزادئ اظہار کو جن آداب اور شرائط کے ساتھ نہ صرف جائز رکھا ہے بلکہ باعثِ فضیلت قرار دیا ہے اس کا اہتمام جس محنت اور ایثار و قربانی سے ہونا چاہیے اس کی بجائے اسلام پسندوں کی صفوں میں بھی تن آسانی اور پھر تنگ نظری کا رویہ غالب ہے چنانچہ پاکستان کے ابتدائی سال ایک ایسی فکری کشمکش اور مغالطوں سے بھری ہوئی صورتحال کے شاہد ہیں جس نے علماء اور اسلام پسندوں کو گروہ بندی، شخصیت پرستی اور جامد طبقے کے طور پر متعارف کروایا ہے جبکہ سیاسی قیادت اور حکمران اقتدار کی ہوس میں اسلام کا متجددانہ ایڈیشن فروغ دے کر ہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے اہداف حاصل کرنے میں کوشاں ہوتے ہیں اور آزادی کے ابتدائی برسوں سے آج تک ایسا ہی فکری جمگھٹا ہماری شناخت اور سمت کے تعین کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

وہ قوتیں جو آزادیٔ اظہار کو روک رہی ہیں ان میں ایک طرف وہ تنگ نظر لوگ شامل ہیں جو روایتی اور مروجہ خیال میں کسی قسم کی تبدیلی کو کفر سمجھتے ہیں اور دوسری طرف سیاست و تدبر کے وہ اجارہ دار ہیں جو سارے معاشرے کی آنکھوں پر وہی عینک چڑھا دینا چاہتے ہیں جو خود ان کے اقتدار کی آنکھوں پر چڑھی ہے۔ پہلے گروہ میں وہ لوگ ہیں جو اپنے عقائد کے سلسلے میں اتنا تشدد برتتے ہیں کہ ہر اس فکر یا طرزِ عمل کو جو ان سے مطابقت نہیں رکھتا، گردن زدنی قرار دیتے ہیں۔ ان کے لیے مذہب کے معنی صرف و محض وہ قصے کہانیاں اور معجزوں بھری روایات ہیں جن کی مدد سے وہ اپنے وعظوں میں گرمی بھر کر ملک کی غالب آبادی کو ضعیف الاعتقادی کے طلسم میں گرفتار رکھتے ہیں مذہب کے اجارہ داروں کا کاروبار چونکہ صرف توہم پر قائم ہے لہٰذا وہ ہر نئے خیال کو بار آور ہونے سے پہلے کچل دینا چاہتے ہیں نتیجہ اس کا یہ ہے کہ مذہب کی سطح پر ذہنی آزادی کا مسئلہ ایک ایسی صورتحال سے دوچار ہے جس میں خیال غائب ہے اور توہم زندگی کا راستہ روکے کھڑا ہے کوئی نیا خیال جب بھی حال کی گود میں آکر بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے، معاشرہ اسے چھپکلی سمجھ کر دامن جھٹکنے کا عمل کرتا ہے اور جھٹ اپنے مروجہ عقیدے یا خیال کے بے جان بچے کو گود میں بٹھا کر جذبے کی پوری شدت کے ساتھ پیار کرنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کے ذہن کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جیسے اس کے لاڈلے بچے کو چھین کر ایک نامعلوم باپ کے بچے سے اس کی گود بھری جا رہی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تاریخی بہاؤ سے الگ کھڑے ہیں اور جنہوں نے ذہنی آزادی کو خوف اور احساس زیاں کے تصور سے دبا کر خیال کے ارتقاء کو روک دیا ہے آج انہی لوگوں کی وجہ سے نیا خیال دھول اور گرد میں اٹا کچی سڑک کے کنارے پڑا بھیک مانگ رہا ہے دوسرے گروہ میں جیسا کہ میں نے کہا ہے سیاست و تدبر کے وہ اجارہ دار شامل ہیں جو مملکت کے تحفظ کا نام لے کر ہر اس آواز کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کے اقتدار کے لیے ذرا سا بھی خطرہ بن سکتی ہے ذہنی آزادی کے یہ اس لیے دشمن ہیں کہ یہ صرف و محض اقتدار کے خواہاں ہیں اور معاشرے کو اپنے اقتدار کی برکات سے مستفیض کرنے کے لیے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ صرف ان کی ہی آواز معاشرے تک پہنچے اس سطح پر اصول یا اصولی سطح پر مخالفت کا عمل بھی ذات کی مخالفت بن جاتا ہے ایسے میں ہر اس شخص کو اقتدار حاصل

ہو سکتا ہے جو ان کی فکر میں جذب ہو جائے اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے اور ان کی عینک سے دیکھنے کا عمل ہنسی خوشی کر سکے اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ سارے معاشرے میں انفرادی صلاحیت کا تصور بے معنی ہے بھاری چیزیں تہہ میں بیٹھ گئی ہیں اور تنکے سطح آب پر تیر رہے ہیں ایسے میں اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں بحران کو برقرار رکھا جائے۔ (۱۲)

تاریخ پاکستان کے ابتدائی سالوں پر نظر ڈالنے سے گمان ہوتا ہے کہ مورخین اور تجزیہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد اسلام پسند طبقات کو روشن خیالی اور حریت فکر کی راہ میں رکاوٹ قرار دیتی ہے اور آج تک اسی طرز کا موقف اختیار کیا جاتا ہے مگر دوسری طرف ابتدائی برسوں کی سیاسی قیادت نے جو مطلق العنان طرزِ عمل اختیار کیا اور آزادیٔ اظہار کو غداری قرار دیا تو پاکستان میں جبر، گھٹن اور بداعتمادی کی فضا پروان چڑھی لیکن یہ قیادت اپنی ذاتی زندگی اور شخصی رویوں میں چونکہ لبرل رویے کا اظہار ہی نہ کرتی تھی بلکہ ترجمان بھی تھی اور اسلامی نظریہ حیات سے کافی فاصلے پر تھی اس لیے چاہے بنیادی حقوق سلب کیے جائیں، آئین کو موم کی ناک بنا کر اپنے مفادات کی طرف موڑا جائے اور حریت رائے کا ہر امکان ختم کر دیا جائے تو بھی قصور وار وہ ہیں جو قرار دادِ مقاصد منظور کروا کے شہدائے تحریک پاکستان سے بے وفائی کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ حکمرانوں کے معتمد اور رازدان قدرت اللہ شہاب گورنر جنرل غلام محمد کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

> مسٹر عزیز احمد کا مشورہ پلے باندھ کر میں گورنر جنرل ہاؤس پہنچا ایک اے ڈی سی مجھے اپنے ساتھ اوپر والی منزل میں لے گیا وہاں برآمدے میں قالین بچھا ہوا تھا اور اس پر صوفے لگے ہوئے تھے درمیان میں ایک گول میز پر بڑے خوبصورت پھول سجے ہوئے تھے مسٹر غلام محمد ایک گدے والی آرام کرسی پر بیٹھے تھے انہوں نے نیلے رنگ کا دھاریدار سوٹ پہنا ہوا تھا، رومال اور جرابیں ٹائی کے ہم رنگ تھیں، کوٹ کے کالر میں گلاب کا پھول ٹنگا تھا، سر پر کالی جناح کیپ تھی، ہاتھ میں سگریٹ تھا، ان کے قریب والی کرسی پر گورنر جنرل کی پرسنل پرائیویٹ سیکرٹری مس روتھ بورل بیٹھی تھی یہ بڑی طرحدار، نازک اندام، خوبصورت، نیم امریکن، نیم سوس لڑکی تھی جسے وہ واشنگٹن سے منتخب کر کے اپنے ساتھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان لائے ہوئے تھے مس بورل پر نگاہ پڑتے ہی میں نے دل ہی دل میں مسٹر غلام محمد کے انتخاب کی داد دی۔(۱۳)

مسٹر غلام محمد کے کردار میں کسی قسم کا کوئی آئیڈیل ازم نہ تھا اور ان کے مقاصد میں اولیت کا شرف ہوس اقتدار کو حاصل تھا دوسرے درجہ پر صنفِ نازک کی طرف ان کا شدید رجحان تھا جو اکثر مریضانہ حد تک پہنچ جایا کرتا تھا اپنے مقاصد کے حصول کے لیے وہ خود غرضی، خود سری، ہٹ دھرمی، دھونس، دھاندلی اور اینچ پینچ سمیت ہر قسم کا حربہ استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے جن لوگوں نے ان کے ساتھ وزیر اعظم لیاقت علی خان کی کابینہ میں کام کیا تھا ان پر مسٹر غلام محمد کے کردار کے یہ سب پہلو روزِ روشن کی طرح عیاں تھے یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی جب انہیں بستر علالت سے اٹھا کر گورنر جنرل کی کرسی پر بٹھا دیا گیا تو یہ ایک ایسی غلطی کا ارتکاب تھا جس کا خمیازہ پاکستان آج تک بھگت رہا ہے۔(۱۴)

بالعموم سمجھا جاتا ہے کہ پاکستان میں صرف فوجی حکومتوں نے ہی آزادی اور جمہوریت کو پامال کر کے آمریت کو رواج دیا ہے مگر ابتدائی عشرے کی مسلم لیگی قیادت جمہوریت، بنیادی حقوق اور حریت فکر کی خوش کن اصطلاحات استعمال کرنے کے باوجود آمریت کی راہ پر گامزن تھی ایس ایم ظفر مسٹر غلام محمد کے بارے میں تبصرہ کرتے ہیں:

> ملک غلام محمد نے جو ملک کے آئینی گورنر جنرل تھے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی ان دفعات کا پورا پورا فائدہ اٹھایا جو ایک انگریز گورنر جنرل کو خصوصی اختیارات دیتی تھیں اور جو ایک انگریز گورنر جنرل کو حاصل تھے ان اختیارات کے استعمال اور سیاسی جماعتوں کی کمزوری کی وجہ سے ملک غلام محمد ایک "نیم ڈکٹیٹر" کی حیثیت سے حکومت کرتے رہے۔(۱۵)

آمرانہ طرزِ حکومت اپنے استحکام کے لیے بالعموم تفریح اور کھیل تماشے کو ترجیحاً رواج دیتا ہے چنانچہ کمیونسٹ اور دیگر لادین عناصر نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سب سے پہلے تحریک پاکستان کی فکری بنیادوں پر تیشہ چلایا۔

کمیونسٹوں نے اپنے نظریات کی بناء پر اور مترفین نے اپنے مزاج کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے یہاں ان کاموں کی پشت پناہی شروع کر دی جن سے اسلام کی منزل

کھوٹی ہوتی ہو اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک طرف تو مسلمانوں کے ذہنوں میں پراگندگی پیدا ہوئی دوسری طرف ان کے افعال و اعمال میں اسلام کا رنگ آہستہ آہستہ مدھم پڑنے لگا اور مسلم قوم کی وہ قوتیں جو اسلام کے فروغ پر صرف ہوئی تھیں وہ اسلام کی بیخ کنی پر صرف ہونی شروع ہوئیں یہ آرٹ کونسلیں اور آرٹ گیلریاں، یہ ناچ گانے کے رنگا رنگ پروگرام یہ ورائٹی شو سب اسی سلبی مقصد کے لیے وقف ہیں۔(۱۶)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

جنرل ایوب اور جنرل یحییٰ کے ادوار

محمد علی جناح اور لیاقت علی خان کی قیادت سے محروم ہونے کے بعد وطنِ عزیز کی باگ ڈور ایسے مفاد پرست افراد کے ہاتھوں میں آگئی جو لادینی رجحانات کے حامل تھے اور اسلام کے خیر خواہ نہ تھے اور نہ ہی جمہوریت کے۔ لہٰذا سیاسی انتشار نے زور پکڑا اور آمرانہ طرزِ عمل کے حامل گروہ نے وسیع اختیارات حاصل کیے یہی وجہ ہے کہ اپنے الفاظ کی حد تک ۵۶ء کا دستور منظور تو ہو چکا تھا مگر عملی نفاذ کے اعتبار سے آمریت پسند حکمرانوں نے اسے موم کی ناک سمجھ کر جدھر چاہا ادھر اس کا رخ پھیرتے رہے حتیٰ کہ عوام میں یہ سوچ پیدا ہو گئی کہ ملک کے لیے جمہوریت سے زیادہ آمریت مفید ہے۔ اس بداعتمادی کی فضا میں پاکستان کا پہلا آئین منسوخ کر دیا گیا اور اکتوبر ۱۹۵۸ء میں صدر سکندر نے مارشل لاء کا اعلان کر دیا جس میں ایوب خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے مگر "جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے" کے مصداق ایوب خان نے اسی مہینے سکندر مرزا کو فارغ کر کے مکمل اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا اور فوجی انقلاب کے نام سے ایک طویل دورِ آمریت کا آغاز کیا۔ معروف قانون دان ایس ایم ظفر اس فوجی انقلاب پر درج ذیل تبصرہ کرتے ہیں۔

> ۲۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جب وہ حکومت پر قابض ہوئے تھے تو اس وقت اسمبلیاں توڑ دی گئیں اور ملک کا صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا یعنی وہ خود سرچشمۂ آئین و قانون تھے۔
>
> محمد ایوب خان نے بھی نپولین کی طرح فوج کے ذریعے اقتدار حاصل کیا تھا ۱۹۵۴ء سے ایوب خان پاکستان کی سیاست کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کر رہے تھے بالخصوص ۱۹۵۶ء سے جب ملک غلام محمد گورنر جنرل نے انہیں کابینہ میں شامل کروایا تو وہ ایک طرح سے خود حکومت کے اندر موجود تھے اور حکومت کی تمام کمزوریوں سے آگاہ ہو چکے تھے۔

> جس طرح سے نپولین کے پیش روؤں نے اس کے لیے پہلے سے آسانی پیدا کر دی تھی اور روبس پیئر (Robes Piere) وغیرہ سے عوام بہت تنگ آ چکے تھے اسی طرح سے ایوب خان کے لیے بھی آسانی ان کے پیش روؤں نے پہلے سے پیدا کر دی تھی ایوب خان کے اقتدار سنبھالنے سے پہلے ملک کی سیاسی فضا اس قدر مکدر ہو چکی تھی کہ ملک کو بچانے کا نعرہ بلند کر کے فوج کو اپنا ہمنوا بنا لینا ان کے لیے کچھ مشکل نہ تھا اس کے علاوہ ایک حد تک قوم بھی تبدیلی کے لیے تیار ہو چکی تھی یہی وجہ ہے کہ اکتوبر ۱۹۵۸ء کا فوجی انقلاب خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر کامیاب ہو گیا۔ (۱۷)

اس پر مزید ستم یہ ہے کہ آمریت کو جمہوری چہرہ دینے کے لیے صدر ایوب نے اپنے اقتدار کو عوامی ثابت کرنے کی منفرد کوشش کی۔

> صدر ایوب نے اپنی حکومت کے لیے کلی اختیارات حاصل کرنے کی خاطر بنیادی جمہوریتوں کا نظام قائم کیا۔ بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات کے بعد یونین کونسلوں اور یونین کمیٹیوں سے استصوابِ رائے کے ذریعے یہ پوچھا گیا کہ انہیں صدر ایوب کی قیادت پر اعتماد ہے یا نہیں؟ اس وقت ملک کے حالات ایسے تھے کہ استصوابِ رائے کے نتائج صرف صدر کے حق میں ہی ہو سکتے تھے۔ (۱۸)

جدید دور میں جب ریاست و حکومت کا ادارہ ہی طاقت کا اصل سرچشمہ ہے کسی بھی طرح کی آزادی، حریت فکر اور حقوق اسی ادارے کے مرہونِ منت ہیں لہٰذا جب آمرانہ طرزِ حکومت جڑ پکڑتا ہے تو آزادی (Liberty) کا تصور مشرقی ہو، اسلامی ہو یا مغربی اس کے امکانات مسدود ہو جاتے ہیں قدرت اللہ شہاب کی رائے میں حکومت یا نظام حکومت کو بدلنا سیاستدانوں کا حق ہے اگر وہ اپنی بدنظمی یا بے بضاعتی یا انتشار کی وجہ سے یہ حق استعمال کرنے سے قاصر رہیں تو مسلح افواج خود بخود میدان میں اتر آتی ہیں حکومت یا نظام حکومت بدلنے کے اس عمل کو عام طور پر "انقلاب" کا نام دیا جاتا ہے یہ سراسر غلط ہی نہیں بلکہ لفظ "انقلاب" کی توہین بھی ہے کیونکہ انقلاب ہمیشہ عوام الناس ہی لاتے ہیں۔ (۱۹)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ ہے ایوب کے فوجی انقلاب کی حقیقت جس میں اصطلاحات اور تعمیر و ترقی کے خوش کن نعروں کے باوجود ملک کے سیاسی عدم استحکام، تجدد اور رسوائی کا سامان تھا۔ ایوب خان کو پاکستانی عوام نے اپنے نجات دہندہ کے طور پر قبول کیا تو اس کی بڑی وجہ پاکستان کے ابتدائی عشرے میں سیاسی قیادت کی مفاد پرستی تھی نہ کہ ایوب خان کا بطور حکمران پاکستان کے لیے موزوں اور مناسب ہونا مگر ایوب خان جو پاکستان کو بحرانوں سے نکالنے اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کا دعویٰ کرتے تھے اپنی اور اپنے حواریوں کی اغراض اور مفادات کے تابع فرمان بنتے چلے گئے اور عوام میں ساری شعبدہ بازیوں کے باوجود ان کی کوئی بنیاد نہ بن سکی مزید افسوسناک امر یہ ہے کہ ایوب خان نے ہی پاکستانی سیاست میں فوجی مداخلت کی غیر آئینی روایت کو اتنا مستحکم کیا کہ تاریخ پاکستان میں جمہوری عمل کی راہ اور سیاسی استحکام کے فروغ کی راہ میں اصل رکاوٹ وہ مارشل لاء حکومتیں قرار پاتی ہیں جن کے امام ایوب خان ہیں۔

فوجی انقلاب کی مدعت کا امام

اس صورتحال کی دو وجوہ ہیں ایک تو موجودہ ریاست میں فوج سب سے بڑی منظم طاقت ہوتی ہے اور ملکی وسائل کا بڑا حصہ دفاع کے نام پر اس کے استعمال میں آتا ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلم ملکوں پر غلامی کا جو طویل دور مسلط رہا ہے اس کی بناء پر وہاں اب تک ایسی قیادت تیار نہیں ہو سکی جسے اتنا عوامی اعتماد حاصل ہو کہ اس کی موجودگی میں فوج اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے کی جرأت نہ کر سکے۔(۲۰)

معاشرے میں سیاسی اور جمہوری شعور موجود ہو تو صحیح سیاسی قیادت ابھرتی ہے جس کے نتیجے میں آئینی و قانونی بالادستی قائم ہوتی ہے مگر ہمارے ہاں عوام حتیٰ کہ سیاستدانوں میں بھی صحیح شعور کی کمی کے باعث جب کبھی سیاسی عمل آگے بڑھنے لگا کسی طالع آزما یا مرد آہن نے سیاسی انتشار پر قابو پانے کی آڑ میں فوجی اقتدار کو دوام بخشا جبکہ سیاست کے بازی گروں سے مایوس اور دل برداشتہ عوام نے ہر مارشل لاء کو خوش آمدید کہا مگر جلد ہی الوداع کہنے کی آرزو بھی ان کے قلوب میں مچلنے لگی۔

The masses cheerfully welcomed every Martial Law Government but after some time with the same fervour prayed for it's departure. Similarly they first greeted political or the so-called democratic Governments, but after a short span of time prayed for their exit.(۲۱)

اگر پاکستان میں سیاسی استحکام ہو تو فوجی انقلاب یا حکومت کا امکان ختم ہو جاتا ہے کیونکہ ساری طاقت اور قوت کے باوجود فوج یا نوکر شاہی کو سیاسی قیادت کے ملازم کے طور پر کام کرنا ہوتا ہے۔ الطاف گوہر لکھتے ہیں:

> انتظامیہ کے سول ملازمین ملازمت کے قواعد و ضوابط کے پابند ہوتے ہیں وہ کسی سیاسی کاروائی میں حصہ نہیں لے سکتے اور ان پر یہ بھی پابندی عائد ہوتی ہے کہ وہ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی ایک مقررہ مدت تک نہ کسی سیاسی جماعت میں شامل ہو سکتے ہیں نہ انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں انتظامیہ کے فوجی محکموں پر آئین اور قانون کے تحت کڑی پابندیاں لگائی جاتی ہیں فوج کے سربراہ سے لے کر ایک عام سپاہی تک ہر ایک کو یہ حلف اٹھانا پڑتا ہے کہ وہ آئین کی پاسداری کرے گا اور اپنے قول اور عمل سے ایسی کوئی بات نہیں کرے گا جو آئین کی تخریب کا باعث بنے۔(۲۲)

مشرقی پاکستان سے اسمبلی کے ممبر مولوی فرید احمد نے اپنی ڈائری میں جنرل ایوب کے فوجی انقلاب کے بارے میں لکھا ہے:

> ۱۹۵۸ء میں جمہوریت، اسلامی مساوات کے تصور، اخوت اور مسلم قوم پرستی کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا گیا اس کے بعد آنے والے پانچ میں سے پہلے چار سالوں کے دوران یہ سب نیکیاں بتدریج مگر مکمل طور پر زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے واصل بحق ہو گئیں ہمیں زبردستی تاریکی کے سمندر میں ڈبو دیا گیا ہم پر ظالمانہ، استبدادی شخصی حکومت مسلط کر دی گئی ہم جاہ طلب نوکر شاہی کے غدارانہ جبر و ظلم تلے زخمی شکار کی طرح تڑپتے رہے جس کی سرپرستی ایک مطلق العنان حاکم کر رہا تھا پھر بھی خود کو جمہوریت پسند قرار دیتے ہیں وہ خود کو جمہوریت اور عدل کے چیمپئن کے طور پر پیش کرتے ہیں۔(۲۳)

جنرل ایوب خان کے اقتدار کو سیاسی عدم استحکام نے موقع بھی دیا اور تقویت بھی پہنچائی مگر آمر کے گرد خوشامد پسند گروہ ہمیشہ اکٹھا ہو جاتا ہے جس سے ڈکٹیٹر اپنے آپ کو عقل کل سمجھنے لگتا ہے یہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وجہ ہے کہ ایوب خان رفتہ رفتہ صرف وہی تصویر دیکھنے اور وہی آواز سننے کے قائل ہو گئے جس کا عنوان "سب اچھا ہے" ہوتا۔ اسی رویے نے ایوب خان کی آمریت کو مستحکم بھی کیا اور کمزور بھی ان کا خیال تھا کہ وہ سب سے بڑھ کر محب الوطن بھی ہیں اور پاکستان کی خوشحالی اور ترقی کے ضامن بھی حتیٰ کہ اسلام جو اس ملک کی نظریاتی اساس ہے اس کا بھی ایک نیا ایڈیشن درکار ہے۔ قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں:

> کچھ عرصہ ان کے سر میں یہ سودا بھی سمایا رہا کہ قرآن مجید کی عقائد، عبادات، اخلاقیات، قوانین، تمثیلات، قصص وغیرہ کے عنوانات کے تحت بھی تدوین کر دینی چاہیے تاکہ ہر موضوع کے حوالہ جات تلاش کرنے میں آسانی ہو اس خیال میں کچھ ایسے عناصر کی ہمت افزائی کرتے رہتے تھے جو دین کو انضباطی پابندیوں سے آزاد کر کے اسے سہل انگاریوں اور تن آسانیوں کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں جس طرح امتحان پاس کرنے کے لیے کتابوں کے خلاصے اور پاکٹ گائیڈ مقبول ہوتے ہیں اسی طرح اسلام کا یہ نظر ثانی شدہ آسان رنگ بھی صدر ایوب کو بڑی آسانی سے متاثر کر دیتا تھا۔(۲۴)

ڈاکٹر فضل الرحمٰن اس سلسلے میں جن عناصر کی ایوب خان نے ہمت افزائی کی ان میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا نام بے حد نمایاں ہے جو ایوبی دور میں اسلامی تحقیقاتی انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر اور اسلامی مشاورتی بورڈ کے ممبر تھے۔ انہوں نے اسلام کے بارے میں ایک کتاب لکھی جس پر مولوی فرید احمد نے اپنی ڈائری میں درج ذیل تبصرہ کیا ہے۔

کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو دیکھا کہ کتاب میں اسلام کے بنیادی عقائد پر منظم حملے کئے گئے ہیں مثلاً:

i. حضرت جبریل علیہ السلام کے وجود کی نفی۔
ii. معراج دراصل افسانہ ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمین سے اٹھائے جانے کے عیسائی نظریہ کی نقل میں تراشا گیا۔
iii. قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں بلکہ حضرت محمد ﷺ کی اپنی زبان میں ہے۔
iv. قرآن میں پانچ نمازوں کا ذکر نہیں بلکہ روزانہ تین نمازوں کا ذکر ہے پانچ نمازیں تو بعد کی اختراع ہیں۔

v. زکوٰۃ کوئی مذہبی فریضہ (فرض) نہیں بلکہ محض ایک ٹیکس ہے۔
vi. روزِ قیامت حضرت محمد ﷺ کو اپنی امت کی شفاعت کا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔

مجھے پورا یقین ہو گیا کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن اسلام کے بین الاقوامی دشمنوں کے گینگ سے ساز باز کیے ہوئے ہے اور دین میں اس انداز سے ملاوٹ کر رہے ہیں کہ انگریزی کی تعلیم رکھنے والے مسلمانوں کے ذہنوں میں اسلامی عقائد ہی باقی نہ رہیں یہ مسلمان تو پہلے ہی کئی انواع کے شکوک و شبہات، ذہنی انتشار اور اسلام سے نفرت کا شکار ہیں مجھ پر پوری طرح واضح ہو گیا کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو اسلام کے انہی دشمنوں کی ایماء پر اسلام کی تعبیر و تشریح کرنے والے اس اعلیٰ منصب پر فائز کیا گیا ہے یہ بات ایوب خان کے لیے بھی موزوں ہے کہ وہ بزعم خود "اکبر اعظم" کا کردار ادا کر رہا ہے۔(۲۵)

مولوی فرید احمد مزید تجزیہ کرتے ہیں:

> مذہب سے لگاؤ رکھنے والے مسلمانوں نے سرکاری اہلکار اور سرکاری ترجمان کی طرف سے اسلام پر اس خطرناک حملے کا سختی سے نوٹس لیا ہے یہ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ اس معاملہ پر ایک زبردست تحریک چلائی جانی چاہیے کیونکہ اگر اس معاملہ کا سختی سے نوٹس نہ لیا گیا تو ایوب حکومت اپنا "دین الٰہی" قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔(۲۶)

آج بھی کسی ملک کے نظم و نسق اور سیاسی نظام میں فوجی مداخلت کے نقصانات کا ادراک نہ رکھنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ایوب دور کے ترقیاتی کاموں اور منصوبوں کو یاد کرتی ہے جنرل ایوب کی قد آدم تصاویر آویزاں کی جاتی ہیں جن کے نیچے لکھا جاتا ہے کہ "تری یاد آئی ترے جانے کے بعد" مگر ایوبی دورِ آمریت میں آزادیٔ رائے، حریت فکر و دانش حتیٰ کہ مذہبی و دینی افکار کی صحیح ترجمانی کے سوتے خشک ہو گئے۔ سیاسی جماعتوں کی بساط لپیٹ دی گئی، اصلاحات کی آڑ میں ایسے اصحابِ فکر و نظر کو آگے آنے کا موقع ملا جو اسلام کو بھی جنرل ایوب کی خوشنودی اور شخصی آمریت کے ساتھ تبدیل کرنے کے لیے تیار تھے جس کی بیّن مثال ایوبی دور کے عائلی قوانین ہیں۔ بدتر استبدادی نظام حکومت مسلط

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنے کے باوجود اسے جمہوریت کا نام دیا گیا پریس پر پابندی لگائی گئی۔ بظاہر تاثر ملتا ہے کہ ۱۹۵۸ء سے قبل کی سیاسی قیادت کی نااہلی، سیاسی عدم استحکام اور انتشار نے ایوب خان کو نقب لگانے کا موقع دیا مگر پس پردہ حقائق کچھ اور بھی ہیں۔ یہ طے ہے کہ ملک میں حقیقی فوجی اور جنرلز کی حکمرانی کی بنیاد فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے رکھی اور جنرل کو یہ راہ دکھائی کہ ملک پر کس طرح قابض ہو کر حکمرانی کی جاتی ہے۔ اس نے فوجی سربراہ کی حیثیت سے پہلے ہی یہ منصوبہ تیار کر رکھا تھا کہ آرمی چیف کا عہدہ ملتے ہی اقتدار پر تسلط جما لیا جائے اور اکتوبر ۱۹۵۸ء کو یہ موقع میسر آ ہی گیا اور ۱۹۶۲ء تک ملک براہِ راست فوجی طالع آزماؤں کی حکمرانی میں رہا۔ ۱۹۵۸ء میں ایوب خان نے چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ جنرل موسیٰ خان کو سونپ دیا اور اس کے ساتھ ہی ایوب خان نے انتہائی ہوشیاری اور طراری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت خوش اسلوبی سے اپنی ایک الگ مسلم لیگ بھی تخلیق کر ڈالی اور بنیادی جمہوریت کے فلسفے کا سہارا لے کر اپنی عسکری قوت سے اقتدار پر قبضہ کر کے سویلین روپ میں ڈھال دیا اور مسلم لیگ کے از خود صدر بن گئے اور ساتھ ہی ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا اور یوں ملک پر دس سال حکومت کی اور ہر وہ ہتھکنڈہ استعمال کیا جس کے ذریعے ان کے کسی عمل میں رکاوٹ نہ آئے اور ملک میں صدارتی نظام کے نفاذ اور صدر بننے کے لیے غیر جمہوری ہتھکنڈے استعمال کیے۔ (۲۷)

ایوبی دور میں سیاسی استحصال کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور سماجی اقدار کو جس طرح پامال کیا گیا اس سے قیادت کے ذہنی رجحانات اور فکری سمت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ سیاسی میدان میں ہر طرح کی آزادی سلب کر لی گئی تھی جبکہ معاشرتی پہلو سے ہر طرح کی آزادی (Liberty) اور تجدد کو حکومتی سرپرستی حاصل تھی حتیٰ کہ اخلاق اور مذہب کی دیواریں گرانا دورِ ایوبی کا بنیادی ہدف قرار پایا تھا۔ موسیقی کی ایک مجلس میں صدر مملکت ایوب خان کی شرکت اور سرپرستی کی خبر روزنامہ امروز نے درج ذیل الفاظ میں شائع کی۔

میوزک کانفرنس کے سات اجلاس باغِ جناح کے اوپن ایئر تھیٹر میں ہوئے جو ہفتہ سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا کانفرنس کے پروگرام میں ہلکی پھلکی اور کلاسیکی دونوں نوعیت کی موسیقی شامل تھی اور ان پروگراموں میں پاکستان، ہندوستان اور ایران کے کہنہ مشق اساتذہ کے علاوہ نوعمر جواہر قابل نے بھی حصہ لیا پیر کی شب کو ہلکی

پھلکی موسیقی کا پروگرام تھا۔ بدھ کی رات کو صدر مملکت محمد ایوب خان نے بھی غیر متوقع طور پر محفلِ موسیقی کو رونق بخشی یہ کانفرنس کی آخری نشست تھی اور اس لحاظ سے بہت اہم تھی کہ اس میں چیدہ چیدہ فنکاروں کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا صدر نے بڑے انہماک سے روشن آراء بیگم اور ستار نواز شریف پونچھ والے کے نغمات سنے ملک کے معروف ترین راہنما کی آمد جس طرح غیر متوقع تھی اسی طرح وہ توقع سے زیادہ دیر محفل میں بیٹھے اور اس سے فنکاروں کے حوصلے بڑھے۔ (۲۸)

ماہنامہ ترجمان القرآن نے صدر مملکت کے مذکورہ لبرل ازم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس موقع پر جن فنکاروں نے اپنے فن کے کمالات دکھائے ان کی باقاعدہ پذیرائی کی گئی اور مملکت کے سب سے بڑے سربراہ نے جو اسے ایک اسلامی مملکت بنانے کا عزم رکھتے ہیں ان فنکاروں کی خدمات جلیلہ کا پوری طرح اعتراف کرتے ہوئے یومِ پاکستان کے موقع پر انہیں مختلف انعامات سے نوازا۔ (۲۹)

ایوب خان کے شب و روز کے گواہ اور معتمد خاص قدرت اللہ شہاب ایک رات کی تقریب کا تذکرہ کرتے ہیں:

۲۹ جنوری ۱۹۶۸ء کے روز اردن کے شاہ حسین کراچی آئے ہوئے تھے اسی شام راولپنڈی کے انٹر کونٹی نینٹل ہوٹل میں ان کا عشائیہ تھا صدر ایوب جب ہوٹل پہنچے تو ان کا رکھ رکھاؤ اور چہرہ مہرہ ان کے معمول کے حساب سے نارمل نظر نہ آتا تھا دعوت کے ہال میں داخل ہونے سے پہلے وہ سیدھے بار (شراب خانہ) گئے اور ایک گلاس میں بہت سے وھسکی ڈلوا کر پانی یا سوڈا ملائے بغیر اسے ایک ہی سانس میں غٹ غٹ چڑھا گئے اس کے بعد انہوں نے یہی عمل کئی بار دہرایا شراب وہ پیتے ضرور تھے لیکن اس طرح کھڑے کھڑے ندیدوں کی طرح نیٹ وھسکی کے گلاس پر گلاس چڑھانا ان کا دستور نہ تھا ہوٹل کی بار میں اس طرح کئی گلاس پینے کے بعد ان کی آواز کسی قدر خمار آلود ہو گئی کھانے کے بعد جب وہ پہلے سے تیار کردہ لکھی ہوئی تقریر پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کا عارضۂ قلب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

> ان کے رگ وپے میں کسی نہ کسی صورت میں رینگنا شروع ہو چکا تھا ان کی طبیعت ہر گز ٹھکانے پر نہ تھی یہاں تک کہ تقریر پڑھتے پڑھتے وہ بیک بار اس کے دو ورق الٹ گئے اور انہیں اپنی بے ربطی اور غلطی کا احساس تک نہ ہوا۔(۳۰)

ایوب خان اور حکمرانوں کا یہ کلچر اور رویہ عوام الناس کی نظروں میں نہیں تھا اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی آواز اٹھتی تھی بلکہ عوام کے لیے اسلام، جمہوریت، ترقی اور خوشحالی کے خوش کن نعرے تھے اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جنرل ایوب کے خاص حواریوں نے موصوف کو بین الاقوامی سطح کا لیڈر بنانے کے لیے منظم کوشش کی چنانچہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کو صلاح الدین ایوبی کا نام دیا گیا انہیں پاکستان کا اتاترک بھی کہا گیا اور فرانس کے صدر ڈیگال کا ہم پلہ بھی سمجھا گیا پاکستان کی خوشحالی اور اقتصادی ترقی کے لیے ایوب خان نے جو کچھ کیا اس کی وجہ سے شاید وہ ان القابات یا خطابات کے مستحق بھی تھے لیکن قوم سے اعترافات چونکہ انہوں نے اپنی ڈکٹیٹر شپ کے دور میں کروائے تھے اس لئے ایوب خان کا انجام بھی المناک ہوا جس طرح سے دوسرے ڈکٹیٹروں کا ہوتا ہے۔(۳۱)

ایک آمر کی نفسیات کے عین مطابق جنرل ایوب خان کو بھی محض القابات اچھے لگتے تھے اور خوشامد بھاتی تھی۔ لہٰذا عوام کی سطح پر جو لاوا پک رہا تھا اس کے ادراک اور فہم کا کوئی امکان نہ تھا اسی لیے جنرل ایوب کا دور بڑے عبرت ناک انجام کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ قومی سیاست میں عسکری قوت کے بل پر مداخلت اور قبضے کی جس روایت کا آغاز جنرل ایوب نے کیا تھا وہی تاریخ ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔

> بیماری سے جانبر ہو کر جب صدر ایوب دوبارہ کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے تو ان پر یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو چکی تھی کہ ان کے اقتدار کا سرچشمہ ان کا اپنا بنایا ہوا آئین یا بنیادی جمہوریت کا نظام یا قومی اسمبلی یا مرکزی کابینہ نہیں بلکہ ان کے صدارتی وجود اور عہدے کی شہ رگ کلیتاً کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ کی مٹھی میں ہے جس آئین کے تحت انہوں نے صدارت کا حلف اٹھایا تھا اس میں صاف طور پر درج تھا کہ بیماری کی صورت میں اگر مملکت کا سربراہ اپنے فرائض ادا کرنے سے معذور ہو جائے تو قومی اسمبلی کا سپیکر ان کی قائم مقامی کرے گا صدر ایوب دو ڈیڑھ ماہ تک صاحب فراش رہے لیکن اس تمام عرصہ میں قومی اسمبلی کے سپیکر

> عبدالجبار خان سے کسی نے یہ تک نہ پوچھا کہ میاں تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں بیماری کے ابتدائی چند ایام میں جب صدر ایوب زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہے تھے اس وقت جنرل یحییٰ ان کے تن بدن پر بنفس نفیس منڈلاتے رہے کہ جونہی یہ ٹھنڈا ہو تو وہ فوراً گدھ کی طرح اس پر جھپٹیں۔(۳۲)

جنرل یحییٰ تو ایوب خان کی اپنی ہی قائم کردہ روایت کا تسلسل تھے اور مکافات عمل کا تقاضا بھی شاید یہی تھا مگر ایوب خان کے ایک اور محسن ذوالفقار علی بھٹو تھے جن کو بھٹو خاندان کی جاگیر اور شکارگاہ سے نکال کر ایوب نے ہی اپنی کابینہ میں شامل کیا اور سیاسی زندگی عطا کی لیکن اچھی طرح سیاسی شہرت اور مقام حاصل کرنے کے بعد بھٹو نے اپنی اصل سیاسی مہم جوئی کا آغاز ایوبی دور میں ہی کیا۔ سیارہ ڈائجسٹ نے ایوب خان کے خلاف عوامی جدوجہد کے آغاز کا تذکرہ درج ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

> ان کے خلاف عوامی تحریک کا فوری سبب ایک معمولی سا واقعہ بنا گارڈن کالج راولپنڈی کے کچھ طلبہ لنڈی کوتل گئے بس میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی لیکن کسٹم کے عملہ نے کہا کہ ان کے کچھ افراد کو ساتھ لے جائیں طلباء نے انکار کر دیا جس پر کسٹم والوں نے چیک پوسٹ پر اپنے رفقاء کو مطلع کیا جنہوں نے بس کو روک کر طلباء سے لنڈی کوتل کی تمام خریداری بمع بس ضبط کر لی طلباء نے راولپنڈی پہنچ کر متعلقہ حکام سے رابطہ کیا حکام نے ان کی مدد کرنے کی بجائے الٹا ان سے باز پرس شروع کر دی اس دن اتفاقاً پیپلز پارٹی کے چیئرمین بھٹو آئے ہوئے تھے اور ان کے استقبال کے لیے راولپنڈی پولی ٹیکنیک کالج کے طلبہ اپنے کالج کے باہر جمع ہو گئے تھے پولیس نے ان پر گولی چلا دی جس سے ایک طالبعلم جاں بحق ہو گیا ادھر گارڈن کالج کے طلباء نے ہوٹل انٹر نیشنل میں بھٹو سے ملاقات کی اور اپنے مسئلے کے بارے میں انہیں بتایا پولیس نے وہاں بھی لاٹھی چارج کر دی ان دو واقعات نے طلباء کو مشتعل کر دیا طلباء زخمی شیر کی طرح بپھر گئے راولپنڈی میں طلباء کے مظاہروں کی ابتداء ہو گئی دوسرے دن لاہور اور دیگر مقامات کے طلباء نے بھی احتجاجی مظاہرے کرنے شروع کر دیے حکومت نے طلبہ کے مظاہرے بند کرانے کے لیے مسٹر بھٹو سے مدد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی خواہش کی تو مسٹر بھٹو نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ طلباء کو کسی کی حمایت کرنے کی ہرگز تلقین نہیں کر سکتے۔(۳۳)

ایوب خان کے خلاف تحریک کا آغاز مذکورہ واقعات سے ہوتا ہے مگر اس تناظر میں درج ذیل پہلو غور طلب ہیں۔

- آمریت ہر منظم قوت کو توڑ کر ہی استحکام حاصل کرتی ہے تاکہ اظہار اور مزاحمت کی کوئی شکل باقی نہ رہ سکے چنانچہ جنرل ایوب خود ساختہ جمہوریت کے باوجود مذہبی طبقات، سیاسی جماعتوں، پریس اور ادب پر ہر طرح وار کر چکے تھے مگر طلباء جو کسی بھی قوم اور تحریک کا ہراول دستہ ہوتے ہیں بظاہر ایک اتفاقی واقعے سے ایوب خان کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتے ہیں تو ان کے اس ردعمل کو بے حد عوامی پذیرائی ملتی ہے کیونکہ آزادئ رائے اور بنیادی حقوق پر استبداد و ستم کے باوجود اضطراب تو موجود تھا۔
- شخصی حکومت میں نوکر شاہی اور عملہ من مانے رویے اختیار کرتا ہے جیسا کہ مذکورہ واقعے میں حکام نے بے لگام ہو کر مظلوم طلبہ کی دادرسی کی بجائے ظلم اور استحصال کی راہ اختیار کی چنانچہ بقول شاعر

جس دور میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس دور کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

- بھٹو کو اگرچہ جنرل ایوب نے ہی سیاست کی راہ پر گامزن کیا مگر انہوں نے طلبہ کے اس معاملہ کو اپنی سیاست کے لیے بروقت اور موثر طریقے سے استعمال کیا۔

ایوب خان کے خلاف عوامی تحریک کی ابتداء اگرچہ مذکورہ واقعات سے ہوئی ہے تو انتہا کی گواہی ایس ایم ظفر دیتے ہیں۔

> ایک مرتبہ فیلڈ مارشل ایوب نے نہایت بے چارگی سے مجھے بتایا کہ انہوں نے خود اپنے کانوں سے اپنے نواسوں کو ملازم کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کے میدان میں دوڑتے بھاگتے بڑی معصومیت سے ایوب ہائے ہائے کے نعرے لگاتے سنا ہے

> انہوں نے کہا کہ جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے تو بھلا اب حکومت میں کس طرح دلچسپی لے سکتے ہیں۔(۳۴)

جنرل یحییٰ خان

چنانچہ ایوب خان نے بے بسی کے عالم میں ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو تمام اختیارات بری فوج کے کمانڈر جنرل یحییٰ خان کو منتقل کر دیے جنہوں نے پاکستان میں مارشل لاء نافذ کر کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھال لیا۔ حسبِ سابق جنرل یحییٰ نے بھی اپنی پہلی نشری تقریر میں قوم کو یقین دلایا کہ ان کے پیشِ نظر کوئی ذاتی مفاد یا کوئی سیاسی عزائم نہیں وہ صرف قومی نمائندوں کو آئین بنانے کے لیے مدد دینا چاہتے ہیں کہ آئینی حکومت قائم ہو مسٹر بھٹو نے اس مارشل لاء کا خیر مقدم کیا۔(۳۵)

فوجی حکومت کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اور آمریت کے تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے بھی جنرل یحییٰ کا اصرار تھا کہ وہ آئینی حکومت قائم کرنے کے خواہش مند ہیں اور تعجب خیز امر یہ ہے کہ ایک اور مارشل لاء آئین کو معطل کر کے آئینی حکومت کی نوید سنا رہا تھا چنانچہ یحییٰ حکومت طویل عرصے تک تو نہ چلی مگر اس کے پس منظر اور پیش منظر کے اثرات آج بھی تاریخ پاکستان میں حیرت، افسوس اور پریشانی کے بنیادی اسباب ہیں۔ ایوب خان کا دور اگرچہ آمرانہ طرزِ حکومت کا نمائندہ اور بنیادی حقوق کا قاتل تھا مگر ایک عسکری راہنما کے طور پر جنرل ایوب پاکستانی عوام میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ان کی شخصی زندگی میں اسلام اور اسلامی اقدار کا پرتو بھی تھا اس لیے ایک قومی ادارے کے طور پر ایوب کے دور میں فوج اور فوجی قیادت کا تشخص (Image) کافی بہتر تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں فوجی قیادت کے قد کاٹھ میں مزید اضافہ ہوا تھا لیکن جنرل یحییٰ کا دور فوج اور فوجی قیادت کے تشخص کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوا اور تاریخ پاکستان کے سب سے زیادہ سیاہ ابواب بھی اسی دور میں رقم ہوئے ہمارے ہاں ابھی تک سقوطِ مشرقی پاکستان کے اسباب کا قومی سطح پر تعین نہیں کیا گیا مگر بنیادی طور پر ذلت اور رسوائی کا زیادہ سامان یحییٰ قیادت نے ہی کیا جہاں تک اندازِ حکمرانی کا تعلق ہے تو یہ من مانی اور موج میلے کا بدترین دور ثابت ہوا۔ آمریت میں آمر اصطلاحات تو بڑی خوش کن استعمال کرتا ہے مگر اصل میں حریتِ فکر، دانش اور آزادی پر پہرے بٹھا کر بدترین استحصال کو رواج دیا جاتا ہے۔ قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

> حکومت ایوب خان کے دور کی ہو یا یحییٰ خان کے یا کسی اور کی ہر زمانے کے حکمران اسی قانون کی بیساکھیوں کا سہارا لے کر پاکستان کے اربابِ عقل و دانش کو برباد اور روشن خیالی اور فہم و فراست کے میناروں کو تاخت و تاراج کرتے رہے ہیں ذہنوں پر روک تھام، بندش اور پابندی عائد کرنے والا ہر اقتدار کے دور میں قانون لازمی طور پر قوت تخلیق کو بنجر، بانجھ اور بے ثمر کر دیتا ہے۔ دھونس اور دھاندلی کا نشہ بھی شراب کی مانند ہوتا ہے دونوں میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ چھٹتی نہیں ہے ظالم منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔(۳۶)

بد قسمتی سے ہمارے ہاں قیادت و حکومت میں تسلسل کے ساتھ لبرل رویے ہی سامنے آتے رہے ہیں مگر المیہ یہ ہے کہ جس معاملے میں حکمرانوں کو لبرل ہونا چاہیے اس میں آمرانہ طرزِ عمل اختیار کیا جاتا ہے جبکہ سماجی و معاشرتی سطح پر جن اخلاقی و مذہبی روایات کا پاس حکمرانوں کو عوام سے بھی بڑھ کر کرنا چاہیے اس میں سب سے زیادہ لبرل رویے حکمران ہی اختیار کرتے رہے ہیں اور جنرل یحییٰ تو اس کلچر کی بدترمثال ثابت ہوا پاکستان اپنی تاریخ کے سب سے نازک دور سے گزر رہا تھا اور جنرل یحییٰ کس موج میلے کی زندگی میں تھے الطاف گوہر لکھتے ہیں:

> ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو کراچی میں میری مرحوم غوث بخش بزنجو سے ملاقات ہوئی وہ اس سے ایک دن پہلے ڈھاکہ سے واپس آئے تھے میں نے بڑی تشویش کے عالم میں ان سے پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے کہنے لگے "کل صبح میری جنرل یحییٰ خان سے ملاقات ہوئی تھی شراب کا گلاس ان کے ہاتھ میں تھا وہ میرا نام بھول گئے تھے اور بار بار مجھے "بینجو" کہہ رہے تھے انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"(۳۷)

سابق آئی جی پنجاب اور ذوالفقار علی بھٹو کے قریبی ساتھی راؤ رشید اپنی کتاب "جو میں نے دیکھا" میں بیان کرتے ہیں:

> بہر حال جو لوگ بھی تھے سب کو معلوم ہے راز کی کوئی ایسی بات نہیں ہے وہ لوگ پہنچے اس کے بعد جنرل یحییٰ خان آئے جنرل حمید بھی ان کے ساتھ آئے اور

> بھی جو ان کا مخصوص ٹولہ تھا انعام الرحمٰن علوی سب چیزوں کے انچارج تھے نہ گرمیاں تھیں نہ سردیاں تھیں سوئمنگ پول کے سامنے رات کے ایک، دو، تین بجے تک شراب وغیرہ چلتی رہی بڑا ہاؤ ہو ہوتا رہا سرخ لائٹیں لگی ہوئی تھیں وہاں پشاور کا ایک جرمن جوڑا تھا وہ آدمی لکڑی کی صنعت کاری کا ایکسپرٹ تھا اسے انہوں نے پاکستان لگایا ہوا تھا اس کی بیوی بڑی خوبصورت تھی اس کے متعلق مشہور یہ تھا کہ وہ سی آئی اے کی جاسوس ہے اور اس کا یہی کام ہوتا تھا کہ ہر اس محفل میں خاص طور پر فوجیوں کی پارٹی میں وہ کسی نہ کسی طرح ضرور پہنچ جاتی تھی چونکہ خوبصورت عورت تھی وہ ہر جگہ ویلکم ہوتی تھی وہ ایک طرح کا پاسپورٹ تھا چنانچہ وہ محترمہ بھی جنرل یحییٰ صاحب کی پارٹی میں نہ صرف موجود تھیں بلکہ یحیٰی خان کی باقی جو دوست احباب تھیں ان سب میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ ویسے بھی ویسٹرن تھی ڈکنی (Dikknni) پہن کر ان کے ساتھ نہا رہی تھی بہر حال ہوتا یہ رہا کہ کھیل یہ تھا کہ اس محترمہ کو جرنیل اٹھا اٹھا کر سوئمنگ پول کے اندر پھینکتے تھے وہ پھر باہر نکلتی تھی تہقہے لگتے تھے۔(۳۸)

ایک طرف شہداء کی امانت ارضِ پاک کا ایک بازو مشرقی پاکستان علیحدگی کے عبرت ناک انجام کو پہنچ رہا تھا تو دوسری طرف حکمران قانون، تہذیب اور اخلاق سے ہر طرح کی آزادی کا جشن منا رہے تھے ستم تو یہ ہے کہ مغرب سے آنے والا لبرل ازم کا تصور پھر بھی حریت فکر، اختلاف رائے، بنیادی حقوق اور عدل و مساوات کو کچھ تناسب تو فراہم کرتا ہے مگر ہمارے ہاں لبرل ازم سے وابستہ کسی بھی درجے کی مثبت قدر اور علامت تو مفقود تھی بلکہ آمریت کے بدتر حربوں کو اختیار کرنے کے باوجود ہماری قیادت کو جمہوریت پسند ہونے کا دعویٰ تھا البتہ اپنی ذاتی اور سماجی زندگی میں لبرل ازم کا نام عریانی و فحاشی اور اخلاقی پستی تھا ان حالات میں تعمیر و تشکیل پاکستان کا کیا امکان ہو سکتا تھا یہ تو تخریب کے عنوان تھے جو سقوطِ مشرقی پاکستان کی صورت میں سچ ثابت ہوئے مخدوم زادہ سید حسن محمود اس دور پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شراب اور شباب

جنرل یحییٰ دائم الخمر بھی تھے اور کئی دوسری معاشرتی برائیوں کے بھی عادی تھے ان خرابیوں نے فہم و فراست کی تمام صلاحیتوں سے بھی عاری کر دیا تھا چنانچہ جب تک رہے ان کی حیثیت دستخط کرنے والی ایک مشین کی سی رہی۔(۳۹)

شباب اور شراب و کباب کے نشے میں دھت جنرل یحییٰ کی حیثیت محض اگر ایک مشین کی سی تھی تو پس پردہ کون تھا جو اپنے مفادات کا کھیل، کھیل رہا تھا سید حسن محمود کی رائے میں سقوطِ ڈھاکہ کی ذمہ داری جہاں فوجی حکومت پر عائد ہوتی ہے اور جنرل یحییٰ اس کے ذمہ دار قرار پاتے ہیں وہاں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے بھی اپنے سیاسی عزائم کے تحت اس کے لیے راستہ صاف کیا سب کو معلوم ہے کہ جنرل یحییٰ نے کھلے عام مجیب الرحمٰن کے بارے میں کہا تھا کہ میں مستقبل کے پرائم منسٹر سے بات کر رہا ہوں لیکن اس کے بعد لاڑکانہ گئے تو ان کا پروگرام تبدیل ہو گیا۔(۴۰)

تسہیل

فصل سوم

بھٹوازم

ذوالفقار علی بھٹو کو پاکستانی سیاست میں ایک افسانوی کردار کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے جنہوں نے بلاشبہ پاکستان میں سیاسی اور عوامی کلچر میں نئے رجحانات متعارف کروائے جمہوریت کے ذریعے برسر اقتدار آنے والے وزیر اعظم کی حیثیت سے تاریخ پاکستان میں اب تک پہلی اور آخری دفعہ پانچ سال بھی مکمل کیے لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ بھٹو بھی پاکستان کی سیاسی فضا میں فوج کا کاشت کردہ پودا تھے بھٹو صاحب کی سیاسی زندگی کا آغاز ہی جنرل ایوب کے فوجی دورِ آمریت میں ہوا اور اسی دور میں ذہین اور زیرک ذوالفقار علی بھٹو نے یہ سمجھ لیا کہ تیسری دنیا کے کئی دیگر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی فوج کو نظر انداز کر کے سیاست میں قدم جمانے کا کوئی امکان نہیں لہٰذا بھٹو صاحب نے اپنی جاگیر، مشغلوں اور صلاحیتوں کو منظم طریقے سے بروئے کار لاتے ہوئے فوج میں اپنے رابطے مؤثر کیے قدرت اللہ شہاب ان رابطوں کا تذکرہ کرتے ہیں:

بھٹو اور فوج کا باہمی تعلق

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو عرصہ سے موقع کی تاک میں بیٹھے تھے لوہا گرم دیکھ کر انہوں نے ہتھوڑے کی ضرب لگائی اور صدر ایوب کے خلاف اپنی مہم کا آغاز کر دیا ماحول کی سازگاری کے علاوہ انہیں جی ایچ کیو کے چند عناصر کی پشت پناہی بھی حاصل تھی ان میں جنرل یحییٰ کے دست راست میجر جنرل پیر زادہ کا نام سرفہرست تھا یہ صاحب ایک زمانے میں صدر ایوب کے ملٹری سیکرٹری رہ چکے تھے وہاں پر انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تو صدر ایوب نے انہیں واپس جی ایچ کیو بھیج دیا اس پر پیر زادہ صاحب صدر سے ناراض ہو گئے اور ان کے خلاف اپنے دل میں شتر کینہ پال کر ان سے بدلہ لینے کی ٹھان لی مسٹر بھٹو کے ساتھ ان کی پہلے سے کچھ رسم و راہ تھی اب پیر زادہ نے اپنے ہتھکنڈوں سے ان پر یہ بات واضح کر دی کہ اگر انہوں نے صدر ایوب کے خلاف کوئی تحریک شروع کی تو وہ اس مہم میں تنہا نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوں گے بلکہ پاکستانی فوج کا ایک بڑا عنصر بھی ان کی پشت پر ہو گا اس ملی بھگت سے پیر زادہ کا مقصد بھٹو کو برسر اقتدار لانا نہیں تھا بلکہ ایوب خان کے زوال کی خاطر انہیں ایک کٹھ پتلی کی طرح استعمال کر کے جنرل یحییٰ کی راہ ہموار کرنا تھا۔(۴۱)

سابق وزیر قانون ایس ایم ظفر کا بیان ہے:

سقوطِ ڈھاکہ (۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء) کے بعد ۳۰ دسمبر ۱۹۷۱ء میں جنرل محمد یحییٰ خان نے اقتدار سے (بحیثیت چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر مملکت کے) دستبرداری کا اعلان کر دیا اور اس کے بعد جنرل محمد یحییٰ خان کے جانشین ذوالفقار علی بھٹو نے عنان اقتدار سنبھال لی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں سردست یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ انہوں نے کس وقت یہ فیصلہ کیا تھا کہ اب انہیں اقتدار پر قبضہ کر لینا چاہیے لیکن دکھائی یوں دیتا ہے کہ اس کی تیاری بھٹو نے وقت سے پہلے ہی شروع کر رکھی تھی۔ ملک غلام جیلانی اس بات کے شاہد ہیں کہ بھٹو نے یہ اسکیم بنائی تھی کہ ایوب خان کو ان کی فوج کے ذریعے حکومت سے ہٹا دیا جائے پھر جب وہ ہٹ جائیں گے تو فوج کے نئے حاکموں سے جو ایوب خان کی طرح سیاست اور حالاتِ حاضرہ سے پوری طرح آگاہ نہ ہوں گے حکومت چھین لینا کوئی مشکل کام نہ ہو گا۔(۴۲)

فوج میں اپنی مضبوط لابی اور بالخصوص یحییٰ خان کے ساتھ گٹھ جوڑ کے ذریعے ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار کی منزل کیسے حاصل کی مخدوم زادہ سید حسن محمود انکشاف کرتے ہیں کہ پیپلز پارٹی منظم کرنے کے لیے انہوں نے بعض ذرائع سے رقوم حاصل کیں مثلاً علوی برادران آف سٹینڈرڈ بینک لمیٹیڈ پاکستان نے کافی روپیہ ان کو دیا یحییٰ خان اس میں بھٹو کے شریک تھے اور وہ رقوم کی فراہمی کے سلسلے میں امداد بھی دے رہے تھے چنانچہ اس مہم میں تقریباً انہیں دو کروڑ روپے سے زائد رقم وصول ہوئی جس کو انہوں نے پیپلز پارٹی کے لیے استعمال کیا۔(۴۳)

سقوط ڈھاکہ کی ذمہ داری جہاں فوجی حکومت پر عائد ہوتی ہے اور جنرل یحییٰ اس کے ذمہ دار قرار پاتے ہیں وہاں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے بھی اپنے سیاسی عزائم کے تحت اس کے لیے راستہ صاف کیا

سب کو معلوم ہے کہ جنرل یحییٰ نے کھلے عام مجیب الرحمٰن کے بارے میں کہا تھا کہ میں مستقبل کے پرائم منسٹر سے بات کر رہا ہوں لیکن اس کے بعد وہ لاڑکانہ گئے تو ان کا پروگرام تبدیل ہو گیا اس دوران غالباً بھٹو یحییٰ کو اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہو چکے تھے چنانچہ جب مجیب نے ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا تو بھٹو نے غیض و غضب کے عالم میں کہا کہ اگر مغربی پاکستان کا کوئی ممبر ڈھاکہ گیا تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔(۴۴)

ستر کی دھائی کی تاریخ جمہوریت کے ذریعے منتخب ہونے والے ذوالفقار علی بھٹو کی آمرانہ سوچ کی ترجمان ہے کہ جو ہر صورت میں اقتدار حاصل کرنے کے جنون میں مبتلا تھے آخر مجیب الرحمٰن بھی تو مشرقی پاکستان میں اسی طرز انتخاب سے جیتے تھے اور مستقبل کی صورت گری میں بھٹو سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے مگر بھٹو حریت، جمہوریت اور آزادی رائے کا گلا گھونٹنے کے لیے ہر قدم اٹھانے کو تیار تھے بلکہ اس سارے قضیئے کا سیاہ ترین پہلو یہ بھی ہے کہ ہر صورت میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے بھٹو کو آدھا پاکستان بلکہ اس سے بھی کم منظور تھا۔ ایس ایم ظفر روایت کرتے ہیں:

انہی دنوں میری ملاقات ملک امیر محمد خان گورنر پنجاب سے ہوئی انہوں نے بطور انکشاف مجھے بتایا کہ ذوالفقار علی بھٹو وزیر خارجہ کی خواہش یہ تھی کہ لاہور پر ہندوستان کا قبضہ ہو جائے اس واقعہ کی تہہ میں بھید یہ تھا کہ لاہور پر بھارت کا قبضہ ہو جانے سے ایوب خان کو مسند اقتدار سے ہٹنا پڑے گا اور ذوالفقار علی بھٹو کے لیے اقتدار کی آخری منزل پر پہنچنا بہت آسان ہو جائے گا یہ بات صرف تھیوری یا اندازے کی تھی لیکن بعد میں جب اس کی کڑیاں سلسلے وار ملتی چلی جاتی ہیں تو اس کے صداقت پر مبنی ہونے کی قطعی تائید ہو جاتی ہے بلا خوف و تردد یہ بات ڈنکے کی چوٹ پر کہی جا سکتی ہے کہ مذکورہ بالا حالات و واقعات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو نے حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے اپنی تیاری بہت پہلے سے شروع کر رکھی تھی۔(۴۵)

اسی طرح افواہوں کی راگنی سے یہ سُر بھی بلند ہوئے کہ ایوب خان کے زخموں پر نمک پاشی کے لیے ہمارے نظام میں گھسے ہوئے امریکن اہلکاروں نے بھٹو اور یحییٰ کے کانوں میں حصولِ اقتدار کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے ان کی حمایت کے لیے سرگوشیاں شروع کر دی تھیں جس کے نتیجہ میں بھٹو اور مجیب کی اجتماعی تحریک جب شدت اختیار کر گئی تو حالات پر قابو پانے کے لیے یحییٰ نے ہر حیلے بہانے سے فوج کو میدان میں آنے سے روکے رکھا۔(۴۶)

بھٹو کو جی۔ایچ۔کیو کے علاوہ اکثر فوجی جرنیلوں کی حمایت بھی حاصل تھی ایوب خان کے خلاف عملی سیاست میں وہ میکاولین پالیسی کا مظاہرہ کر چکا تھا اس نے فوج کو استعمال کر کے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی چال چلی۔(۴۷)

ان شواہد سے یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ بعض جرنیل اور بھٹو اپنے اپنے مفادات کا کھیل، کھیل رہے تھے نیز یہ کہ ہماری سیاست میں فوج کا اقتدار پر بار بار اثر انداز ہونا وہ بنیادی خرابی ہے جس نے پاکستان کو ایک صاف، شفاف سیاسی نظام اور سیاسی عمل سے نہ صرف محروم رکھا ہے بلکہ اسی وجہ سے عوام عملی طور پر سیاسی عمل میں شرکت سے ہی محروم رہے ہیں اس سارے معاملے میں یہ تعین کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ فوج سیاست میں خود مداخلت کرتی ہے یا بھٹو جیسے سیاستدان اپنے مقاصد کے لیے فوج کا اثر و رسوخ اور قوت استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں البتہ تاریخ پاکستان میں آئینی خلاف ورزیوں کی یہ داستان وہ سنگین مذاق ہے جس نے آزاد ہونے کے باوجود پاکستانی عوام کو آزادی کی لذت سے محروم رکھا ہے مثلاً مسلح افواج کے لیے آئین کی شق ۲۴۳ دفعہ ۳ کے مطابق جو حلف نامہ تیار کیا گیا ہے وہ درج ذیل ہے۔

"میں سچے دل سے قسم کھاتا ہوں اور مکمل ایمان لاتا ہوں کہ میں پاکستان اور اس کے آئین کی مکمل اطاعت کروں گا جو عوام کے لیے قوانین کا بہترین نمونہ ہے اور میں خود کو کسی بھی قسم کی سیاسی تحریک اور سیاست میں وابستہ نہیں کروں گا اور میں وطن کے لیے پاکستانی افواج میں اپنی خدمات ایمانداری سے سرانجام دوں گا جس کی آئین اور قانون کے مطابق ضرورت ہو گی۔"

یہ حلف نامہ تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ گزشتہ ۶۴ سالوں سے ہر آئین کا حصہ رہا ہے لیکن اس عرصے میں جنرلز نے پاکستان کی سیاست اور جمہوری اقتدار کی بحالی کے عمل میں بار بار رکاوٹ سے ثابت کیا ہے کہ اس حلف نامہ کے حقیقی معنوں اور روح کی اہمیت وہ نہیں رہی جو اس کے باطن سے ظاہر ہوتی ہے ورنہ اس حلف کے بعد فوج کے پاس کوئی جواز نہیں رہ جاتا کہ وہ خود سیاسی عمل میں

شریک ہو بہت سارے تجزیہ نگاروں کے نزدیک ملک میں لگنے والے تین مارشل لاؤں کے پیچھے بہت سارے اہم واقعات ہیں جو موجود جنرل کو مارشل لاء لگانے پر اکساتے رہے جبکہ کچھ کے نزدیک یہ محض افسانے ہیں ورنہ تاریخ شاہد ہے کہ کوئی بھی حکومت فوج کی مرضی اور منشا کے بغیر نہ چل سکی اور فوج نے کسی بھی حکومت کو مکمل سیاسی عمل رائج کرنے کا موقع نہ دیا اور ہر حکومت کے پس پشت اپنی حکمت عملی لاگو کرتی رہی۔(۴۸)

بھٹو کا اقتدار کسی جمہوری عمل سے زیادہ فوجی آمریت کا عکس تھا اور بھٹو دورِ حکومت بھی ملک کے ہر طبقے کے لیے بدتر آمریت ہی ثابت ہوا۔ بھٹو صاحب کے آمرانہ طرز حکومت سے ملک میں طبقاتی کشمکش کو فروغ حاصل ہوا اور کیا جاتا ہے کہ بھٹو نے نچلے اور پسے ہوئے طبقے کو زبان دی مگر بدقسمتی سے اس افسانے کی حقیقت کو پاکستان میں پسے ہوئے محروم اور مظلوم عوام کی اکثریت جاننے سے قاصر رہی مخدوم زادہ حسن محمود اس حکمت عملی کا تجزیہ کرتے ہیں:

> بڑے بڑے رئیسوں اور وزیروں کی جس انداز میں وہ بے عزتی کر دیتے تھے اس سے مزدور پیشہ لوگ ان سے خوش تھے اور وہ انہیں اپنا ہمدرد سمجھنے لگے تھے اگرچہ ان پانچ سالوں میں ملا تو انہیں کچھ بھی نہیں لیکن محنت و مشقت اور اطاعت شعاری کی جو جبلّی خوبیاں ان میں موجود تھیں وہ بھی ان سے چھن گئیں اور اس کی جگہ کام چوری اور زبان درازی نے لے لی کاشتکار زمیندار کو اپنا حریف سمجھنے لگا اور اجیر آجر سے بغیر کچھ کیے من مانی اجرت مانگنے لگا۔ اس صورتحال سے معاشرتی قدریں تباہ ہو گئیں اور چھوٹے بڑے کا احترام و لحاظ باقی نہیں رہا طلبہ استاد کے سر پر ناچنے لگے اور پڑھائی کی بجائے قوت امتحان میں کامیابی کا ذریعہ بن گئی امتحانی مراکز میں طلبہ پستول اور خنجر میزوں پر رکھ کر امتحانی پرچے حل کرنے کے لیے غیر قانونی ذرائع استعمال کرتے تھے اور کسی میں مجال نہ تھی کہ ان حرکتوں سے انہیں باز رکھ سکے۔(۴۹)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان میں سیاسی و جمہوری شعور کے فقدان کے باعث ذوالفقار علی بھٹو کو جمہوریت کی آڑ میں جمہوریت ہی کے قتل کے باوجود جمہوریت کا چیمپئین بنایا جاتا ہے مگر "جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین کا" کے مصداق بھٹو اور یحییٰ کی مجلاتی سازشوں کے رازداں الطاف گوہر لکھتے ہیں:

بھٹو کا مجیب الرحمٰن کے خلاف کردار

حالات دگرگوں ہوتے گئے مگر قدرت نے ہمیں جمہوریت کی بحالی کا ایک اور موقع فراہم کر دیا انتخابات ہوئے اور شیخ مجیب الرحمٰن کی جماعت عوامی لیگ نے قومی اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل کر لی جنرل یحییٰ جو اس وقت سیاہ و سفید کے مالک تھے سخت پریشان تھے کہ کہیں شیخ مجیب ان کو اقتدار سے محروم نہ کر دے وہ مذاکرات کے لیے ڈھاکہ تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے شیخ مجیب کو ملک کا وزیراعظم نامزد کر دیا مغربی پاکستان کے سیاسی حلقوں میں سراسیمگی پھیل گئی ذوالفقار علی بھٹو نے اعلان کیا کہ شیخ مجیب اپنی اکثریت کے زور پر فاشسٹ نظام قائم کر دیں گے انہوں نے دھمکی دی کہ ارکانِ اسمبلی میں سے اگر کوئی ڈھاکہ گیا تو اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی اور یوں جمہوریت کے دست و بازو کاٹ کر رکھ دیے گئے۔(۵۰)

بھٹو صاحب نے شیخ مجیب کے بارے میں خدشے کا اظہار کیا تھا کہ وہ برسرِ اقتدار آ کر فاشسٹ نظام قائم کریں گے مگر جس کلچر کو انہوں نے رواج دیا وہ فاشسٹ نظام سے بھی بدتر تھا۔

Thus, the political culture which Bhutto symbolized was characterized by complete intolerance of democratic opposition, irrespective of the means which may have to be adopted for the purpose. Physical Violance, which had always been played an important role in the politics of Pakistan, got further stimulus under Bhutto's rule. The disruption of opposition rallies, the kidnapping of opposition leaders, attacks on their houses or families, assassination attempts on them and acts of arson and looting against them were a frequent occurence throughout Bhutto's rule, what lent a touch of tragic irony to the situation was that even stalwarts of the people's party, who dared express an independent or non-conformist opinion within the

party, were also not exempt from this kind of treatment. Some of the leading lights of the People's party who, at one stage or the other, had occupied top positions in the PPP hierarchy but were later constrained to quit it or rather than bow to the wishes of the leader, are Mian Mohammad Ali Kasuri, J. Rahim, Khursheed Hassan Mir, Ahmad Raza Kasuri, Haneef Ramay and Ghulam Mustafa Khar.(۵۱)

اس آمرانہ طرزِ عمل کی تصدیق سابق وزیراعلیٰ پنجاب محمد حنیف رامے کے درج ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے:

بھٹو صاحب بھی اس بات کے قائل تھے کہ پنجاب میں کوئی ایسا شخص نہیں ہونا چاہیے جسے پنجابی بھی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھیں اور کسی کے پاس اتنا اثر و رسوخ نہیں ہونا چاہیے جس سے پنجاب کے اندر یہ تاثر پیدا ہو جائے کہ ان کے اندر بھی کوئی آدمی ہے چنانچہ انہوں نے پہلے کھر صاحب کو آگے کیا ایک حد سے آگے انہیں بھی نہیں جانے دیا درمیان میں قادیانیوں کے فسادات بھی ہو گئے دولتانہ کی وزارت تین دن اور ناظم الدین کی وزارت ڈیڑھ ماہ میں اڑ گئی تھی میں نے اس سب کو کنٹرول کیا اس کے بعد بھٹو صاحب نے بھی سوچا کہ یہاں کچھ ڈیوائیڈ اینڈ رول ہونا چاہیے چنانچہ کھر کو دوبارہ لایا گیا ہم نے کھر صاحب کو بڑے آرام سے گورنر ہاؤس میں رکھا تاکہ وہ پھولوں اور پودوں کی اچھی طرح نگرانی کریں۔(۵۲)

پیپلز پارٹی کا دعویٰ ہے کہ یہ جمہور کی پارٹی ہے چونکہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں اس لیے پیپلز پارٹی نے اپنے دورِ حکومت کو عوامی دورِ حکومت کا نام دیا لیکن تاریخ پاکستان کے اسی دور میں استبدادی اور ظالمانہ ہتھکنڈوں کو جس طرح اقتدار کے استحکام کے لیے استعمال کیا گیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ پورا دورِ حکومت آزادیٔ رائے کا گلا دبا کر غیر جمہوری اقدامات کا دور ہے۔

پارلیمنٹ کی کم و بیش تمام اہم سیاسی جماعتوں کی موافقت اور رضامندی سے ۱۹۷۳ء کا آئین بروئے کار آیا تھا لیکن اس کی منظوری کو ابھی چند ماہ نہیں گزرے تھے کہ جمہوری قبا میں لپٹا ہوا دیو استبداد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے پنجے دکھانے لگا خوشامدی افسروں کا ایک گروہ ان کے گرد جمع تھا وہ پاکستان کے تمام صوبوں میں اپنی پارٹی کی بالادستی قائم کرنا چاہتے تھے۔ وفاق میں پنجہ گاڑنے سے بھٹو کی تسلی نہ ہوئی وہ مزید اختیارات حاصل کرنے کے آرزومند تھے وہ چاہتے تھے کہ اسمبلیوں کے انتخابات میں ان کی پارٹی کا حال کچھ بھی ہو وہ اپنی ذاتی مقبولیت کی بنیاد پر جب تک چاہیں ملک کے اعلیٰ منصب پر فائز رہ سکیں۔

۱۹۷۳ء کے متفقہ آئین کے بعد عوام کو توقع تھی کہ ان کی حمایت سے اقتدار میں آنے والی پارٹی جمہوریت کے فروغ کے لیے کام کرے گی لیکن پیپلز پارٹی کی قیادت نے بہت جلد یہ ثابت کر دیا کہ وہ جمہوریت پر یقین نہیں رکھتی پارٹی میں کبھی انتخابات کرانے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی پارٹی ورکرز اور عہدیداران کے غلام بن گئے پرانے اور قدآور کارکنوں کو نکال باہر کیا۔ جے اے رحیم کو وزارت سے نکال کر جیل میں ڈال دیا گیا جمہوریت کے نام پر برسرِ اقتدار آنے والی جماعت ہوسِ اقتدار میں بہت آگے نکل گئی۔

اقتدار پر مکمل گرفت حاصل کرنے کے بعد مسٹر بھٹو نے جمہوری روایات سے انحراف کا راستہ اختیار کرنا شروع کیا بنیادی حقوق کی پامالی اور عوام کے حقوق کے استحصال کو اپنا دستورِ عمل بنالیا پریس اور دیگر ذرائع ابلاغ کو غیر جمہوری اور غیر اخلاقی پابندیوں میں جکڑ دیا آہستہ آہستہ فسطائیت کے منحوس سائے پاکستان کی طرف بڑھنے لگے بھٹو نے جمہوریت کو کچلنے کے لیے بہت سے بدنام زمانہ اقدامات کیے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے غیر جمہوری ہتھکنڈے استعمال کیے سیاسی جماعتوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے بھرپور انداز میں شب خون مارا مخالفین کو کچلنے کے لیے نازی یادوں کو تازہ کیا غیر قانونی اور غیر اخلاقی روایات کی بنیاد رکھی۔

بھٹو دور میں سندھ میں لسانی تنازعہ نے ۱۹۷۲ء میں نیا رخ اختیار کیا مری قبائل کی بغاوت کو کچلنے کے لیے طاقت کا بھرپور استعمال کیا گیا ۲۳ مارچ ۱۹۷۳ء کو متحدہ جمہوری محاذ کا جلسۂ عام رائفلوں، اسٹین گنوں، پستولوں اور دوسرے خودکار ہتھیاروں سے اندھا دھند فائرنگ، دستی بموں، چاقوؤں اور لاٹھیوں کے وحشیانہ استعمال کی نذر ہو گیا ۱۰ فروری ۱۹۷۵ء کو نیشنل عوامی پارٹی کو توڑ دیا اور اسکی تمام املاک اور فنڈز ضبط کرنے کا اعلان کیا۔

آزادیٔ اظہار پر ہر طرح کی قدغن لگائی گئی ہر طرف خوف و ہراس کا سماں پیدا کر دیا گیا آئین میں خود مختاری دینے کے باوجود سرحد اور بلوچستان کی حکومتیں ختم کر دی گئیں اور مخالفین پر غداری کے الزامات لگا کر مقدمات چلائے گئے کسی کی عزت محفوظ نہیں تھی سیاسی مخالفین کے قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

بھٹو دور میں متعدد سیاسی راہنما قتل ہوئے جن میں خواجہ رفیق، ڈاکٹر نذیر احمد، مولانا شمس الدین، عبدالصمد خان اچکزئی، جاوید نذیر، عبدالوحید، محمد انور سمہ، مولوی سعد اللہ اور نواب محمد احمد خان کے نام قابل ذکر ہیں۔

بدترآمریت کو رواج دینے اور ظلم کا بازار گرم کرنے کے باوجود مسٹر بھٹو اپنی ذات اور پارٹی کو پاکستان کے لیے ناگزیر سمجھتے تھے اپنی شعلہ بیانی اور خطیبانہ جوہر سے عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے کہ ملک سخت خطرہ میں ہے اس کی سلامتی کے لیے بھٹو کا اقتدار میں رہنا ضروری ہے مگر طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر وہ بھٹو کو اتنا ناگزیر سمجھتے کہ پاکستان کی سلامتی محض ان کی ذات کی محتاج بن کر رہ گئی ہے۔ ایس ایم ظفر لکھتے ہیں:

> پھر پاکستان پیپلز پارٹی کے اکابر نے اسی مصنوعی خطرے کو اپنے دعوے کی بنیاد بناتے ہوئے بھٹو اور پاکستان کو لازم و ملزوم قرار دے دیا ممتاز بھٹو اور حفیظ پیرزادہ وغیرہ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر بھٹو کی حکومت نہ رہی تو پھر پاکستان بھی نہیں رہے گا خود ذوالفقار علی بھٹو نے بھی اپنے بارے میں علی الاعلان یہ کہہ دیا کہ اگر میں نہ رہا تو ہمالیہ بھی روئے گا۔

مولانا کوثر نیازی نے کہا:

> صدر بھٹو کے خلاف سازشیں کرنے والوں کا ان کے خاندانوں سمیت صفایا کر دیا جائے گا کئی بار اشاروں کنایوں میں اکثر وزراء نے بھی قوم کو یہ دھمکیاں دیں کہ اگر کسی نے کرسیاں چھیننے یعنی ان سے اقتدار لینے کی کوشش کی تو یاد رکھو نہ ملک رہے گا نہ کرسیاں باقی رہیں گی۔ (۵۳)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ذوالفقار علی بھٹو کو فی الواقع پاکستانی عوام کی بے پناہ حمایت حاصل تھی اور ان کے مقابلے میں کوئی بھی سیاسی جماعت مغربی پاکستان کی حد تک مضبوط سیاسی حریف کی حیثیت نہ رکھتی تھی مگر عزت و ذلت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ تو ابابیلوں سے ہاتھی مرواتا ہے بھٹو اپنے پانچ سالہ دورِ حکومت کے اختتام پر نئے انتخابات کے ذریعے ہر قیمت پر دو تہائی اکثریت حاصل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے کیونکہ اس کے بغیر وہ آئین میں اپنی مرضی کی تبدیلیاں نہ لا سکتے تھے مگر دیگر سیاسی جماعتوں نے بھٹو کی آمرانہ جمہوریت کا مزہ چکھ لیا تھا لہٰذا جنوری ۱۹۷۷ء میں پاکستان کی نو سیاسی جماعتوں نے پاکستان قومی اتحاد کی تشکیل کر کے ایک مضبوط حزب مخالف کی بنیاد رکھی۔ زبردست انتخابی مہم کے بعد ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کو قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو ۸ مارچ کی صبح حاصل ہونے والے انتخابی نتائج میں عوام کا ووٹ دھاندلی کی بھینٹ چڑھ چکا تھا بدترغنڈہ گردی کے ذریعے بیلٹ باکس کا تقدس پامال کیا گیا تھا۔ حزب اختلاف نے نتائج تسلیم کرنے سے انکار کر کے صوبائی اسمبلی کے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ حکومت اور الیکشن کمیشن کے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا گیا اور قومی اتحاد کے راہنماؤں نے کہا کہ ملک میں نگران حکومت قائم کر کے نئے سرے سے الیکشن کروائے جائیں مگر بھٹو صاحب نے یہ مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ ۱۴ مارچ ۱۹۷۷ء کو قومی اتحاد کی اپیل پر ایک زبردست احتجاجی تحریک کا آغاز کیا گیا۔ تحریک روز بروز شدت اختیار کرتی گئی بھٹو حکومت نے پولیس، ایف۔ایس۔ایف، اور دیگر نیم عسکری دستوں کو بے دریغ استعمال کیا مگر حکومتی قوتیں صورتحال پر قابو نہ پا سکیں۔ ہفت روزہ اسلامی جمہوریہ کے ایڈیٹر مجیب الرحمٰن شامی نے اداریہ لکھا کہ پورا وطن یک زبان ہے سبھی کی ایک آواز ہے سبھی کا ایک نعرہ ہے۔ "ہم بھٹو حکومت کو نہیں مانتے، نہیں مانتے، نہیں مانتے" جب عوام نہیں مانتے تو روئے زمین کی کوئی قوت اسے منوا نہیں سکتی اب ہچر مچر کرنے اور مین میخ نکالنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تاریخ اپنا فیصلہ دے چکی ہے، اس فیصلے کو سخت تر تو کیا جا سکتا ہے مگر اس میں اب نرمی پیدا کرنا مشکل ہے شہر سیاست کے اونچے پل کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے اور اب یہ دریا الٹا نہیں چل سکتا مزید جگ ہنسائی سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔(۵۴)

ان حالات میں وہی بھٹو جو سٹیج پر اپنی شراب نوشی کا برملا اعتراف کر چکے تھے عوامی غیض و غضب کی شدت دیکھ کر اسلام نافذ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں مخدوم زادہ حسن محمود رقمطراز ہیں کہ مسٹر

بھٹو کی چالاکی ملاحظہ ہو کہ عین اس وقت جب پاکستان سخت سیاسی بحران میں مبتلا تھا اور قومی اتحاد ان سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کر رہا تھا انہوں نے ملک میں نفاذِ شریعت کے لیے بعض فوری اور اہم اقدامات کا اعلان کر دیا اس اعلان کے مطابق شراب اور قمار بازی پر فوری پابندی لگا دی گئی نائیٹ کلبوں کو یکسر ختم کر دیا گیا اور اسلامی نظریاتی کونسل کی از سر نو تشکیل کر کے اس میں مولانا مودودیؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا مفتی محمودؒ اور ایک شیعہ عالم کو بطور ممبر شامل کرنے کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ کونسل چھ ماہ میں اپنی سفارشات مکمل کر کے نیشنل اسمبلی میں منظوری کے لیے پیش کر دے گی۔

یہ اعلان مشتے از خروارے کے بعد از جنگ کے مترادف تھا اس سلسلے میں ان کا خلوص مشتبہ تھا جو شخص اسلام ہمارا دین کا نعرہ لگانے کے باوجود اپنے دورِ اقتدار میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا اہتمام نہیں کر سکا تھا اب اس کی طرف سے چھ ماہ میں نظامِ اسلام کے وعدے پر کیسے اعتبار کیا جا سکتا تھا۔(۵۵)

نفاذِ شریعت کے اس اعلان کا پسِ منظر یہ تھا کہ انتخابی دھاندلی کے خلاف یہ تحریک نظریاتی رنگ اختیار کر گئی اور اسے تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کا نام دے دیا گیا، ہر زبان پر ایک ہی نعرہ تھا، نظامِ مصطفےٰ، اسلامی انقلاب، اسلامی انقلاب چنانچہ مارچ کے انتخابات کے انداز و نتائج کے خلاف جو ملک گیر احتجاجی تحریک چلی تھی اور جس میں بے پایاں جہد و ایثار نے بڑے بڑے بتان پندار کو پاش پاش کر دیا وہ اگرچہ شروع تو بیلٹ باکس کے تقدس کی بحالی کے نام پر ہوئی تھی لیکن اسے خیرہ کن تقویت نظامِ مصطفےٰ کے قیام کے لیے زبان زد خاص و عام پکار اور دل و جان سے لگن نے عطا کی تھی۔ تحریک کے دوران ہی اس کا ایک ٹھوس نتیجہ یہ نکلا کہ ترقی پسند حکمران بھی مغربی تمدن کے خرافات، شراب، قمار بازی اور شبینہ کلبوں پر پابندی لگانے پر مجبور ہو گئے ہفتہ وار چھٹی جمعۃ المبارک کو قرار پائی۔(۵۶)

فوج جو اس ملک میں سیاسی قوت کا اصل سرچشمہ ہے اس سنگین ترین بحران میں غیر جانبدار کیسے رہ سکتی تھی اور اب تو کسی منصوبہ بندی کی ضرورت بھی نہ تھی ایک زبردست عوامی فضا تیار تھی لہٰذا ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو جنرل ضیاء الحق نے مسٹر بھٹو کا تختہ الٹ کر مارشل لاء نافذ کر دیا بھٹو دور کے ستائے ہوئے عوام نے اس مارشل لاء کا خیر مقدم کیا۔ یہ ایک نئے دور کا آغاز تھا جبکہ نواب محمد احمد خان کے مقدمہ قتل میں بھٹو کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور ۱۸ مارچ ۱۹۷۸ء کو لاہور ہائی کورٹ نے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو سزائے موت کا حکم سنایا۔(۵۷)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

موت کی سزا پانے کے بعد پیپلز پارٹی نے بھٹو کو شہید قرار دے کر اپنے نظریات کو بھٹو ازم کا نام دیا مگر فی الحقیقت یہ عبرت کا سامان تھا جناب حسن محمود اس پر تبصرہ کرتے ہیں:

> جہاں تک قتل کے جرم میں ان کے تختہ دار تک پہنچنے کا تعلق ہے، میں مکافاتِ عمل پر ایمان رکھتا ہوں انسان کا کیا دھرا اس کے سامنے ضرور آتا ہے خونِ ناحق رنگ لا کر رہتا ہے ان کا دامن بے گناہوں کے خون سے داغدار تھا انہوں نے مخالفین کو معاف کرنا سیکھا ہی نہیں تھا جو بھی ان کی راہ میں رکاوٹ بنا اسے اپنی عزت، دولت اور جان سے ہاتھ دھونے پڑے حُروں کو جان بوجھ کر بلا قصور مروا کر انہوں نے پیر پگاڑا صاحب کے سندھ پر اثرات ختم کرنے کی کوشش کی عقوبت خانوں کے در و دیوار ان کے ظلم و ستم کی داستانیں زبانِ حال سے کہتے سنائی دیتے تھے ان کے بے لگام گھوڑوں کے ہاتھوں کتنوں کے سہاگ لٹے کتنوں کی عزت لٹی اور کتنے گھر بے چراغ ہوئے یہ ایک ایسی المناک داستان ہے کہ اسے سنانے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے بہر حال قانونِ قدرت کے مطابق ان باتوں کا جو انجام ہونا چاہیے تھا مسٹر بھٹو اس سے دوچار ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔(۵۸)

www.KitaboSunnat.com

فصل چہارم

جنرل ضیاء سے جنرل مشرف

بھٹو دور کا عبرت ناک انجام پاکستان میں ایک اور طویل مارشل لاء کی بنیاد بنا خراب ترین صورتحال میں فوج محض تماشائی بن کر نہ رہ سکی اس لئے ایس ایم ظفر لکھتے ہیں کہ

> دلچسپ بات یہ ہے کہ فوجی انقلاب جنرل ضیاء نے برپا کیا جن کی ترقی بھی مسٹر بھٹو ہی کے ایجنڈے کا حصہ تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے بقول ان کے اپنے فوجی انٹیلی جینس کے سربراہ جنرل محمد جیلانی کی سفارش پر جنرل محمد ضیاء الحق کو اپنے چھ سینئر جرنیلوں کے مقابل ترقی دے کر چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیا لیکن جنرل محمد جیلانی سے حال ہی میں ملاقات ہوئی ان کا کہنا ہے کہ جنرل محمد ضیاء الحق ذوالفقار علی بھٹو کی اپنی دریافت تھے۔(۵۹)

بھٹو نے جنرل ضیاء کو اس توقع پر ترقی دی تھی کہ وہ تازندگی ممنونِ احسان ہوگا مگر تاریخ نے کچھ اور ہی منظر پیش کیا بھٹو کی اقتدار پسندی کی شہرت اس حد تک ہو چکی تھی کہ جب فوج نے اقتدار سنبھال لیا تو بھی ان کے بعض حامیوں نے اس کی یہ تاویل کی کہ فوج نے یہ کاروائی ان کے کہنے پر کی ہے تاکہ قومی اتحاد کی تحریک کی شدت کو ختم کیا جاسکے تاہم جنرل ضیاء الحق نے اس خوش فہمی کو جلد ہی دور کر دیا کیونکہ انہوں نے ان مجسٹریٹوں کے تبادلے جو پیپلز پارٹی کے حامی تھے منسوخ کرنے کا حکم دے دیا انہوں نے احتجاجی تحریک کے دوران اسلامی جذبے کی بھی تعریف کی جو خوش فہمی کے ازالے کے لیے مددگار ثابت ہوئی۔(۶۰)

بھٹو ازم کے برعکس ضیاء کے دور میں اسلامائزیشن کا بہت شور ہوا بلکہ بعض ٹھوس اقدامات بھی کیے گئے مگر بوجوہ اکثر اقدامات نقش بر آب ثابت ہوئے البتہ ضیاء دور پاکستان کے لبرل افراد اور طبقات کے لیے بہر حال کٹھن دور تھا۔

یونیورسٹی آف راجستھان جے پور انڈیا کے سکالر ڈاکٹر کوشک کی رائے قابل غور ہے:

> Conservative and fundamentalist forces became orphan after Zia's death. However, those who believed in liberal and humanitarian aspects of

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

> Islam, though they grieved over the tragic end Zia had met, felt considerably relieved.(٦١)

جنرل ضیاء الحق اپنے شخصی کردار اور اخلاق کے لحاظ سے نسبتاً بہت بہتر حکمران ثابت ہوئے اگر ایوب خان سے بھٹو تک کے ادوار میں لبرل رجحانات کے سکوپ (Scope) میں اضافہ ہوا تو جنرل ضیاء کے دور میں بہر حال حوصلہ شکنی کا رویہ سامنے آیا۔ اسلامی اور اخلاقی اقدار کے فروغ کے لیے کافی اقدامات کیے گئے سب سے بڑھ کر یہ کہ ضیاء الحق اپنے ذاتی کردار اور رویے سے بہر حال کافی بہتر ثابت ہوئے معروف صحافی مجیب الرحمٰن شامی نے لکھا:

> اسلام ان کے لیے ایک ذاتی تجربہ ہے دل کی واردات ہے اور اس پس منظر میں جب ان کے الفاظ کو جمع کیا جائے تو وہ انفرادی شان رکھتے ہیں۔ آیئے دعا کریں، ضیاء الحق اقتدار کے ایوان میں رہیں یا نہ رہیں مسلح افواج کے سالار رہیں یا نہ رہیں۔ اسلام اور پاکستان کے سپاہی ضرور رہیں۔(٦٢)

پاکستان کی فوجی حکومتوں میں سب سے زیادہ مغالطوں (Confusions) کی حامل ضیاء حکومت ہے کیونکہ اسلامی نظام کے دعوؤں کی تکرار کے ساتھ ضیاء نے قوم کی نبضوں پر ہاتھ رکھا مگر دوسری طرف لادین عناصر کو کچلنے کے لیے بعض ایسے اقدامات بھی کیے جس کی اسلام کے عادلانہ نظام کے تحت توجیہہ کرنا مشکل ہے پھر اسی طرح جنرل ضیاء اسلام پسندوں کا مجموعی طور پر اعتماد نہ حاصل کر سکے یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں جنرل ضیاء کے حامی جہاں بے پناہ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں وہاں مخالفین بلکہ بعض اوقات متوازن مبصرین بھی ضیاء دور پر تنقید کرتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی پاکستان کے ضیاء دور کے آغاز میں جنرل ضیاء کے ساتھ مثبت نوعیت کے تعلقات قائم ہوئے حتی کہ جماعت نے جمہوریت کی حامی ہونے کے باوجود ضیاء مارشل لاء کی حکومت میں وزارتیں قبول کیں اور مخالفین کی طرف سے مارشل لاء کی بی ٹیم کا طعنہ بھی سنا مگر جماعتِ اسلامی پاکستان کے نائب امیر جناب خرم مراد ضیاء دور کا بڑا ہی حقیقت پسندانہ تجزیہ کرتے ہیں:

> پہلی تبدیلی جس کے اندر مثبت اور منفی دونوں پہلو ہیں وہ رسمی مذہب کا زیادہ گہرا رسوخ اور اس کے مظاہر کے ساتھ گہرا شغف ہے مساجد میں حاضری میں اضافہ، حسن قرأت میں بہتری، دینداری کے مظاہر کا اہتمام، اسلام کی تعریف میں

> تقریریں، کانفرنسیں اور کتابیں، اسلامی موضوعات سے دلچسپی بالخصوص اسلامی انقلاب کے داعیوں کی طرف سے بھی سروں پر ٹوپیاں پہنوانے اور چہروں پر داڑھیاں رکھوانے کا غیر معمولی اہتمام، یہ ساری چیزیں اس تبدیلی کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اس کی سب سے بڑی وجہ ضیاء حکومت کی طرف سے اسلام کے ساتھ وابستگی کا واضح اظہار اور اسلامیانے کے رسمی اقدامات ہیں لیکن دین کی حقیقی اقدار کے رسوخ اور دین کی روح کی بازیابی سے یہ مذہبی ترقی خالی ہے تقریباً اسی تناسب سے جس تناسب سے حکومت کے اعلانات اور اقدامات عمل سے خالی ہیں اسلامی انقلاب کے داعیوں کے توجہات کے مظاہر پر غیر معمولی ارتکاز کی وجہ شاید انقلاب کے برپا ہونے سے یک گونہ مایوسی ہو سکتی ہے۔ دوسری تبدیلی یہ محسوس کرتا ہوں کہ جو امور قومی زندگی میں تقریباً مسلمہ حیثیت رکھتے تھے اور جن پر تنازع یا مخالفت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا وہ بھی اب متنازع بن گئے ہیں یا بنا دیے گئے ہیں ان میں سرِ فہرست خود اسلام اور اس کے اقدار و احکام ہیں اسلام کے خلاف کھلم کھلا بھی اور خود اسلام کا نام لے کر بھی جو حملے اور تضحیک و تمسخراب اخباروں اور رسالوں میں نظر آتا ہے وہ پہلے نہ تھا یہی حال مقصدِ پاکستان، نظریۂ پاکستان، وحدتِ پاکستان اور مسلمہ معاشرتی اقدار و مراسم کا ہے۔(٦٣)

ضیاء دور میں کیے گئے اقدامات سے اصلاحِ احوال کی بجائے بداعتمادی اور بدگمانی کی فضا پروان چڑھی۔ بائیں بازو کے دانشور شوکت علی نے ضیاء دور میں لکھا:

> پچھلے ۳۵ برس سے پاکستان کے حکمرانوں نے اپنے ذاتی مفادات کے لیے کسی نہ کسی شکل میں اسلام کے نام کو استعمال کیا ہے لیکن جنرل ضیاء نے تو اپنی حکومت کی بقاء اور طوالت کے لیے اس نام کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے اور گزشتہ ساڑھے پانچ سالوں میں اسلامی قوانین کا جائزہ لینے کے لیے کمیٹیوں پر کمیٹیاں تشکیل کی جا رہی ہیں لیکن ابھی تک اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی گئی عوام کے لیے جو چند اسلامی قوانین نافذ کیے گئے ہیں وہ صرف تعزیرات سے تعلق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رکھتے ہیں یا پھر ٹیکسوں کے نظام سے لیکن اسلام کی سیاسی اور معاشی اساس کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔(۶۴)

اگر جنرل ضیاء اسلامی نظام کے نفاذ کا تدریجی انداز اختیار کرتے اور اس میں بھی اسلامی نظام حیات کو ایک زحمت سے زیادہ رحمت اور نعمت کے طور پر پیش کیا جاتا، لوگوں کی معاشی صورتحال بہتر بنانے کے اقدامات ہوتے، انصاف کے حصول کے امکانات بہتر بنائے جاتے اور تعزیرات کا پہلو دوسری ترجیح قرار پاتا تو صورتحال اتنی تلخ نہ ہوتی مگر ضیاء دور کا اہم پہلو یہ ہے کہ ان کی ساری کاوش کا مطلب یہ لیا گیا کہ وہ اسلام کی آڑ میں اپنے اقتدار کی طوالت چاہتے ہیں پھر یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جنرل ضیاء نے اپنے مفادات اور ترجیحات کے تابع ایک (Controlled Democracy) متعارف کروائی جس کو ملکی اور عالمی سطح پر پذیرائی حاصل نہ ہو سکی بلکہ اسے ایک آمرانہ طرزِ عمل ہی قرار دیا گیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے سابق سیکرٹری جنرل راؤ رشید نے ضیاء دور کے غیر جماعتی انتخابات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے انٹرویو میں کہا کہ اس حکومت کا اقتدار چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں یہ تو سب کو پتہ ہے سب پر عیاں ہے اب چونکہ ان کو سات سال مارشل لاء کے ذریعے حکومت کرتے ہوئے ہو گئے ہیں اب دنیا میں ان کا منہ کالا ہے کوئی جواب ان کے پاس ہے نہیں کہ سات سال مارشل لاء رکھنے کا کیا جواز ہے اب کوئی نہ کوئی ایک نیا ڈھونگ نیا سوانگ رچانا چاہتے ہیں جس کے ذریعے سے آئندہ پانچ سات سال یا جتنے بھی گزر سکتے ہیں گزار لیں ہمارا ایمان ہے ہمارا یہ بالکل پکا یقین ہے کہ یہ جس قسم کے بھی الیکشن کرا لیں گے وہ جمہوریت کی طرف کوئی قدم نہیں ہو گا بلکہ یہ صرف اپنے مارشل لاء کو ایک نیا جواز دینا چاہتے ہیں اور ایک نئے حلیے میں سمجھ لیجئے ایک نئے ڈھونگ کے ذریعے اپنے اقتدار کو یہ طوالت دینا چاہتے ہیں۔(۶۵)

پاکستان پیپلز پارٹی کے افکار و نظریات اور کلچر کیسا ہی کیوں نہ ہو پاکستانی عوام میں گہرا نفوذ رکھتی تھی ضیاء حکومت نے جب پیپلز پارٹی کو محض قوت کے بل پر کچلنے کے اقدامات کیے تو شدید سیاسی مغائرت کی فضاء پروان چڑھی سندھ سے پیپلز پارٹی کے سرکردہ لیڈر آغا غلام نبی پٹھان اس دور کے اسلام کے حوالے سے کہتے ہیں:

> اب ضیاء الحق کے دور میں ٹی وی پر اتنا اسلام، اسلام، اسلام، اسلام شروع ہوا کہ جب کوئی داڑھی والا ملّاں آ کر کچھ کہے تو بچے تڑک کر کے ٹی وی بند کر دیتے ہیں

> ہم پوچھیں بابا کیوں؟ وہ کہیں۔ وہ داڑھی والا آیا۔ ضیاء الحق کے مطابق جو اسلام ہے وہ زکوٰۃ اور عُشر ہے۔(۶۶)

بیسویں صدی میں اقوامِ عالم میں مغربی تہذیب اور مغربی جمہوریت کے غلبے کے باعث جمہوریت، آزادی اور مساوات کے سلوگن اتنے معروف ہوئے کہ کسی بھی معاشرے اور اجتماعیت میں قیادت کے ہر لائحہ عمل اور قدم کو انہی نعروں سے سمجھا اور پرکھا گیا لہٰذا آزادی اور مساوات اولین ترجیح کے حامل قرار پائے اس لیے اسلام کا بھی ایک ایسا ہی ایڈیشن درکار تھا اور پاکستانی معاشرے کے اسلامی ضمیر کے پیشِ نظر جمہوری قوتیں بھی ایک ایسا نظام لانا چاہتی تھیں جس پر اسلام کا ٹائٹیل نمایاں ہو مثلاً ترقی پسند فکر کے ترجمان رسالے ارتقاء کے تحت جمہوریت کے حوالے سے سیمینار منعقد ہوا جس میں ترقی پسند مفکر ڈاکٹر جعفر احمد نے کہا:

> ہم اسلام کے نام پر ہی متحد ہوئے اور امیدیں باندھیں اگر ہم ایک جمہوری نظام چاہتے تھے تو باصلاحیت قیادت کا فریضہ تھا کہ وہ ایک ایسا نظام دریافت کرتے جو جمہوری ہوتا جس میں بنیادی حقوق ہوتے جس میں ہر فرد کو آزادی اور مساوی مواقع حاصل ہوتے لیکن یہ سب کچھ اسلام کے وسیع تر ڈھانچے میں ہوتا ہماری پہلی مصیبت کا آغاز اس وقت ہوا جب ہر راہنما نے سوچا کہ وہ اس نظام اقدار کو جسے وہ کارآمد سمجھتا ہے، اسلام کا لبادہ اوڑھ کر پیش کر سکتا ہے اور اسے ترقی دے سکتا ہے یوں قائدین اور عوام کے درمیان جو باہمی اعتماد اور وابستگی کی ضرورت تھی وہ پیدا نہ ہو سکی۔

آپ اپنے سیاسی تجربے سے جانتے ہیں کہ منشیات پر پابندی لگائی گئی۔ جمعہ کو چھٹی کا دن قرار دیا گیا، قادیانیوں کی سیاسی اور سماجی تعمل میں شرکت غیر قانونی قرار پائی کیا اس سے اس شخص کی سیاست کو تحفظ مل گیا جس نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ نہیں لوگ اب بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اسلام کے حوالے سے ان کی جو تمنائیں تھیں وہ اب بھی تشنہ ہیں اور اس قسم کی قانون سازی سے یا اس قانون سازی سے جو بعد میں جنرل ضیاء نے کی ان کی تشفی نہیں ہوتی۔(۶۷)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ضیاء دور میں اسلامائزیشن کے اقدامات چاہے اخلاص پر مبنی ہی کیوں نہ ہوں محض مارشل لاء کے ضابطوں اور آرڈیننسوں کے زور سے ان کا نفاذ محض سطحی ثابت ہوا کیونکہ معاشرتی سطح پر اسلام کے لیے مثبت ذہن سازی کا عمل مفقود تھا پھر جیسا کہ آمرانہ طرزِ حکومت کے تحت بنیادی حقوق، آزادیٔ فکر اور اظہارِ رائے سے محروم معاشروں میں منفی رجحانات تقویت حاصل کرتے ہیں ایسا ہی ضیاء دور میں ہوا اسلام کے سارے زور و شور کے باوجود فرقہ وارانہ فضا اور کلچر نے فروغ پایا اور یہ محض مذہبی نہ تھا بلکہ نسلی اور لسانی بنیادوں پر بھی تھا سندھ میں علیحدگی پسندی کی تحریک نے شدت اختیار کی اور پاکستان کا سب سے بڑا شہر کراچی لسانی تعصب کی بھینٹ چڑھ گیا۔ بائیں بازو کے دانش ور آئی اے رحمان کا موقف ہے:

> ضیاء الحق کی حکومت نے جمہوری سیاست اور مذہبی جنون کے درمیان اس مقابلے میں ایک واضح فرق پیدا کیا اس سے پہلے جو حکمران آئے وہ فرقہ پرستوں کو خوبصورت الفاظ سے کچھ دلاسا دیتے رہتے تھے اور ساتھ ہی کچھ مراعات بھی جس کا نقصان عام لوگوں کو خاص طور پر غیر مسلم اقلیتی فرقوں کو ہوتا تھا حالانکہ یہ مراعات ملک کے لیے خاصی خطرناک ثابت ہوئیں لیکن ضیاء الحق نے تو ریاست کو عملاً فرقہ پرستوں کے مسلک کا پابند بنا دیا اور ایسا کرتے وقت مذہبی سیاست کے نہایت کاری حربے استعمال کیے جمہوری سیاست سے ضیاء کے انحراف کا لازمی نتیجہ فرقہ ورانہ جنون کی موجودہ لہر ہے۔(۶۸)

ٹیلی ویژن پر حکومت کے ہاتھ میں بے حد قوی اور کاری ہتھیار ثابت ہوا جنرل ضیاء کے دور میں خبرنامہ کتمانِ حق کی بدترین مثال ثابت ہوا جس سے عوام کو روز واسطہ پڑتا تھا پھر جب حکومت جیسے طاقتور ادارے سے اسلام کے نفاذ کے اعلانات کے ساتھ آدھا سچ اور آدھا جھوٹ نشر کیا جائے تو بداعتمادی کی فضا میں مثبت اقدامات بھی قدر افزائی سے محروم ہو جاتے ہیں اس کی بین مثال ضیاء دور کا ریفرنڈم ہے۔ دی نیوز میں شائع شدہ ایک آرٹیکل میں شیریں پاشا لکھتی ہیں:

> The referendum in 1985 was literally a media-concocted event which fooled the whole nation into believing that the majority of the country had turned out to support it, when in fact the streets were deserted.(۶۹)

جنرل ضیاء کی حکومت کی طرف سے ریفرنڈم کا انعقاد ہر سطح پر تنقید کا ہدف بنتا ہے تاہم اپنی ذات میں اختیارات کے ارتکاز کے بعد جنرل صاحب جمہوری آزادی اور بنیادی حقوق کی طرف بڑھے مگر احتیاط کے ساتھ۔ اسلام کے نظامِ حیات کے نفاذ کی ترجیح کے ساتھ چنانچہ ریفرنڈم کے بعد جنرل ضیاء نے ۲۵ فروری ۱۹۸۵ء کو قومی اسمبلی اور ۲۸ فروری کو صوبائی اسمبلی کے انتخابات کے انعقاد کا اعلان کیا نو منتخب اسمبلیوں کے آغاز سے پہلے صدر نے ۲ مارچ کو ایک صدارتی حکم کے ذریعے ۱۹۷۳ء کے آئین کو بعض ترامیم کے ساتھ بحال کر دیا ان ترامیم کا مقصد یہ تھا کہ مستقبل میں صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات میں توازن قائم کیا جائے ہنگامی مواقع سے نپٹنے کے لیے ایک گیارہ رکنی قومی سیکورٹی کونسل قائم کی گئی ترمیم شدہ آئین میں صدر ضیاء الحق کے آئندہ پانچ برس کے لیے انتخاب کو قانونی حیثیت دے دی گئی اور یہ تصریح کر دی گئی کہ اس کے بعد صدر کا اگلا انتخاب چاروں صوبوں کی اسمبلیاں اور پارلیمنٹ کے دونوں ایوان مل کر کریں گے ۱۹۴۹ء کی قراردادِ مقاصد کو آئین کا حصہ بنا دیا گیا اور سیاسی جماعتوں کی بحالی کا سوال قومی اسمبلی کے لیے چھوڑ دیا گیا۔(۷۰)

مذکورہ بالا اقدامات نے جنرل ضیاء کے طرزِ عمل کے بارے میں مزید بدگمانیاں پیدا کیں غیر جماعتی انتخابات کے انعقاد کو آئین کی خلاف ورزی قرار دیا گیا جنرل ضیاء غیر جماعتی اسمبلی سے بھی خائف تھے اس لیے انہوں نے آئینی ترمیمات کے ذریعے اسمبلی کے اجلاس سے قبل ہی اپنی صدارت کو قانونی شکل دی جس سے پاکستان میں اسلامائزیشن (Islamization) کے بارے میں بداعتمادی پیدا ہوئی اسلام مخالف اور لبرل طبقات کے موقف کی تائید ہوئی جو یہ کہہ رہے تھے کہ اسلام کو محض اپنی کرسی کے استحکام کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

محمد خان جونیجو کو جنرل ضیاء کی طرف سے ہی وزیر اعظم نامزد کیا گیا تھا ایوان سے اعتماد کا ووٹ بھی جنرل صاحب کی پشت پناہی کا نتیجہ تھا مگر اپریل ۱۹۸۸ء میں سانحہ اوجڑی کیمپ، کراچی اور حیدر آباد میں قتلِ عام کے واقعات کے سلسلے میں صدر اور وزیر اعظم میں اختلافات بڑھتے چلے گئے اور بالآخر جنرل ضیاء الحق نے اپنے ہاتھوں لگائے گئے جمہوریت کے پودے کا تنا کاٹ کر رکھ دیا ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو آئین کے آرٹیکل نمبر ۵۸ کی شق ۲ کے تحت اسمبلی توڑ کر جونیجو حکومت ختم کر دی گئی۔ جنرل ضیاء کا یہ قدم بھی مطلق العنانیت کا اظہار تھا یعنی جمہوریت اور حریت فکر ضروری اور جائز ہیں مگر مردِ آہن ضیاء الحق کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقابل نہیں۔ جنرل ضیاء کے آمرانہ طرزِ عمل نے بظاہر تو ریاستی رعب داب کو قائم رکھا مگر سیاسی و جمہوری آزادی نہ ہونے کے باعث کوچۂ سیاست میں منفی سرگرمیوں نے زور پکڑا۔ حسن محمود لکھتے ہیں:

> جنرل ضیاء بڑے زیرک انسان ہیں وہ نہ جانے کیوں نہیں سمجھ رہے کہ ان کی طرف سے عوام کو اقتدار کی منتقلی میں جتنی دیر لگے گی اتنے ہی حالات بہتر ہونے کی بجائے خراب ہوتے جائیں گے فضا میں حبس ہو تو آدمی لُو کی دعا مانگنے لگتا ہے بہر حال یہ امر مسلمہ ہے کہ آمریت کوئی بھی رنگ اختیار کر لے عوام میں مقبولیت کبھی حاصل نہیں کرتی سختیاں اور پابندیاں لوگوں کو زیر زمین سرگرمیوں میں مصروف کر دیتی ہیں۔(۷۱)

حالات کی ستم ظریفی یہ ہے کہ ضیاء اپنی وفات تک اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ اسلام اور نظریہ پاکستان کے تحفظ کے لیے انہی کے لائحہ عمل اور حکمتِ عملی میں اہل پاکستان کی نجات کا سامان ہے اور جیسا کہ آمریت میں دوسروں کی رائے سننے کا رواج کم ہوتا ہے جنرل ضیاء نیک مقاصد کے ڈھنڈورے کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کو ہی قانون اور آئین کا ماخذ بناتے چلے گئے معروف سیاستدان محمد اصغر خان ضیاء دور کی حکمتِ عملی اور اثرات کا درج ذیل تجزیہ کرتے ہیں:

> معاشرے میں اسلامی نظام نافذ کرنے کے بڑے اقدامات میں زکوٰۃ کا نفاذ، نماز کی تاکید، رمضان میں روزے نہ رکھنے پر سزائیں، بینکوں میں شرح نفع و نقصان کے کھاتے، شرعی عدالتوں کا قیام اور سرکاری ملازمین کے لیے قومی لباس پہننے کے احکامات شامل ہیں یہ اقدامات ایسے ہیں جن میں اسلام کی حقیقی روح کی بجائے پروپیگنڈے اور رسومات کی ادائیگی پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے یہ اصل مسائل کی تہہ تک نہ پہنچنے اور ان سے عوام کی توجہ ہٹانے کا ایک طریقہ ہے دوسری طرف ان اقدامات نے پاکستانی معاشرے میں پھوٹ، فرقہ پرستی اور رجعتی رجحانات کو تقویت دی۔(۷۲)

اصغر خان نے مزید لکھا:

> اسلام کا نام استعمال کرتے ہوئے اس حقیقت سے چشم پوشی کی جا رہی ہے کہ سماجی و اقتصادی انصاف اور شہریوں کی انفرادی آزادیوں کو یقینی بنائے بغیر کوئی معاشرہ اسلامی نہیں ہو سکتا آج کا پاکستان سماجی اور اقتصادی میدان میں انصاف و مساوات سے تو دور ہے مگر جہاں تک انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کا تعلق ہے حکومت نے ملک کو ان قدروں سے بہت پیچھے دھکیل دیا ہے جو ایک اسلامی معاشرے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔(۷۳)

اگرچہ اصغر خان پاکستان میں لبرل اور سیکولر سیاستدان کے طور پر جانے جاتے ہیں مگر ضیاء دور کی اسلامائزیشن پر ان کے تبصرے سے اتفاق کیے بغیر چارہ نہیں کیونکہ اسلام۔اسلام کے سارے شور کے باوجود ضیاء حکومت بھی بدتر بدعنوانیوں کی پشت پناہی کرتی رہی بلکہ ملٹری بیوروکریسی کی کرپشن کے قصوں نے اسلامی نظام کے غبارے سے ہوا نکال کر رکھ دی۔ جنرل ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دور میں اکثر کارپوریشنوں میں اور مختلف محکموں کے انچارج فوجی افسر تھے لیکن پھر بھی ان سے بدعنوانی اور کرپشن ختم نہ کی جا سکی ۱۹۸۱ء کے وسط میں ۴۲ پاکستانی سفیروں میں سے ۱۸ کا تعلق فوج سے تھا ان میں ۱۵ بری فوج کے اعلیٰ افسر رہ چکے تھے۔ ۸۵-۱۹۸۰ء کے دوران ۹۶ فوجی افسروں کو مرکزی حکومت کے اعلیٰ عہدوں کے لیے مستقل طور پر چن لیا گیا۔ ۱۱۰ کو کانٹریکٹ پر نئی ملازمتیں دی گئیں۔ صرف پنجاب میں ۶۱۵۰ فوجی افسروں کو ۱۱۴۴۸۰۲۸ ایکڑ اراضی دی گئی جنرل ضیاء الحق کے دور کے جنرل فضل حق دنیا کے امیر ترین جرنیلوں میں شمار ہونے لگے اسی طرح جنرل ضیاء الحق کے بیٹے اور جنرل اختر عبدالرحمٰن کے بیٹے بھی کروڑ پتی اور ارب پتی ہو گئے ہیں ان کے دور کے مشہور جرنیلوں جنرل سوار خان اور جنرل جیلانی کی کروڑوں کی جائیدادوں کے قصے بھی لوگوں کی زبانوں پر عام تھے انہی کے دور کے وزیر خزانہ ڈاکٹر محبوب الحق نے انکشاف کیا کہ جنرل صاحب نے زرعی ٹیکس لگانے کا ارادہ اس لیے مؤخر کیا کہ اکثر جاگیریں بڑے جرنیلوں کی ہیں زرعی ٹیکس لگانے سے وہ ناراض ہو جائیں گے اس کے علاوہ مختلف سیاسی پارٹیوں نے بھی جرنیلوں کو پارٹی میں اہم عہدے اور وزارتیں اس لیے دینے شروع کر دیے ہیں کہ ان کے روابط دونوں طرف قائم رہ سکیں۔(۷۴)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مجموعی طور پر ضیاء دور بداعتمادی اور بدگمانی کی فضا کو مزید تقویت دینے کا باعث بنا سادہ لوح اسلام پسندوں کی قلیل تعداد کے علاوہ اہل پاکستان اور اقوام عالم نے ضیاء حکومت کے گیارہ سالوں کی کارکردگی کو ضیاء کی اقتدار کی ہوس کے تابع قرار دیا ایک غیر ملکی مبصر کے الفاظ ہیں:

> Recent experience bear out the fact that Islamization in various Muslim countries is basically motivated by political considerations. The military and conservative political elite seek to sustain and consolidate efforts to counter the challenge of western educated liberals and the left oriented politicians.(۷۵)

ضیاء کی موت

جنرل ضیاء کا ۱۱ سالہ دورِ حکومت ایک فضائی حادثے میں جنرل ضیاء کی موت پر اختتام پذیر ہوا جبکہ اس کے بعد پاکستان نے کئی جمہوری ادوار کا تجربہ کیا ملک پر باری باری دو بڑی پارٹیوں مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی نے حکومت کی مگر بنیادی حقوق اور سیاسی آزادیاں محلاتی سازشوں کی بھینٹ چڑھتی رہیں کئی دیگر اہم عوامل کے ساتھ ساتھ سب سے بڑا عامل فوجی قوت ہی قرار پاتی ہے۔ جناب ایس۔ ایم۔ ظفر کی رائے میں:

> جنرل ضیاء الحق کی اچانک موت پر یہ امکان تھا کہ شاید جنرل مرزا اسلم بیگ چیف آف دی آرمی سٹاف مارشل لاء لگا دیں گے لیکن غلام اسحاق جو سینٹ کے چیئرمین تھے انہوں نے بطور قائم مقام صدر کے اپنا عہدہ سنبھالا اور پھر انتخابات کروا دیئے گئے اس کے بعد ملک میں دو انتخابات ہوئے اور ۱۹۹۱ء میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم بنے لیکن ان کی اور غلام اسحاق خان صدر پاکستان کی آپس میں نہ بنی اور غلام اسحاق نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے ۱۸ اپریل ۱۹۹۳ء کو قومی اسمبلی تحلیل کر دی سپریم کورٹ آف پاکستان نے اسمبلی بحال کی لیکن پیپلز پارٹی نے اپنی حلیف جماعتوں کے ساتھ لانگ مارچ کا سلسلہ شروع کیا تو جنرل عبدالوحید خان چیف آف دی آرمی سٹاف نے مداخلت کی اور غلام اسحاق نے استعفیٰ دیا نواز شریف نے بطور وزیر اعظم اسمبلی برطرف کی اور حزب اختلاف نے اپنے لانگ مارچ کا پروگرام منسوخ کر دیا اور سب کچھ ۱۸ جولائی

نواز شریف حکومتوں کی آمد و رفت

اسمبلی تحلیل کی معجزات

۱۹۹۳ء کو ہو گیا۔ ۱۹۹۳ء میں ایک نگران وزیر اعظم معین قریشی جو پہلے امریکہ میں رہتے تھے نے حلف اٹھایا اور فوج کی زیر نگرانی انتخابات ہوئے جس کے نتیجہ میں محترمہ بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بنیں ۱۹۹۳ء سے اب تک اخبارات ٹرائیکا کا ذکر کرتے ہیں جس سے مراد صدر۔ وزیر اعظم اور چیف آف دی آرمی سٹاف ہوتا یا اگر اصطلاح استعمال نہیں کرتے تو "بڑوں کی میٹنگ" کا ذکر کرتے ہیں اس طرح افواج پاکستان ابھی تک سیاست میں شامل دکھائی دیتی ہیں۔(۷۶)

کسی قوم یا ملک کے عروج و زوال میں کلیدی کردار قیادت کا ہوتا ہے بدقسمتی سے پاکستان کو اہل قیادت میسر نہیں آ سکی جب رہبر ہی رہزن کا روپ دھار لیں تو پھر مستقبل پر تاریکی کے بادل چھا جاتے ہیں۔ جنرل ضیاء کے بعد جمہوریت کی آڑ میں سازش، بدعنوانی اور جوڑ توڑ کا جو کھیل جاری رہا وہ دراصل پاکستانی قیادت کے اسی بحران کا تسلسل ہے جو محمد علی جناحؒ کی وفات کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ ضیاء دور کے بعد پیش آنے والے واقعات پر مجاہد حسین تبصرہ کرتے ہیں:

> ۸۸ء کے بعد تشکیل پانے والا سیاسی منظر نامہ نواز شریف اور بے نظیر کے گرد گھومتا ہے حادثات اور بحرانوں سے بھرے ہوئے اس عشرہ (۸۸ء تا ۹۸ء) میں یہ دونوں شخصیات بار بار اقتدار حاصل کرتی رہیں اور اقتدار سے باہر نکالی جاتی رہیں۔ بے نظیر بھٹو برسرِ اقتدار آئیں اور مدت پوری کیے بغیر گھر بھیج دی گئیں۔ میاں نواز شریف دوسری بار اقتدار میں ہیں جبکہ اس سے پہلے انہیں بھی ایک بار قبل از وقت اقتدار سے علیحدہ کیا جا چکا ہے تینوں حکومتیں صدر غلام اسحاق خان اور فاروق احمد لغاری نے بدعنوانی اور بدانتظامی کے الزامات کے تحت برخاست کیں ان صدور مملکت کے عائد کردہ الزامات میں کتنا سچ تھا ابھی تک بہت کچھ عدالتی سطح پر ثابت نہیں کیا جا سکا۔
>
> جب پہلی بار ۱۹۹۰ء میں غلام اسحاق خان نے بے نظیر کی حکومت بدعنوانیوں کے الزامات کے تحت برخاست کی تو وہ حکومت کی اس روانگی کے بعد برسرِ اقتدار رہے لیکن پوری ریاستی قوت کے باوجود وہ بے نظیر کے خلاف کوئی ٹھوس شواہد اکٹھے نہ کر سکے اور محض چند بے جان قسم کے ریفرنس دائر کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ جنہیں بے نظیر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے عدالتوں میں بوگس ثابت کرنا مشکل نہیں تھا غلام اسحاق نے جب دوسری بار حکومت برخاست کرنے کا تجربہ کیا تو اس بار ان کا شکار میاں نواز شریف تھے اس حکومت پر بھی جو الزامات عائد کیے گئے وہ ویسے ہی الزامات تھے جو صدر اس سے پہلے بے نظیر حکومت پر عائد کر چکے تھے بے نظیر حکومت کے خاتمے کے بعد وہ تو برسرِ اقتدار رہے لیکن میاں نواز شریف کی برخاست شدہ حکومت کو جب سپریم کورٹ نے بحال کر دیا تو صدر اسحاق کو میاں نواز شریف کے ساتھ ہی تیسری قوت کی مداخلت کے بعد ہی گھر جانا پڑا اس لیے میاں نواز شریف کی حکومت پر عائد کیے گئے الزامات کو عدالتوں میں لے جانے والا کوئی نہ تھا واضح رہے کہ اس دوران برخاست شدہ حکومتوں کی خاموش طرفداری ان بیوروکریٹس نے کی جن کی وساطت سے سیاست دانوں اور حکمرانوں نے بدعنوانیاں کی تھیں ان بیوروکریٹس نے تمام شواہد اور حقائق یا تو ضائع کر دیے یا پھر ان کو اس حد تک مسخ کر دیا گیا کہ انہیں عدالتوں میں ثابت کرنا ناممکن ہو گیا۔(۷۷)

جدید دور میں ریاست بے حد مستحکم ادارہ قرار پایا ہے لیکن جب ریاست اور اس کے ادارے عوامی فلاح کی بجائے مفاد پرستوں کی آماجگاہ بن جائیں تو دیگر شعبہ ہائے زندگی میں کسی مثبت اور صحت مند روایت کی توقع کرنا عبث ہے پاکستان پر نصف سے زائد عرصے میں تو فوج نے حکومت کی ہے اور درمیان میں چہرے بدل بدل کر سیاستدان برسر اقتدار آتے بھی ہیں تو وہ "زخم کچھ اور کر گئی گہرا اے مسیحا تری مسیحائی" کے مصداق مایوسیوں اور بداعتمادیوں کا سامان کرتے رہے اور اب معاشرے کا حال یہ ہے کہ نہ انہیں جمہوریت سے کوئی امید ہے اور نہ مارشل لاء سے کسی نجات کی توقع۔ لوگ ایک ایسے جمگھٹے اور دھندلی فضا میں سانس لے رہے ہیں جہاں قومی وحدت، اتحاد و یگانگت، حب الوطنی اور باہمی اخوت کے جذبے سسک رہے ہیں۔ ان حالات میں اسلام اور اس کا نفاذ ممکن ہو تو کیسے؟ روشن خیال لبرل طبقات کے خوابوں کی جنت تعمیر ہو تو کیسے؟ بداعتمادی کی اس صورتحال میں معاشرہ اور اس کے ذہین افراد کسی فکری کشمکش سے ہی عاری ہوتے چلے جا رہے ہیں اگر پاکستان کے موجودہ حالات پر نظر ڈالی جائے تو قیادت کے سنگین بحران نے فکری اور نظریاتی کشمکش کا دروازہ ہی بند کر دیا ہے گو پاکستان میں ایک ایسا دور

گزرا ہے جب فکر کے سوتے خشک نہیں ہوئے تھے فکر و دانش کی کشمکش سے ہی قوموں کے لیے راستہ بنتا ہے لیکن بقول شاعر:

حادثے سے بڑھ کر سانحہ یہ ہوا
لوگ ٹھہرے نہیں حادثہ دیکھ کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حوالہ جات باب دوم

۱۔ شہاب، قدرت اللہ، شہاب نامہ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص:۴۳۸، ۴۳۹ (مذکورہ اقتباس شہاب صاحب نے محترمہ فاطمہ جناح کی کتاب My Brother غیر مطبوعہ کے مسودے سے نقل کیا ہے جبکہ شہاب صاحب کے خیال میں بعض سیاسی احتیاطوں کے باعث یہ کتاب شائع نہیں کی گئی)

۲۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، اشارات، ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، فروری ۱۹۵۶ء، ص:۱۱، ۱۲

۳۔ آزادی منزل بہ منزل، سیارہ ڈائجسٹ گولڈن جوبلی نمبر، اللہ والا پرنٹرز، ریواز گارڈن لاہور، ۱۹۹۷ء، ص:۴۱ (مصنف ادارہ خود ہے)

۴۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، اشارات، ترجمان، نومبر ۱۹۵۵ء، ص:۲

۵۔ المجاہد، پروفیسر شریف، رواداری سے گریز، پاکستانی معاشرہ اور عدم رواداری، تالیف حسن عابدی، مشعل عثمان بلاک نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص:۹۸، ۹۹

۶۔ صدیقی، نعیم، قرارداد مقاصد اور ہمارے حکمران، ترجمان، لاہور، اکتوبر ۱۹۴۹ء، ص: ۳۲۵

۷۔ پاکستان ٹائمز، ۹ دسمبر ۱۹۴۹ء

۸۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، اشارات، ترجمان، لاہور، مارچ ۱۹۵۶ء، ص:۲

۹۔ الطاف گوہر، ایوب خان، فوجی راج کے پہلے دس سال، سنگ میل، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص: ۸۰، ۸۱

۱۰۔ زیدی، سید مسعود، پاکستان کا مقدمہ، کلاسیک لاہور، ۱۹۸۸ء، ص:۷۱، ۷۲

۱۱۔ رحمان، آئی اے، مضمون "مذہبی تعصب پاکستانی معاشرہ اور عدم رواداری"، ص: ۳۴، ۳۵

۱۲۔ جالبی، ڈاکٹر جمیل، پاکستانی کلچر، نیو مجاز پریس، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص:۱۹۸، ۱۹۹

۱۳۔ شہاب، قدرت اللہ، شہاب نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص:۶۳۹، ۶۴۰

۱۴۔ ایضاً، ۶۴۴

۱۵۔ ظفر، ایس ایم، ڈکٹیٹر کون؟ الفیصل ناشران وتاجران کتب، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص:۴۴

۱۶۔ صدیقی، پروفیسر عبدالحمید، پاکستان میں نظریاتی کشمکش، چراغ راہ، نظریہ پاکستان نمبر، کراچی، دسمبر ۱۹۶۰ء، ص:۲۷۲

۱۷۔ ظفر، ایس ایم، ڈکٹیٹر کون؟، الفیصل ناشران وتاجران کتب، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص:۴۶، ۴۷

۱۸۔ آزادی منزل بہ منزل، سیارہ ڈائجسٹ پاکستان، گولڈن جوبلی نمبر، ریواز گارڈن لاہور، ۱۹۹۷ء، ص:۴۲

۱۹۔ شہاب، قدرت اللہ، شہاب نامہ، ص:۷۴۱

۲۰۔ خرم مراد، مسائل وافکار، البدر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص:۵۱، ۵۲

۲۱۔ Justice (Retd) Gul Mohammad Khan, Quest for Islamization, Pakistan Study Center Punjab University, Lahore, 1999, P:3

۲۲۔ الطاف گوہر، لکھتے رہے جنوں کی حکایت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص:۴۶

۲۳۔ فرید احمد، مولوی فرید احمد کی ڈائری، فرنٹیئر پوسٹ پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص:۱۳

۲۴۔ شہاب نامہ، ص:۷۲۲

۲۵۔ مولوی فرید احمد کی ڈائری، ص:۲۸، ۲۹

۲۶۔ ایضاً، ص:۳۱

۲۷۔ گوہر، وسیم، گواہی، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص:۲۰، ۲۱

۲۸۔ روزنامہ امروز، ۲۵ فروری ۱۹۶۰ء، بحوالہ ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۶۰ء

۲۹۔ ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، اپریل، ۱۹۶۰ء، ص:۹

۳۰۔ شہاب نامہ، ص: ۱۰۳۱

۳۱۔ ظفر، ایس ایم، ڈکٹیٹر کون؟، مکتبہ اردو ڈائجسٹ، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص:۲۱۷

۳۲۔ شہاب نامہ، ص: ۱۰۳۴

۳۳۔ سیارہ ڈائجسٹ، پاکستان گولڈن جوبلی نمبر، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص:۵۰

۳۴۔ ڈکٹیٹر کون، ص: ۲۱۹، ۲۲۰

۳۵۔ سیارہ ڈائجسٹ، ص:۵۲

۳۶۔ شہاب نامہ، ص:۸۱۹

۳۷۔ الطاف گوہر، لکھتے رہے جنوں کی حکایت، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص: ۷۳، ۷۴

۳۸۔ عبدالرشید، راؤ، جو میں نے دیکھا، آتش فشاں پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص:۷۳

۳۹۔ میرا سیاسی سفر، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص:۲۵۱

۴۰۔ ایضاً، ص:۲۷۱

۴۱۔ شہاب نامہ، ۱۰۳۷

۴۲۔ ظفر، ایس ایم، ڈکٹیٹر کون، ص:۶۵

۴۳۔ حسن محمود، مخدوم زادہ، سید، میرا سیاسی سفر، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص: ۲۶۹، ۲۷۰

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۴ -ایضاً، ص:۲۷۱

۴۵ -ظفر، ایس ایم، ڈکٹیٹر کون، ص:۶۶

۴۶ -گوندل، اقبال، ہماری سیاست اور اکیسویں صدی، آزاد انٹر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص:۲۹

۴۷ -گوندل، اقبال، ایضاً، ص:۳۲

۴۸ -گوہر، وسیم، گواہی، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص:۱۷، ۱۸

۴۹ -میرا سیاسی سفر، ص:۲۸۴

۵۰ -الطاف گوہر، لکھتے ہیں جنوں کی حکایت، ص: ۲۶۲

51- Satish Kumar, The New Pakistan, Allah wala Printers, The Mall, Lahore, 1987, P:330

۵۲ -رفیق ڈوگر، سیاسی ملاقاتیں، انٹرویو حنیف رامے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص:۱۳۶

۵۳ -سیارہ ڈائجسٹ، پاکستان گولڈن جوبلی نمبر، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص: ۷۰، ۷۱

۵۴ -شامی، مجیب الرحمٰن، اداریہ ہفت روزہ اسلامی جمہوریہ، رانا چیمبرز، پرانی انار کلی، لاہور، اپریل ۱۹۷۷ء، ص:۳

۵۵ -حسن محمود، مخدوم زادہ، سید، میرا سیاسی سفر، ص:۲۸۶

۵۶ -سیارہ ڈائجسٹ، ص:۴

۵۷ -ایضاً، ص:۷۷

۵۸ -میرا سیاسی سفر، ص:۲۸۱، ۲۸۲

۵۹ -ڈکٹیٹر کون، ص:۷۰

۶۰ -سیارہ ڈائجسٹ، ص:۷۶

61- Surendra Nath Kaushik, Politics of Islamization in Pakistan, South Asian Publishers PVT, Ltd, New Delhi, 1993, P:182

۶۲ -شامی، مجیب الرحمٰن، آواز خلق پبلیکیشنز لاہور بعنوان آئینہ مرد مومن۔ مرد حق، ص: ۷، س۔ن

۶۳ -خرم مراد، مسائل وافکار، البدر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص:۱۰۳، ۱۰۴

۶۴ -شوکت علی، موجودہ سیاسی صورتحال اور پاکستان کا مستقبل، مزدور کسان پبلشرز، فرید کوٹ روڈ، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص:۱۱۲

۶۵ -عبدالرشید، راؤ، جو میں نے دیکھا (راؤ رشید سے منیر احمد منیر کا انٹرویو)، آتش فشاں پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص:۲۶۴

۶۶ -آغا غلام نبی پٹھان سے منیر احمد منیر کا انٹرویو، سیاسی جوار بھاٹا آتش فشاں پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص:۱۳۳

۶۷ -جعفر احمد، ڈاکٹر، ارتقاء، ارتقاء مطبوعات، ۱۰-۹ ولایت آباد نمبر ۲ منگھو پیر روڈ کراچی، اکتوبر ۱۹۹۴ء، ص:۲۵، ۲۶

۶۸ -رحمٰن، آئی اے، مذہبی تعصب، پاکستان معاشرہ اور عدم رواداری، تالیف حسن عابدی، مشعل لاہور، ۱۹۹۷ء، ص:۳۵

69-The News International, July 4, 2000

۷۰ -سیارہ ڈائجسٹ، ص:۸۰

۷۱ -حسن محمود، مخدوم زادہ، سید، میرا سیاسی سفر، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص:۳۰۲

۷۲ -اصغر خان، صدائے ہوش، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص:۸۹

۷۳ -ایضاً، ص:۹۳

۷۴ -راٹھور، افضال مظہر، ملک لوٹنے والے چہرے، اے ایچ (A.H) پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص: ۴۱، ۴۲

75-Sarendra Nath Kaushik, Politics of Islamization in Pakistan, South Asian Publishers PVT, Ltd, New Delhi, 1993, P:194

۷۶ -ظفر، ایس ایم، ڈکٹیٹر کون، ص:۲۱۸

۷۷ -مجاہد حسین، کون بڑا بد عنوان، پرنٹ لائن پبلشرز، لیک روڈ پرانی انار کلی، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص:۳۳، ۳۴

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب سوم

پاکستان میں لبرل ازم کا فروغ

فصل اول: پاکستان کا سیاسی کلچر

فصل دوم: میڈیا(Media)اور لبرل ازم

فصل سوم: لبرل ازم کے فروغ میں این جی اوز کا کردار

فصل چہارم: تحریک آزادئ نسواں

فصل پنجم: نظامِ تعلیم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فصل اول

پاکستان کا سیاسی کلچر

ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں جہاں پاکستان کی تصویر کا ایک رخ پریشان کن اور پریشان حال ہے وہاں سخت نامساعد حالات میں پاکستان کا قائم رہنا بھی کسی معجزے سے کم نہیں۔ یہ درست ہے کہ پاکستان اپنے نظریے سے ہم آہنگ خوابوں کی تعبیر سے محروم ہے لیکن جیسی قیادت پاکستان کو گزشتہ برسوں میں ملی اور عالمی سطح پر پاکستان دشمنی کے جو منصوبے بنے ان کا ادراک حاصل ہو تو تشکر کے جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں کہ پاکستانی معاشرہ سامراجی تہذیب اور افکار و نظریات کے لیے نرم چارہ بھی نہیں بنا۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی لبرل اور سیکولر عناصر نے بیک وقت کئی محاذوں پر منصوبہ بندی سے کام کا آغاز کیا جس کے سب سے نمایاں اثرات حکمرانوں اور سیاسی قیادت پر مرتب ہوئے اور شاید پاکستان کا مسئلہ نمبر ایک صالح اور نظریہ پاکستان کی صحیح ترجمان قیادت کا فقدان ہے۔ قیادت کے علاوہ دوسرا اہم مسئلہ سیاسی نظام کی ناکامی ہے یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ بجائے خود ہمارے ہاں سیاسی نظام ناکام نہیں ہوا بلکہ کسی سیاسی نظام کو نشوونما پانے کا موقع نہیں دیا گیا سیاسی نظام کے علاوہ معاشرتی سطح پر بھی پاکستان میں نہ تو اسلامی معاشرہ تشکیل پایا ہے اور نہ ہی روشن خیال یا لبرل تہذیب سو فی صد کامیاب ہو سکی ہے۔ اہل پاکستان ایک مخلوط کلچر اور معاشرے میں سانس لیتے چلے آئے ہیں البتہ ہم وہ نہیں ہیں جو ہمیں ہونا چاہیے تھا۔ معروف سکالر خرم مراد کی رائے میں تبدیلی لانے کے لیے، خواہ وہ کسی ذریعہ سے ہو، یہ ضروری ہوگا کہ معاشروں کا تجزیہ کرنے کے بعد ان مختلف عناصر اور طاقتوں کا تعین کیا جائے جو طاقت کی تقسیم و استعمال میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں یہ پاور اسٹرکچرز مختلف معاشروں میں مختلف ہو سکتے ہیں مثلاً معاشی اور سماجی تعلقات، برادریاں، فوج، بیوروکریسی وغیرہ۔(۱)

معاشرے کا صحیح تجزیہ کرنا ایک ایسی ذہنی آزادی اور اعتماد کا متقاضی ہے جس سے پاکستانی معاشرہ محروم چلا آرہا ہے چنانچہ جب مسائل کی صحیح نشاندہی ہی نہ ہو سکے تو ان کا حل کیسے ممکن ہو سکتا ہے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سچ کا یہی ڈر پیر تسمہ پا بن کر آج ہمارے معاشرے کے کاندھوں پر سوار ہے اس ڈر نے فرد کو اتنا کمزور کر دیا ہے کہ آج وہ ہر اس بات کے اظہار سے خائف ہے جسے وہ صحیح جانتا ہے اور جو اسے ذرا سا بھی نقصان پہنچانے کی قوت رکھتی ہے۔ اس بیماری میں معاشرے کا ہر ادنیٰ و اعلیٰ مبتلا ہے۔ جہاں فرد اتنا کمزور ہو گیا ہو، جہاں خوف اور عدم تحفظ کے احساس نے فرد کو اتنا بزدل اور ناکارہ بنا دیا ہو وہاں قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ آخر کیسے اہمیت اختیار کر سکتا ہے اس طرز عمل کا اثر یہ ہے کہ فرد کو اجتماعی کاموں سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی ہے اور وہ عدم دلچسپی، بے تعلقی اور خوف کی چادر تانے حالت بیماری میں آرام کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

اسی لیے جب میں یہ کہتا ہوں کہ ذہنی آزادی کلچر کی تشکیل اور اس کی نشوونما کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں سچائی کے اظہار پر ایمان رکھتا ہوں اور صداقت کے ہر رخ کو توجہ سے دیکھنے کا دل سے قائل ہوں۔ کسی کلچر کے لیے ذہنی آزادی کی اہمیت یہ ہے کہ تخلیقی روح اور معاشرتی و تہذیبی یک جہتی اسی کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اسی عمل کے ساتھ قوم کے افراد کنویں کی چاردیواری سے باہر نکل کر کھلی فضا میں سانس لیتے ہیں۔(۲)

ذہنی آزادی ہی دراصل مسائل کے ادراک کی صلاحیت پیدا کرتی ہے لیکن پاکستانی معاشرے میں معاشی و معاشرتی ناہمواریوں اور سیاسی و مذہبی استحصال نے جبر کے ایک ایسے نظام کو مستحکم کیا ہے جس میں ہر فرد محض اپنی ذات کے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے نفسا نفسی کے اس عالم میں اگر اسلام اور نظریہ پاکستان کے علمبردار اپنی منزل کھوٹی کیے بیٹھے ہیں تو لبرل اور سیکولر اپنی جگہ شکست کے اسباب پر غور کر رہے ہیں۔ زاہد اسلام کی رائے قابل غور ہے:

> پاکستان کی ترقی پسند تحریک کی سبھی ٹکڑیاں یعنی سوشلسٹ، کمیونسٹ، قوم پرست سماج دشمن حلقے، ٹریڈ یونین، طلباء، دانشورانہ تحریکیں، فکری و نظریاتی اور تنظیمی انتشار اور بحران کی زد میں ہیں اندرونی کھوکھلا پن آشکار ہو گیا ہے تو بددلی،

> مایوسی، بے عملی اور معاشرے سے کٹے ہونے (Isolation) کا احساس نمایاں ہوا ہے۔(۳)

زاہد اسلام ترقی پسند تحریک کی جن ٹکڑیوں اور تنظیمات کا ذکر کرتے ہیں ان میں قدرِ مشترک اگر کوئی ہے تو وہ روشن خیالی یعنی لبرل ازم ہے جس نے پاکستانی معاشرے کو اپنا ہدف قرار دے کر کئی محاذوں اور کئی تنظیموں کی آڑ میں اپنا سفر جاری رکھا۔ پاکستان کے معروف لبرل مفکر سی آر اسلم ترقی پسند تحریک کے لائحہ عمل کا اظہار کرتے ہیں:

> پاکستان میں بنیادی صنعتوں کا فقدان ہے ٹیکنالوجی کی فراہمی مفقود ہے، سائنسی علوم ناپید ہیں، حالات کی یہ صورت بڑی بھیانک ہے اور حالات کی اسی صورت کا تقاضا ہے کہ پاکستان کے سماج میں تشکیلِ نو کا عمل شروع کیا جائے یعنی فرد کے ذہن کو قدامت پسندی، روایت پسندی اور رجعتی نظریات سے آزاد کیا جائے اور اس کے ذہن کو سیکولر خیالات کی روشنی سے منور کیا جائے۔(۴)

اس لبرل اور سیکولر مکتب فکر کے برعکس ٹھیٹھ اسلامی نظام زندگی اور اسلامی تہذیب کے نفاذ کی دعویدار جماعت اسلامی کے مفکر جناب خرم مراد جہاں اسلامی نظام کو پاکستان کے مسائل کا حل اور حقیقی منزل قرار دیتے ہیں وہاں اس کی راہ میں حائل رکاوٹوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> اسلامی نظام کی راہ میں اصل رکاوٹیں میرے خیال میں دو ہیں ایک تو مغرب سے متاثر اور مرعوب ذہن اور دوسرے خواہشات کی پیروی کا مرض۔ مغرب زدہ ذہن جس شعبے میں بھی ہو، اسلام کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کا کام کرتا ہے اور خواہشات کی پیروی کا روگ اسلام سے جذباتی وابستگی رکھنے والوں کو بھی اس راہ میں قربانی دینے اور خطرہ مول لینے سے دور رکھتا ہے یہ بیماریاں فوج اور بیوروکریسی کی طرح خود عوام کو بھی اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنا سکتی ہے۔(۵)

خرم مراد جن رکاوٹوں اور بیماریوں کا ذکر کرتے ہیں ایک مغربی تہذیب کی مرعوبیت اور دوسرا خواہش کی پیروی یہ دراصل لبرل ازم یا مادیت کی ہی علامات ہیں تاہم قابل غور امر یہ ہے کہ پاکستان کے لبرل یا ترقی پسند تو کھلم کھلا اسی کا پرچار کرتے ہیں مگر عوام اور کہیں کہیں مذہبی عناصر بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مادیت کا شکار ہوتے ہیں اور لبرل رویوں کا اظہار کرتے ہیں اس لیے یہ سمجھا جانا چاہیے کہ لبرل ازم دراصل ایک ایسے رویے کا اظہار بن کر سامنے آتا ہے جس میں انسان لبرل ازم کے خلاف ہو کر بھی اسی کا نمائندہ اور سفیر بنتا ہے جب وہ مادیت کے تقاضوں کو اپنی زندگی کی ترجیح اول بنا لیتا ہے۔ پاکستان کی نظریاتی سطح اور اساس نصابی اور علمی طور پر تو زندہ رہی ہے مگر عملی طور پر پاکستانی معاشرے پر مادیت اور لبرل ازم کی تحریکات نے بڑے کاری وار کیے ہیں کہیں کوئی لبادہ اوڑھ کر، عنوانات بدل کر اور خوش کن نعروں کی آڑ لے کر اور کہیں ترقی پسندی، آزادی، مساوات اور حقوق کے نعروں کے ساتھ بالکل بے نقاب ہو کر۔ لبرل ازم کی یلغار کئی کمین گاہوں، پناہ گاہوں اور محاذوں سے جاری رہی ان میں سے چند نمایاں محاذوں کا ہم ذکر کریں گے۔

ا۔ سیاسی جماعتیں

پاکستان کی درجنوں سیاسی جماعتوں کا پاکستان میں لبرل ازم کے نفوذ کے حوالے سے کیا کردار رہا ہے ہمارے پیش نظر یہ سوال ہے نہ کہ سیاسی جماعتوں کا تفصیلی تعارف اور کارکردگی۔ اس تناظر میں سیاسی جماعتوں کو درج ذیل اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1. وہ مذہبی گروہ اور جماعتیں جو اسلام کو مکمل ضابطہ حیات قرار دے کر اس کے نفاذ پر زور دیتی ہیں اور لبرل ازم یا کسی بھی اور ازم کی راہ میں شدت سے مزاحم رہی ہیں۔
2. وہ سیاسی جماعتیں جو پاکستانی معاشرے کے مذہبی رجحان یا مذہب سے جذباتی وابستگی کے باعث اسلام کا نام نعرے کے طور پر لیتی ہیں اور عملی جدوجہد میں ان کا اسلامی رنگ ایک نعرے سے زیادہ نہیں بلکہ بارہا ان کا وزن لبرل پلڑے میں ہی رہا ہے۔
3. وہ سیاسی جماعتیں جن کے بارے میں بائیں بازو کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے یا ترقی پسند طبقات کی نمائندہ ہیں اور واضح طور پر ایک لبرل معاشرے اور حکومت کی تشکیل کا نعرہ بھی لگاتی ہیں اور سرگرم عمل بھی ہیں اگرچہ مذہب سے اعلانیہ بے زاری کا اعلان کرنے سے گریزاں ہیں۔

حالات کی ستم ظریفی یہ ہے کہ پہلی اور تیسری قسم کی جماعتوں کو تاریخ پاکستان میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی جبکہ دوسری قسم کی جماعتوں کا عوام میں نفوذ بھی ہے اور قوت کے

سرچشموں سے ان کا ہی تعلق بھی ہے اس کا ایک مطلب تو یہ بھی لیا جانا چاہیے کہ یہی جماعتیں پاکستانی عوام اور معاشرے کی نفسیات اور مزاج کے قریب تر ہیں کیونکہ پاکستانی عوام مذہبی جذبات تو رکھتے ہیں لیکن دین کے مکمل ضابطہ حیات اور قابل عمل ہونے کے فہم سے عاری ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا یہ سیکولر اور روشن خیال عناصر کی کامیابی ہے یا مذہبی تنظیموں اور جماعتوں کی بے حکمتی اور ناکامی — معاشرہ اسلام کے علاوہ کسی اور نعرے کو سننے کا روادار نہیں اور اسلام کے نام پر فریب کھانے کے لیے ہمیشہ تیار بھی رہا ہے تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ غیر اسلام کو بھی اس معاشرے میں اسلام کے طور پر منوانا مشکل نہیں۔ پاکستان کی نسبتاً کامیاب سیاسی جماعتوں مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کی کارکردگی کا بے لاگ تجزیہ واحتساب کیا جائے تو دونوں نے اسلام کا نام ہمیشہ لیا ہے مگر ان کی صفوں میں ہی لبرل ازم کا رویہ اسلام سے زیادہ توانا اور مستحکم بھی ہوا ہے۔ پروفیسر محمد عثمان پاکستان کی سیاسی جماعتوں کی درجہ بندی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

پاکستان کی آبادی شدید مذہبی رجحان رکھتی ہے اس لیے اپنی سیاست میں اسلام کی معاشرتی، معاشی اور اخلاقی قدروں کو رائج دیکھنے کی آرزومند ہے اور مذہب سے بے تعلق، مذہب بے زار سیاست کی طرف اس کا میلان کم ہے اس رجحان کی نمائندگی مختلف طریق اور مختلف انداز سے ہو رہی ہے کچھ جماعتیں پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ کی طرح سیاست کو معروف جمہوری بنیادوں پر استوار کرنا چاہتی ہیں مگر وہ آبادی کی خواہش اور اسلام کی فیض رسانی کے پیش نظر اسلامی اصولوں کو اپنی سیاست کا راہنما دیکھنے میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھتیں۔ آپ ایسی جماعتوں کو سیاسی مذہبی جماعتیں کہہ سکتے ہیں کچھ جماعتیں اصلاً دینی ہیں اور سیاست کو دین کے حوالے سے دیکھتی ہیں اور دین کے حوالے ہی سے سیاست کو چلانا چاہتی ہیں ایسی جماعتوں کو آپ اپنی دینی سیاسی جماعتوں کا نام دے سکتے ہیں۔ کچھ جماعتیں ہیں جو سیاست اور دین کے باہمی تعلق کی گزشتہ ۴۰ سالہ تاریخ سے مایوس ہو کر خود کو سیکولر کہنا زیادہ مناسب خیال کرتی ہیں یہ جماعتیں بھی اسلام سے بیزار یا بے تعلق نہیں ان کے راہنما اسلام کی حقانیت کے قائل ہیں اور اسلام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی فیض رسانی سے بھی انہیں انکار نہیں مگر جو کچھ اسلام یا نفاذِ اسلام کے نام سے گزشتہ تین چار دھائیوں میں ہوا ہے اس کے پیشِ نظر وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پاکستان کی سیاست کو قدم قدم پر مذہب کے حوالے سے نہیں معروف جمہوری حوالوں سے آگے بڑھنا چاہیئے اور سیاست کے میدان میں دین کے استحصال کی روش ترک کر دینی چاہیے اور ریاست کو مذہبی امور میں مداخلت کا حق نہیں دینا چاہیے ایسی جماعتوں کو آپ سیکولر مذہبی جماعتوں کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔

اور پھر ایسی جماعتیں بھی ہیں جن کی تنظیم بنیاد کے اعتبار سے بائیں بازو سے تعلق رکھتی ہیں یہ لوگ طبقات کی موجودگی کو ہماری زندگی کی اولین حقیقت تسلیم کرتے ہیں اور طبقاتی جدوجہد میں ایمان رکھتے ہیں اور ملک کی سیاست کو سوشلسٹ خطوط پر چلانے کے داعی ہیں یہ لوگ بھی لازماً مذہب کے خلاف نہیں اور تحریکِ پاکستان میں اسلام کے حصے اور کردار سے بھی انہیں انکار نہیں مگر ان کا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں جب ملک واضح طور پر طبقات میں بٹا ہوا ہے غریب اور پس ماندہ طبقوں کی نجات اس میں ہے کہ ملکی سیاست کو اشتراکی بنیاد پر اٹھایا جائے ایسی جماعتوں کو بائیں بازو کی (یا سوشلسٹ) جماعتیں کہنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔

پھر وہ جماعتیں ہیں جو مذہب کو ساتھ لے کر چلتی ہیں مگر ان کے اندر بائیں بازو کے رجحانات بھی ہیں یہ جماعتیں مذہب سے بے تعلق نہیں اور عوام کے مذہبی رجحانات کا احترام کرتی ہیں مگر انہیں طبقات کا احساس بھی ہے اور جدید دور میں سرمایہ دارانہ معیشت و سیاست کے مقابلے میں جو انسانی خدمات سوشلزم نے انجام دی ہیں ان کی افادیت بھی ان کے پیشِ نظر ہے بلاشبہ یہ جماعتیں اپنے اندر سبھی طبقات کو سمیٹے ہوئے ہیں ان میں جاگیر دار بھی اور بڑے بڑے زمیندار بھی اور کچھ بڑے سرمایہ دار اور صنعت کار بھی عیاں یا در پردہ ان کے ساتھ ہیں اور دینداروں کا بھی ایک خاصہ طبقہ ان جماعتوں میں کام کرتا ہے تاہم مزدور، کسان،

عام محنت کش اور غریب طبقے بھی ان جماعتوں میں خاص اہمیت کے حامل ہیں آپ ایسی جماعتوں کو ترقی پسند مذہبی جماعتوں کا نام دے سکتے ہیں۔(۶)

مذکورہ بالا تبصرے سے جزوی اختلاف کا امکان تو ہے تاہم سیاسی جماعتوں پر بھرپور اور جامع تبصرے کے باوجود یہ پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں کی فہرست نہیں ہے جماعتیں واضح طور پر مذہب سے لاتعلقی کا اظہار نہیں کرتیں۔ چاہے ترقی پسند اور لبرل ہی کیوں نہ ہوں تو یہ پاکستانی معاشرے کی جذباتی کیفیت کی وجہ سے ہے جو نعروں کی حد تک ہی سہی مگر مذہب پسندی کی نمائندہ ہے مگر محض نعرے بازی قومی تعمیر اور ترقی کی بنیاد فراہم نہیں کرتی مشہور ادیب انتظار حسین کی رائے میں:

> سیاست برحق، مگر ایک سیاست وہ ہوتی ہے جو سیاسی فکر سے جنم لیتی ہے اور ایک سیاست وہ ہوتی ہے جو نعروں کی پیداوار ہوتی ہے ویسے تو سیاسی عمل میں نعرے کا بھی اپنا ایک مقام ہوتا ہے لیکن جب نعرے ہی نعرے ہوں تو جان لینا چاہیئے کہ سیاسی فکر کو لمبا اور کٹھن راستہ جان کر نعرے کو شارٹ کٹ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے اس صورت میں نعرہ ہر قسم کی فکر اور سوچ کی نفی اور تشدد کی ایک صورت بن جاتا ہے جو سیاست نعروں سے جنم لے اس کا منطقی انجام عقوبت خانے ہی ہونا چاہیئے۔(۷)

پاکستان کے تن آسان اور آرام طلب معاشرے میں فکر و دانش کے لیے ناسازگاری کی فضا ہے چنانچہ پاکستان کی سیاسی جماعتوں کا غالب کلچر نعرے بازی اور بیان بازی پر مبنی ہے ایک عظیم اور موثر گروہ وہ ہے جس کی سیاست تاریخ پاکستان میں کسی ایک سیاسی جماعت اور نظریے تک محدود نہیں رہی بلکہ ان کا اصل سرچشمۂ فکر "نظریہ ضرورت" ہے جو ہمیشہ ان کے مفادات کے تابع رہا ہے یہ مفادات اگر اسلام کے نعروں سے حاصل ہوں تب بھی اور لبرل ازم اور سیکولر نعروں سے حاصل ہوں تب بھی اس طبقے نے اپنی سیاست کو مفاد کی عینک سے ہی دیکھنا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی جو پاکستانی معاشرے میں ذہنی آزادی کے فقدان کو عظیم المیہ قرار دیتے ہیں لکھتے ہیں:

> سیاسی جماعتیں عام طور پر مفاد پرستوں کی ٹولیاں بن کر رہ گئی ہیں نہ ان کے پاس کوئی پروگرام ہے اور نہ براہِ راست عوام اور ان کی خواہشات سے ان کا کوئی تعلق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے اب خدمت سیاسی زندگی کا معیار نہیں رہی اور اسی لیے ذہنی آزادی کی نہ انہیں ضرورت ہے اور نہ وہ اس کا مطالبہ کرتے ہیں نئی قیادت ذہنی آزادی کے نہ ہونے کے سبب پروان نہیں چڑھ رہی ہے۔(۸)

پاکستان کی سیاسی تاریخ شاہد ہے کہ کم و بیش ساری سیاسی جماعتیں دو چہرے رکھتی ہیں ایک چہرہ عوام کے لیے اور دوسرا جوڑ توڑ، سازش اور زیر زمین سیاست کے لیے درجہ بندی کے اعتبار سے بظاہر کچھ جماعتیں کم تضادات کی حامل ہوں مگر پاکستان کے مروجہ سیاسی کلچر میں بالعموم سیاسی جماعتوں کے معاملات داخلی طور پر بھی صاف اور شفاف نہیں ہیں پاکستان کی سیاست میں عوام کا نام صرف رسم اور نمائش کے لیے استعمال ہوتا ہے جب کہ سیاسی عمل میں عوام کو بانجھ کرنے کا ہر حربہ بے دریغ استعمال ہوتا ہے پاکستان کی سیاست میں عوام کے مقدر تراشنے والے تاریخی فیصلے عوام سے ہمیشہ خفیہ رکھے گئے ہیں آج ان فیصلوں کے جال میں جس طرح عوام الجھ چکے ہیں بجائے ان سے نجات کی کوئی راہ سمجھانے کے، سیاست پہلے کی نسبت زیادہ استحصال کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔(۹)

اس تناظر میں معروف عالم دین ڈاکٹر اسرار احمد درج ذیل تجزیہ کرنے میں حق بجانب ہیں وہ لکھتے ہیں:

> دین کے سیاست کے ساتھ حقیقی لگاؤ کا جائزہ لینا ہو تو اولاً عوام کو دیکھئے کہ ان کی ایک عظیم اکثریت اس سے ایک سطحی محبت رکھنے کے سوا نہ اس سے کوئی ذہنی مناسبت رکھتی ہے نہ عملی تعلق۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام کے قیام کے لیے محضر ناموں پر دستخط کرنے کے لیے تو یہ ہر وقت تیار ہوتے ہیں لیکن اپنے ذاتی یا گروہی مفادات کا معاملہ آجائے تو اسلام کے بڑے سے بڑے حکم کو پس پشت ڈال دینا اور اس کی تمام حدود کو پھلانگ جانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پھر چونکہ اس ملک کی سیاسی قوت کا سرچشمہ بہر صورت یہی عوام ہیں لہٰذا سیاست کے میدان میں اسلام کا نام خواہ کتنا بھی لیا جاتا ہو اور اس کے کیسے ہی بلند نعرے لگائے جاتے ہوں واقعہ یہ ہے کہ اصل سکہ یہاں یا تو خالص سیاسی مفاد کا چلتا ہے یا جاگیرداروں اور قبیلوں کی اقتدار طلبی اور رسہ کشی کا۔(۱۰)

پاکستانی سیاست مفادات کے تابع ہونے کے باعث انتشار کا شکار بھی رہی ہے اور بے یقینی میں مبتلا بھی۔ تحریک استقلال کے سربراہ ایئر مارشل اصغر خان کہتے ہیں:

> پاکستان میں سیاسی فضا آج جتنی غیر یقینی ہے اور پچھلے چند سال سے جمہوری عمل میں بہتری کے امکانات جتنے محدود ہو چکے ہیں ملکی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوئے پاکستان میں ایک طرف فوج کی سیاست میں مداخلت جمہوریت کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ رہی ہے دوسری طرف علاقائی اور نظریاتی گروپوں میں منقسم پارٹیاں بھی ایک اہم عنصر ہیں انہوں نے مختلف علاقوں کے عوام کو اکٹھا کرنے میں اہم کردار ادا کیا سیاسی اداروں کے درمیان نظریاتی اتحاد ایک ایسی مجتمع کرنے والی قوت ہے جو عوام کے درمیان کوئی اور قدر مشترک نہ ہونے کی صورت میں بھی انہیں ایک دوسرے کے قریب لانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔(۱۱)

اصغر خان پچھلے کئی عشروں سے پاکستانی سیاست میں نمایاں نام ہیں۔ ریٹائرڈ ایئر مارشل کی حیثیت سے فوج کے ادارے کے کام، اغراض و مقاصد اور حدود ان سے پوشیدہ نہیں پاکستان میں حکومتی سطح پر مختلف ادوار میں اور مذہبی سیاسی جماعتوں کی جدوجہد کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ اسلام کا نام استعمال کرتے ہوئے اس حقیقت سے چشم پوشی کی جا رہی ہے کہ سماجی و اقتصادی انصاف اور شہریوں کی انفرادی آزادیوں کو یقینی بنائے بغیر کوئی معاشرہ اسلامی نہیں ہو سکتا۔ آج کا پاکستان سماجی اور اقتصادی میدان میں انصاف و مساوات سے تو دور ہے مگر جہاں تک انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کا تعلق ہے حکومت نے ملک کو ان قدروں سے بہت پیچھے دھکیل دیا ہے جو ایک اسلامی معاشرے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔(۱۲)

پاکستان کی سیاسی جماعتیں اپنی لبرل اور سیکولر ترجیحات کو بھی اسلام کے تاثر کے بغیر پیش نہیں کرتیں جیسا کہ تحریکِ استقلال کو ہمیشہ ایک سیکولر پارٹی سمجھا گیا ہے نیز اس کا وزن جتنا بھی ہے زیادہ تر لبرل طبقے کے پلڑے کا حصہ بنا ہے مگر اس فکر اور طرز کے سیاستدان پاکستانی معاشرے کو چند منتخب نعروں کو اسلام سے جوڑ کر روشن مستقبل کی نوید سناتے ہیں مگر بھول جاتے ہیں کہ اسلام ایک کل ہے جس کی جزئیات کو منتشر کر کے مؤثر نتائج حاصل نہیں ہو سکتے جیسا کہ شہری آزادی انصاف،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مساوات وغیرہ کے نعرے اسلامی نظام حیات کو بنیاد بنا کر بلند تو کیے جا سکتے ہیں مگر ان کو اقدار کے طور پر نافذ کرنے کے لیے جس فکری اور نظریاتی اساس اور تربیتی اداروں کی ضرورت ہے ان کے بغیر یہ بھی کارِ لاحاصل ہی ہے۔ کسی معاشرے میں فکری اور نظریاتی تربیت کے بغیر کسی بھی شعبہ زندگی میں دیرپا ترقی یا خوشگوار تبدیلی ناممکن ہے پاکستان میں یہی کچھ ہوا سیاسی و مذہبی جماعتوں میں فکر و دانش اور نظریاتی تربیت کے لیے ہمیشہ دروازے بند ہی رہے مگر اسلام پسند ہوں یا لبرل دونوں نے بھرپور نعرے بازی کی ہے اور دونوں ہی اس معاشرے کو کوئی متعین سمت دینے میں کامیاب نہیں ہو سکے لہٰذا پاکستانی سماج کی صورت یہ ہے کہ

رُکوں تو منزلیں ہی منزلیں ہیں
چلوں تو راستہ کوئی نہیں ہے

فصل دوم

میڈیا (Media) اور لبرل ازم

بیسویں صدی جہاں دیگر سائنسی ترقیوں اور عروج کی عظیم داستان اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے وہاں ذرائع ابلاغ کی پیش رفت سب سے نمایاں ہے۔ سائنسی ترقی نے انسانیت کو بے پناہ آسانیاں اور سہولتیں عطا کی ہیں مگر اسی ترقی کے تیز دھاروں میں انسانیت کو درکار اخلاقی اقدار بھی بہہ گئیں جس کا متبادل سائنس کی بڑی سے بڑی کامیابی بھی نہیں بن سکتی۔ سائنس متغیرہ (Variable) افکار کا نام ہے جبکہ اخلاق و مذہب مستقل (Constant) سچائیوں کے ضامن ہوتے ہیں۔ بدلتی ہوئی حقیقتوں کے بدلے مستقل اور لازوال سچائیوں اور اقدار (Values) سے ہاتھ دھو بیٹھنا بیسویں صدی کے معاشروں اور اقوام کا المیہ ہے جس کی تلافی ہوتی نظر نہیں آتی انسانوں نے سائنس کے حیرت انگیز کمالات کو انسانیت کی معراج گردانا تو شاعر مشرق نے کہا۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اور

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

شام ہمدرد میں پڑھے گئے مقالے میں معروف ادیب اشفاق احمد بھی اسی انداز میں ترقی کی حقیقتوں کو منکشف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہم اپنی کارکردگی پر خوش بھی ہیں اور حضرت انسان کی کامیابی اور اس کے کارہائے نمایاں پر فخر بھی کرتے ہیں لیکن کچھ سوچنے والے، جن میں مغرب کے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے، اکیسویں صدی کے دروازے پر آلتی پالتی مارے اور سر جھکائے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس سوچ میں مستغرق بیٹھے ہیں کہ حضرتِ انسان نے اب تک جتنی بھی ترقی کی ہے اس کا تعلق صرف باہر کی دنیا سے ہے اس نے اب تک جتنے بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں وہ سب خارج سے متعلق ہیں اور اس کی شخصی اور ذاتی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتے ان کا خیال ہے کہ انسان ویسا ہی ظالم، بے انصاف، مکار، خود غرض، منافق اور فریبی ہے جیسا کہ پتھر اور دھات کے زمانے میں تھا۔(۱۳)

بیسویں صدی کے سائنسی زمانے میں انسانی فکر، دانش، روایات اور معاشرے کو جس شعبے نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ میڈیا ہے۔ جس کا ہتھیار شائع شدہ مواد بھی ہے اور الیکٹرانک ذرائع ابلاغ بھی۔ اگرچہ پاکستان کی پسماندگی کا مادی حوالوں سے تو بہت رونا رویا جاتا ہے مگر جوں جوں سائنسی و مادی ترقی کا گراف اوپر گیا اخلاقی پسماندگی کا گراف بھی اوپر چلا گیا۔ بقول اقبال

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

سائنسی و مادی ترقی اپنے ساتھ ذرائع ابلاغ کے ذریعے ایک عظیم تہذیبی و معاشرتی تبدیلی لا رہی تھی پاکستانی قصبوں کے چوپالوں اور شہری زندگی کی مجالس میں قصوں اور کہانیوں کے ذریعے روایات کی منتقلی کی جگہ ٹیلی ویژن نے لے لی۔ گھروں میں دادی ماں اور مدرسے میں استاد کہانی کے ذریعے نئی نسل کو ایفائے عہد، حیاء اور جرأت کی عظیم روایات منتقل کرتے تھے اب ذرائع ابلاغ کی یلغار نے دادی ماں اور استاد کی محفل اجاڑ دی۔ سائنس کی آڑ میں تہذیبِ مغرب کی ساری چکا چوند سے قبل پاکستان میں زندگی سادہ اور آسان تھی لوگوں کے پاس وقت تھا ذرائع ابلاغ کا روشن پہلو یہ ہے کہ علم کی اشاعت و ترقی کی رفتار کئی گنا بڑھ گئی انسانی معلومات کا دائرہ وسیع ہوا، فاصلے سمٹ گئے مگر کس قیمت پر، الیاس انصاری لکھتے ہیں:

عالمی ذرائع ابلاغ ریڈیو، ٹی وی، اخبارات و جرائد اور وی سی آر، فلموں کے بڑے بڑے مراکز غیر مسلموں بالخصوص یہودیوں اور لادین طبقہ کے زیر قبضہ ہیں یہ ذرائع چونکہ بے حد مؤثر اور دیرپا نقش جمانے کی اہلیت رکھتے ہیں اس لیے انہیں

بڑی منصوبہ بندی سے فکر و نظر کی گمراہیاں پھیلانے اور اسلامی اقدار (Values) کو مٹانے اور ان کا مذاق اڑانے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے اہلِ مغرب مسلمانوں کی دینی اقدار اور پختہ عقائد کو فنڈامینٹل ازم قرار دے کر نئی نسلوں کو اپنی پرانی نسل کے عقیدہ اور ایمان سے بد ظن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی فلمی کہانیاں اور ان کے کردار ہمارے نوجوانوں کے فطری جذبۂ تجسس سے فائدہ اٹھا کر انہیں ایک ایسی راہ پر گامزن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ان میں اچھے اور برے اعمال کی تمیز اور احساس ہی ختم ہو جائے روح کی پاکیزگی اور حیا جو ایمان کا خاصہ ہے، متزلزل ہو جائے تو انسان اور جانور کا فرق و امتیاز ہی مٹ جاتا ہے ویڈیو فلمیں اور ڈش انٹینا معاشرے پر انتہائی زہریلے اثرات مرتب کر رہے ہیں ہالی وڈ، براڈوے، بنکاک اور ہانگ کانگ کے مراکز، عیاشی کی سرگرمیاں اس ڈش کی بدولت بیشتر گھروں میں دیکھی جا رہی ہیں۔(۱۴)

الیکٹرانک میڈیا، اخبارات و رسائل سے بڑھ کو مؤثر اور کارگر ہتھیار کے طور پر مغربی تہذیب اور اقدار کے فروغ کے لیے پاکستانی معاشرے میں نفوذ کر گیا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی پاکستانی معاشرے میں ذرائع ابلاغ کے ذریعے لبرل ازم کے فروغ پر تبصرہ کرتے ہیں:

ہمارے مغربی "ڈسکو کلچر" کی مرعوبیت کی ایک اور نئی صورت یہ سامنے آئی ہے کہ اب ہمارے بعض قومی اور ملی نغمے بھی مغربی انداز میں پیش کیے جانے لگے ہیں مثلاً ایک مقبول نغمہ "دل دل پاکستان — جان جان پاکستان" چاہے کتنا ہی دلپذیر کیوں نہ ہو اس کی بصری (Visual) پیشکش میں بہر حال مغربی ثقافت کی مرعوبیت اور مغلوبیت جھلکتی ہے اس طرح مغرب سے متاثر ہو کر ہمارے ہاں پی ٹی وی اور ایس ٹی این کے بعض ڈراموں اور پروگراموں میں ذو معنی فقرے، غیر اخلاقی مکالمے اور ناپسندیدہ مناظر سنائے اور دکھائے جاتے ہیں۔ پی ٹی وی کی سہ ماہی (اکتوبر — دسمبر ۱۹۹۱ء) میں خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کی اشاعت کے حوالے سے ڈرامہ سیریز دکھائی گئی مغربی کلچر سے مرعوب اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈرامہ میں اسلامی تعلیم کے برعکس جس انداز میں بے باکانہ مکالمے اور مناظر پیش کیے گئے وہ اسلامی ریاست کو قطعاً زیب نہیں دیتے مثلاً اس ڈرامہ کی ایک قسط میں ایک عورت دوسری عورت کو محض اس لیے بے غیرت کہتی ہے کہ اس کے ہاں بچے زیادہ ہیں پھر اولاد کو لعنت قرار دیا گیا- یہاں اس بات کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ مغربی ممالک ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی میں تو مدد دینے سے ہچکچاتے ہیں لیکن فیملی پلاننگ کے نام پر امداد دینے میں بڑی "سخاوت" کا مظاہرہ کرتے ہیں اس سے ان کا مطلب صرف مسلم آبادی کم کرنا ہی نہیں بلکہ بے حیائی پھیلانا بھی ہے۔(۱۵)

پاکستان میں ذرائع ابلاغ نے معاشرتی سطح پر ایک نیا کلچر دیا ہے چنانچہ ایک خاص تناسب تو وہ ہے جس نے اس کلچر کو انفرادی واجتماعی زندگی میں گرمجوشی کے ساتھ قبول کیا ہے جبکہ عظیم اکثریت وہ ہے جو اس کے منفی اثرات پر کڑھتی ہے۔ تنقید کرتی ہے لیکن میڈیا کے تہذیبی اثرات اس عظیم اکثریت کی خواب گاہوں کا حصہ بن گئے ہیں جبکہ ایک قلیل طبقہ وہ ہے جس نے اپنے اردگرد مزاحمت کا حصار کھڑا کر رکھا ہے جو مسلسل کمزور ہو رہا ہے اور ان کے لیے بھی آئندہ نسلوں کا تحفظ مشکل ہو گیا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں ایک زمانہ تو وہ تھا جب نیا ٹی وی کسی گھر میں آتا تھا تو اس خاندان کے بزرگ اور بڑے محلے میں اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے اور ان کا انداز بھی معذرت خواہانہ ہوتا تھا پھر وہ وضاحت کرتے تھے کہ بچے پڑوسیوں کے ہاں ٹی وی دیکھنے چلے جاتے تھے اور تنگ کرتے تھے اس لیے ٹی وی لانا پڑا ہے مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اس ٹی وی نے بالآخر بچوں کی آڑ میں بڑوں کو بھی اپنی زلف کا اسیر کر لیا۔ بچے عشاء کے وقت سو جاتے تھے اور دیگر معززین یعنی خاندان کے بڑے ٹی وی کے گرد رات گئے تک جمع رہتے اور پھر تو نئے طرزِ تعمیر میں وہ گھر ہی نامکمل سمجھا گیا جس میں ٹی وی لاؤنج نہ ہو۔ ٹی وی تو محض ایک آلہ ہے اور اس کی مخالفت سائنس کی اور سائنسی آلے کی مخالفت نہ تھی بلکہ اس کے خلاف مزاحمت تو اس آلے پر شیطانی تہذیب کے غلبے کی تھی۔ جس غلبے کا نتیجہ یہ ہے کہ اخبارات ورسائل، ٹی وی وغیرہ میں عورت کی نسوانیت کی تشہیر کی جا رہی ہے زیادہ سے زیادہ عریاں اور اخلاق سوز انداز اختیار کیے جاتے ہیں اخبارات کے درمیان اس سلسلہ میں باہمی مسابقت ہے اور دوڑ جاری ہے۔ عریانی، بے

حیائی اور فحاشی کا سارا یکطرفہ ٹریفک ہے پاکبازی، عفت وحیاداری کی دوسری تصویر کہیں دیکھنے کو نہیں ملتی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے معاشرے کا معزز ترین طبقہ اداکاروں اور اداکاراؤں کا ہے گزشتہ چالیس سال میں ریڈیو اور ٹی وی کے درسِ قرآن میں قرآنِ مجید کی ان آیات کو باریابی کا موقع نہیں ملا جن میں عورت کو حجاب، حیا اور عفت کی تعلیم دی گئی ہے اب اگر اس پر صحافی دعویدار ہیں کہ ہم تو تصویر کے دونوں رخ پیش کرتے ہیں تو بجا ہے ایک طرف تو دیوھیکل گاما پہلوان ہے اور دوسری طرف مجنون عامری ہے اس مقابلہ کا جو نتیجہ نکلے گا وہ ظاہر ہے۔ کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ ایک رخ کو پوری شدت کے ساتھ ابھارا جا رہا ہے تمام ذرائع ابلاغ اس "مقدس جہاد" میں ہراول دستہ ہیں کیا یہ استبداد بالقلم نہیں اور استبداد بالتصویر نہیں ہے۔(۱۶)

چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل ڈاکٹر شیر محمد زمان ذرائع ابلاغ کے اثرات کو پاکستان کے لیے منفی قرار دیتے ہیں ان کی رائے میں اسلامی اور پاکستانی ثقافت کے احیاء اور اس کی ترویج وسرپرستی کے حوالے سے اور اسی طرح کی اقتصادی مہم کے حوالے سے ہمارے ذرائع ابلاغ برابر ایک منفی کردار ادا کر رہے ہیں اور سرکاری الیکٹرانک میڈیا اس کردار میں پیش پیش ہے خود انحصاری کے نام پر، غیر ملکی ٹی وی چینلوں سے مقابلے کی آڑ میں، لباس، چال ڈھال، رہن سہن، گفتگو اور معاشرتی رویوں کے ایسے ماڈل ٹیلی ویژن پر ڈراموں، کلچر شوز، موسیقی کے پروگراموں اور سب سے بڑھ کر اشتہارات کے ذریعے پیش کیے جا رہے ہیں جو ہماری اخلاقی اقدار اور معاشرتی آداب کے تقدس کو تہس نہس کرنے کے ساتھ ساتھ ان منفی رویوں کو دلکشی کے ساتھ پیش کر کے گمراہی، مایوسی احساس محرومی اور جرائم کے ارتکاب کی آبیاری کرتے ہیں فلموں سے قطع نظر ٹی وی پر بھی مغربی ممالک میں ڈراموں کی عکس بندی کے بہانے مغربی معاشرت کو ایک قابل قبول اور نارمل طرزِ زندگی کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے سپانسر شپ کے پردے میں سپورٹس کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے سگریٹ نوشی اور بالواسطہ منشیات کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے، جس کا ہدف خصوصی طور پر نوجوان نسل بن رہی ہے کیونکہ وہی کھیلوں کے مقابلوں کو زیادہ شوق سے دیکھنے والے ہیں۔ اگر اسی سے ٹی وی کو آمدنی ہو رہی ہو جو خود انحصاری کے لیے ضروری ہے تو اس کی وجہ سے معاشرے میں وسیع پیمانے پر پھیلنے والی بیماریوں کے تدارک کے لیے سرکاری اور رفاہی اداروں پر بوجھ پڑ رہا ہے وہ کس کے کھاتے میں جائے گا۔(۱۷)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک طرف تو ذرائع ابلاغ کی روش اور حکمت عملی پر اسلام پسند مفکرین اور دانش ور کڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف روشن خیال ستر کی دہائی کو ذرائع ابلاغ کے لیے بہترین دہائی قرار دیتے ہیں کہ اس عشرے میں ٹیلی ویژن جیسا طاقتور ادارہ آزاد خیال معاشرے کی تشکیل کے لیے پوری تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا یہ بھٹو دور تھا جس کے متعلق خاتون صحافی شیریں پاشا لکھتی ہیں:

> With in T.V in the mid-70's an expansion was taking shape with an open policy and liberal censor. Plans for an elaborate T.V/Film academy, the first of its kind in Pakistan, were also being realized. The effects of these developments could be measured by the quality of programmes of this period; dramas like "Kanras", a story of dancer from the redlight area who is not being accepted by the gentry when she wants to change her life. Nijaat was the story of a maulvi and his sex life. "Sonay ki Chirya" was on using Haj money on educating a person, "Waris" was a serial which challenged feudalism. Khuda ki Basti" and "Jhok Siyal" are other pertinent examples of progressive themes.(۱۸)

ذرائع ابلاغ میں سے خاص طور پر ٹی وی ڈرامے کو ترقی اور روشن خیالی کے لیے مؤثر اور طاقتور ذریعۂ ابلاغ کے طور پر استعمال کیا گیا کیونکہ پاکستانی معاشرے کے زیادہ ناظرین ڈرامے ہی سے متعلق ہوتے ہیں اگرچہ جنرل ضیاء کے دور میں لبرل اور ترقی پسند طبقوں کے لیے جو مشکلات پیدا ہوئیں ان کا زیادہ حصہ ذرائع ابلاغ پر قابض روشن خیالوں سے متعلق ہے ضیاء دور میں ٹی وی پر اسلامائزیشن کے مظاہر کا تناسب تو بڑھ گیا مگر جنرل ضیاء کے آمرانہ طرزِ عمل نے لبرل افراد کو نہ صرف مظلوم بنایا بلکہ کسی حد تک لبرل ازم کا سکوپ بھی بڑھ گیا۔ آمرانہ طرزِ عمل کی ایک بدتر مثال ۱۹۸۵ء کا ریفرنڈم بھی تھا۔

> The "referendum" in 1985 was literally a media concocted event which foold the whole nation into believing that majority of the country had turned out to support it, when in fact the streets were deserted.(۱۹)

بیسویں صدی میں ذرائع ابلاغ نے جو اہمیت اختیار کر لی تھی اس کے باعث پاکستان اور اس کا معاشرہ بغیر پلاننگ کے بھی ان کی زد میں تھا مگر ذرائع ابلاغ پر حکومتوں نے اپنے مخصوص مقاصد اور

مفادات کے لیے تو کنٹرول حاصل کیا مگر اس کنٹرول سے قوم و ملک اور معاشرے کے لیے جو مفید نتائج حاصل ہو سکتے تھے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی ڈاکٹر نور احمد شاہتاز لکھتے ہیں:

> پاکستانی معاشرے میں فروغِ فحاشی و عریانی میں بھی ذرائع ابلاغ خاصی شہرت رکھتے ہیں خصوصاً الیکٹرانک میڈیا اس میں پیش پیش رہا ہے لیکن اگر حکومت کے زیر کنٹرول چلنے والے ابلاغ کے ان اداروں پر توجہ دی جاتی تو ان سے نفاذِ حدود کے عمل کو کامیاب بنانے میں خاصی مدد لی جا سکتی تھی اور یہی ادارے معاشرہ میں موجود برائیوں کے خاتمہ کے لیے اہم کردار ادا کر سکتے تھے لیکن ہوا یہ کہ ان پر گرفت زیادہ مضبوط نہیں رکھی گئی اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ قوم کے نوجوانوں کی ذہنی تربیت کر کے انہیں اسلام سے قریب تر کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اس کے برعکس ان ذرائع سے نوجوانوں کو ایسی غذا ملتی رہی جس سے معاشرہ دن بدن روبہ زوال رہا، اخلاقی گراوٹ بڑھتی رہی اور عوامی سطح پر لوگوں کی ذہنی تیاری کا کام جو ذرائع ابلاغ کو کرنا تھا نہ ہو سکا۔(۲۰)

عالمی سطح پر ذرائع ابلاغ پر جس اباحیت پسند طبقے کا تسلط ہے پاکستان میں بھی اس کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ Message نامی ایک این جی او نے ملتان میں ایڈز کے خلاف مظاہرہ کیا جس میں معصوم بچوں نے کتبے اور بینرز اٹھا رکھے تھے ایک بڑے بینر پر لکھا ہوا تھا کہ "کنڈوم کا استعمال، ایڈز سے بچاؤ" روزنامہ نوائے وقت نے اس مظاہرے کی تصویر شائع کی اور عنوان دیا "ثناخوان تقدیسِ مشرق کہاں ہیں"۔(۲۱)

ذرائع ابلاغ کی اسی معاملے میں اشتہاری مہم میں ٹیلی ویژن کا رویہ بے حد قابلِ توجہ ہے ڈاکٹر شیر زمان لکھتے ہیں:

> شام کے اوقات میں جب ٹی وی سب سے زیادہ دیکھا جاتا ہے، ایڈز کے اشتہارات ہمارے ذرائع ابلاغ کی بے حسی کی ایک اور علامت ہیں مغرب کی ہو بہو نقالی کرتے ہوئے احتیاط کی تلقین کی جاتی ہے چشم بددور یہ قیمتی معلومات تو مہیا کی جاتی ہیں کہ یہ مہلک مرض "مرد سے مرد کو، مرد سے عورت کو۔۔۔" لگ سکتا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مگر ہماری اپنی اقدار اور دینی تعلیمات کی روشنی میں یہ کہنے کی توفیق یا جرأت نہیں ہوتی کہ ایک پاکیزہ زندگی ہی بابرکت زندگی ہے اور خدائی احکام سے منہ موڑنا اس طرح کے وبال کا سبب بنتا ہے۔(۲۲)

پاکستان ٹیلی ویژن کے پہلے جنرل منیجر اور بانی ذوالفقار علی بخاری نے ٹی وی کے اغراض و مقاصد کو جس طرح بیان کیا وہ اس طاقتور نشریاتی ادارے کی سمت اور حکمتِ عملی کے علاوہ اصل محرکات جاننے کے لیے بھی ایک اہم دستاویز ہے۔ بخاری صاحب نے درج ذیل خیالات کا اظہار اپنی تفصیلی تقریر میں کیا:

> آپ حضرات کو معلوم ہے کہ ٹیلی ویژن بیسویں صدی کا سب سے مؤثر تفریحی و سماجی آرگن ہے جو کسی معاشرے کے تمام گھرانوں اور خاندانوں کی پرائیویٹ زندگی میں مداخلت کرتا ہے اور جس پرائیویٹ زندگی میں کوئی گھرانہ کسی کی مداخلت کو برداشت نہیں کرتا اس میں ٹی وی کے شوق میں ہر اس چیز کو بڑی خوشی سے داخل کر لیتا ہے جس کے انتخاب میں اس کی اپنی مرضی کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ٹی وی نہ صرف معاشرے کے ہر خاندانی یونٹ کو تبدیل کرنے کا کام کر رہا ہے بلکہ اس کا سب سے مؤثر کام نئی نسلوں کو ماں باپ کی اپنی تربیت سے نکال کر وہ بنا دینا ہے جو ہم چاہتے ہیں یعنی ٹی وی موجودہ بالغوں کے لیے اتنا مؤثر نہیں ہوگا جتنا ان بچوں کے لیے جو آنکھ کھولتے ہی ٹی وی کے ذریعے تربیت حاصل کریں گے اور اس اعتبار سے ٹی وی کی ذمہ داری اور کام کی اہمیت اس وقت معاشرتی معماروں کی مجموعی قوت سے بھی زیادہ ہوگی بچوں کا ابتدائی ذہن ایک سلیٹ کی مانند ہوتا ہے جس پر آپ جو نقش ابھارنا چاہیں گے وہی نقش ابھرے گا گویا آپ کے ہاتھ میں ہوگا کہ آپ پاکستان میں کیسی نسلیں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ ٹیلی ویژن کی آمد کے بعد پاکستان میں ایسی نسلیں ابھریں گی جو اپنے خیالات، محسوسات اور طرزِ فکر میں موجودہ معاشرے سے مختلف ہوں گی اور

تقریباً دو سو سال میں جو تبدیلی ہمارے معاشرے میں ممکن ہے آپ صرف دس سال میں انجام دے سکیں گے۔

یہ میڈیا اتنا مؤثر، زود اثر اور طاقتور ہوگا کہ اس قبیل کے اہم ترین میڈیا، ریڈیو، فلم اور اخبارات کو بیک وقت بروئے کار لائے گا اور ان سب سے زیادہ زود اثر اور قومی اثرات کا محرک ہوگا مثلاً ان تینوں ذرائع میں فلم سب سے مؤثر آلۂ تفریح اور شخصیت پر اثر انداز ہونے والا میڈیم ہے مگر آپ کو معلوم ہے کہ فلم بینی کا شوق بچوں میں ۱۳، ۱۴ سال میں جا کر پیدا ہوتا ہے اور بالخصوص دو تین سال کے بچے اس سے بالکل غیر متعلق ہوتے ہیں ذرا بڑے بھی ہوتے ہیں تو ان کے اہلِ خاندان کو پہلے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے بچوں کو کس قسم کی فلم دکھانے کے لیے جا رہے ہیں مگر ٹی وی میں اس انتخاب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہم نہ صرف جو کچھ دکھائیں گے ان کو دیکھنا پڑے گا اور صاحبِ خانہ اپنے بچوں کو ہر چیز دکھانے کے لیے مجبور ہوگا کہ ٹی وی وہ خود خرید کر اپنے گھر میں لے گیا ہے گویا اب انہیں فلم دیکھنے کے لیے سینما ہاؤس جانے کی ضرورت نہیں ہر گھر سینما ہاؤس ہوگا اور وہاں ہم دو سال کے بچے سے لے کر نوجوان ذہن تک ہر وہ نقش ان کے ذہن میں بٹھا دیں گے جو ہم بٹھانا چاہتے ہیں اس طرح آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہماری ذمہ داری کتنی اہم اور متنوع ہوگی اس طرح آپ حضرات جیسی بنیادیں رکھنا چاہیں گے اس پر آئندہ پاکستان کی تعمیر و تشکیل ہوگی۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم ٹی وی جیسی قوت کیوں لانا چاہ رہے ہیں جبکہ پاکستان جیسے نو تعمیرانہ پسماندہ ملک میں جو ابھی صنعتی ترقی سے بھی کوسوں دور ہے جو اپنے پیروں پر بھی پوری طرح کھڑا نہیں ہوا جس پر اربوں روپے کا قرض ہے اور جو ریڈیو کی "نیڈل" بھی خود نہیں بنا سکتا ہم اس میں یہ سفید ہاتھی کیوں باندھنا چاہتے ہیں جو ہماری معاشی صورتحال پر مزید بوجھ ثابت ہوگا اور ظاہر ہے کہ جس پر کروڑوں ڈالر قرض لیے جا رہے ہیں آپ کو معلوم ہے کہ ٹی وی دراصل ایوب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خان صاحب کی خواہش پر لایا جارہا ہے دراصل ٹی وی جلد از جلد لانے کا مسئلہ یہ ہے کہ آپ ایوب خان اور ان کے کارناموں کو گھر گھر پہنچادیں اور ان ناپاک سیاستدانوں کی سازشوں کا پردہ چاک کردیں کیونکہ اگر یہ ناپاک سیاستدان پھر اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگئے تو ملک کی ساری ترقی اور تبدیلی سب بے معنی ہو جائے گی۔

آپ کو معلوم ہے پاکستان کی ترقی کا سب سے بڑا دشمن ہمارا مذہبی طبقہ ہے جو سیاسی، دینی اور معاشرتی سطح پر ہر حکومت کے لیے راہ کا روڑا بن کر ابھرا ہے ہماری ہر حکومت کے لیے یہی عنصر ہمیشہ خطرہ کا باعث ہوا ہے چنانچہ اس وقت بھی ایوب خان کے خلاف یہ تمام رجعت پسند، ترقی کے دشمن اور مذہبی جنونیوں کی قوتیں پیش پیش ہیں اور ایوب خان کے کارناموں اور ان کی شخصیت پر یہ چار طرف سے حملہ آور ہو رہی ہیں۔ ٹیلی ویژن کا سب سے بڑا مقصد ان ملاؤں اور مذہبی جنونیوں کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ یہ ہمارے ملک کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے کہ ہمارا متوسط طبقہ جو سب سے زیادہ پڑھا لکھا ہے اس کی اکثریت مذہب کے فرسودہ اور رجعت پسند طرزِ فکر کی حامل ہے ٹی وی کا اولین مخاطب یہی طبقہ ہوگا قوم اور پہلے متوسط طبقے کو فرسودہ مذہبی تصورات سے آزاد کرائیں اور اس مقصد کو اس خوبی سے انجام دیں کہ لوگوں کو شعوری طور پر اس کا پتہ نہ چلے کہ آپ جدید نسلوں کو مذہبی جنونیوں اور ملاؤں سے اپنی معاشرت اور سیاست کو پاک کردیں گے جو ہر حکومت کے لیے زوال کا باعث بن جاتے ہیں اور قومی آزاد خیالی کو چیلنج کرتے ہیں۔

میں آپ میں سے ہر لکھنے والے کو اپنے پروگراموں کے معاوضے کے علاوہ دو سو روپے ماہوار الگ دوں گا جو عربی پڑھے گا (خیال رہے کہ یہ دو سو روپے ایوب خان کے دور کے ہیں) ہم یہ چاہتے ہیں کہ ٹی وی اور ریڈیو سے ایسے افراد کو بحیثیت عالمِ دین اور جدید مفکر کی حیثیت سے پیش کر سکیں اور ان تمام ملاؤں کے

اثرات دور کر سکیں جو مذہب کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں اور جنہیں ہم طوعاً و کرہاً پیش کرنے پر مجبور ہیں آپ کو مذہب کی خرافات سے معاشرے کو نجات دلانے کا کام کرنا ہے اور اسی لیے ہم اس ادارے کے ذریعے بالکل جدید ذہنوں کو آگے لانا چاہتے ہیں میڈیم کے ساتھ نئے ذہنوں کو نہ صرف فرسودہ اور مردہ تصورات سے نجات دلانے کے لیے استعمال کیا جائے گا بلکہ ان کو پوری قوم کے محسوسات اور طرزِ فکر کو بدلنا ہوگا۔

مثلاً ہم ہر سال بقر عید پر لاکھوں جانور سنتِ ابراہیمی علیہ السلام کے نام پر ضائع کر دیتے ہیں ایک تو یہ نہایت درجہ کی بے رحمی اور شقاوت کی بات ہے دوسرے جو غلاظت اور گندگی پورے ملک میں تین دن تک طاری رہتی ہے وہ قومی معیشت کی بربادی سے بھی زیادہ افسوسناک ہے آپ لوگ اس قسم کے تہواروں کے بارے میں یہ احساس نہیں ہونے دیں گے کہ ٹی وی ان کے خلاف ہے لیکن نئے ذہنوں میں اس کے خراب اثرات کو اس طرح جاگزیں کردیں گے کہ کم از کم وہ خود بڑے ہو کر اس سے محفوظ رہیں۔

اسی طرح شراب کا مسئلہ ہے۔ غضب خدا کا، ان ملاؤں نے اسے بھی حرام کر رکھا ہے مذہب میں شراب کی خرابیوں کا ذکر ان لوگوں کے لیے کیا گیا جو ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں یا نالیوں میں جا گرتے ہیں مگر بتائیں میرے لیے کیسے حرام ہو سکتی ہے جو اس کے بغیر تخلیقی کام سرانجام نہیں دے سکتا وہ تو ایک توانائی پیدا کرتی ہے آپ کو اس قسم کے ڈھکوسلوں کو بھی ختم کرنا ہے شراب کے لیے گنجائش نکالنا اسی طرح ممکن ہوگا کہ آپ مثبت کرداروں کے ساتھ اس کو شامل کر کے ایسے افراد کی خوبیوں کو اجاگر کیجئے اور انہیں انسانی خوبیوں سے زیادہ مزین دکھایئے۔

منافقت اور متضاد کردار کے لیے منفی ڈرامہ کرداروں کے داڑھی لگانا، مضحکہ خیز کرداروں اور یتیم العقل کرداروں کو مشرقی لباس پہنایئے یہ یاد رکھیے کہ آپ کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے تمام کرداروں اور اناؤنسروں کو وہ لباس پہنانا ہے جو ہمارے ترقی یافتہ معاشرے میں سو سال بعد رائج ہونا چاہیے جو ایک فیصد اوپر کے طبقہ میں رائج ہے اور اردو کے قومی تصور کو بھی آپ بدلنے کی کوشش کیجئے اسے ایک مشترک زبان سے زیادہ اہمیت نہ دیجئے۔ مقامی زبانوں اور اوپر کے طبقہ کی ملی جلی انگریزی زبان پیش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں قوم کی ذہنی اور جذباتی تربیت کی سب سے پہلے ضرورت ہے پاکستان منفی ترقی کی طرف بڑھ رہا ہے اور ہماری قوم کے ذہنی اور جذباتی مسائل فرسودگی اور توہم پرستی کے نام پر اس کی راہ میں رکاوٹ ہیں اس لیے ٹی وی ایک ایسا ادارہ ہے جس کو سوچ سمجھ کر ایک خاص مقصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس پر ہر سطح پر ایسے ذہنوں اور افراد کو تیار کیا جا رہا ہے جو اس مقصد سے ہم آہنگ ہوں اور ہم نے اس کے لیے چند افراد کو باہر ٹریننگ کے لیے بھیجا تھا جن کا سب سے بڑا کام پورے ادارے کو انہی خطوط پر آرگنائز کرنا ہوگا۔(۲۳)

پاکستان ٹیلی ویژن کے اغراض و مقاصد کے مذکورہ بیان میں لبرل ازم کی مؤثر اور بروقت پلاننگ کا اندازہ ہوتا ہے اگرچہ موصوف مذہبی طبقے اور پاکستانی معاشرے کے مذہبی مزاج سے خائف ہیں مگر اپنے اہداف کے حصول کے لیے سو فی صد یکسو ہیں پی ٹی وی کے پہلے جنرل مینجر کی مذکورہ تقریر کا تعلق ایوب خان کے دور یعنی ساٹھ کی دہائی سے ہے اور سن ۲۰۰۱ء کا پاکستانی معاشرہ مذکورہ تقریر میں بیان کردہ لائحہ عمل کے نتائج اور اثرات کا ترجمان ہے۔

انہی نتائج و اثرات کا بیان سابق ڈائریکٹر ادارہ تعلیم و تحقیق پنجاب یونیورسٹی پروفیسر ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی کے الفاظ میں:

> اس "بے خدا ثقافت" کو ہمارے ذہنوں اور ہمارے دلوں پر مسلط کرنے کے لیے امریکی سی این این انٹرنیشنل کے ذریعے متعصبانہ یک طرفہ خبریں، جائزے، انٹرویوز، کمرشلز اور ایسے رنگا رنگ پروگرام پیش کیے جاتے ہیں جو ہمیں بڑی تیزی سے اپنے ثقافتی شکنجے میں جکڑے چلے جاتے ہیں اسی طرح ہمارے اپنے

> الیکٹرانک میڈیا مثلاً پی ٹی وی، ایس ٹی این، این ٹی ایم اور ریڈیو کے بعض پروگرام بھی مغربی ذرائع ابلاغ سے کوئی پیچھے نہیں بلکہ اپنی قومی اور علاقائی زبانوں میں اپنی فلموں، اپنے گانوں، اپنے ڈراموں اور دیگر تفریحی پروگراموں کی وساطت سے سیکولرازم اور لبرل ازم کی تعلیم کا ذریعہ بن رہے ہیں---- پاکستان میں پہلے سے موجود ذرائع ابلاغ کیا قیامت ڈھا رہے تھے کہ اب پریس میں ایک خبر آئی ہے (روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۷، ۳۱، اکتوبر ۱۹۹۱ء) کہ بعض غیر ملکی بزنس پارٹیوں نے حکومت پاکستان کو یہ پیشکش کی ہے کہ وہ پاکستان میں تین نئے چینل قائم کرنے کے لیے سرمایہ کاری کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس طرح سوئٹزرلینڈ کی ایک فرم نے بھی پاکستان میں ٹیلی ویژن کا ایک خصوصی سپورٹس چینل قائم کرنے کی پیش کش کی ہے جس پر وزارت اطلاعات و نشریات غور کر رہی ہے لیکن سرِدست ہماری وزارت کو اگر کوئی پریشانی ہے تو بس اتنی کہ اس سے پی ٹی وی کو ملنے والی اشتہارات کی آمدنی تقسیم ہو جائے گی نہ یہ کہ نئے چینل ہماری ملی اور قومی اقدار کو کتنا متاثر کریں گے۔(۲۴)

ہمارے معاشرے کی صورت گری میں ٹی وی نے سب سے طاقتور ہتھیار کے طور پر کام کیا ہے اور معاشرتی سطح پر دینی و اخلاقی اقدار کو پسپا کر کے آزاد خیالی اور لادینیت کے رجحانات کو تقویت دی ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کے لبرل ٹیلی ویژن کے ذریعے اپنے اہداف حاصل کرنے میں سو فیصد کامیاب نہیں ہو سکے انہیں شکوہ ہے کہ ٹیلی ویژن پر بھی کہیں کہیں مذہبی رنگ کیوں آتا ہے دلچسپ امر یہ ہے کہ ٹیلی ویژن ہماری معاشرتی زندگی کی ایک پہلو سے صحیح عکاسی کرتا ہے جیسا کہ معاشرہ اسلامی تہذیب کے ساتھ ساتھ ہندی اور مغربی تہذیب کے اختلاط کا منظر پیش کرتا ہے پی ٹی وی بھی کسی ایک کلچر اور تہذیب سے زیادہ ایک مخلوط تہذیب کا نمائندہ ہے جس کی ابتداء تلاوت قرآن اور ترجمے سے ہوتی ہے۔ نعت اور حمد کے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں پھر ٹیلی ویژن ایک بے خدا مغربی تہذیب کا ترجمان بن جاتا ہے اور رات گئے تک ان اقدار اور روایات کے فروغ کے لیے سرگرم عمل رہتا ہے جن کی اسلامی تہذیب میں کوئی گنجائش نہیں ہاں درمیان میں عشاء کی اذان سنائی دیتی ہے اور اختتام بھی فرمانِ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الٰہی سے کر دیا جاتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی کمین گاہ میں موجود لادین طبقے نے اپنے مقاصد کے لیے جو منصوبہ بنایا اور سرمایہ کاری کی تو اس کے نتائج بھی حاصل کیے مگر ذرائع ابلاغ بالخصوص ریڈیو اور ٹی وی میں تہذیب و ثقافت کا اختلاط اور کشمکش یا کئی ثقافتوں کا ملغوبہ ایک اعتبار سے امید کی کرن بھی ہے جیسا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر شیر محمد زمان اپنے ایک مقالے میں کہتے ہیں:

> ذرائع ابلاغ کی اصلاح، بالخصوص سرکاری ذرائع ابلاغ کی اصلاح تو ایک ایسا پروگرام ہے جو کسی بھاری بجٹ کا متقاضی نہیں اس کے لیے صرف سوچ درست کرنے اور عزمِ صحیح کی ضرورت ہے ہمارے ملک میں اللہ کے فضل سے بہترین تخلیقی صلاحیتوں کے حامل ادیب اور فنکار موجود ہیں جو ہماری اخلاقی اقدار کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی نہیں بلکہ ان کی تعمیر واشاعت کے لیے بھی بھرپور کردار ادا کر سکتے ہیں بشرطیکہ ان سے اس جنس کی طلب کی جائے۔(۲۵)

ذرائع ابلاغ میں الیکٹرانک میڈیا کا بے لگام گھوڑا کسی مثبت قومی وملی نصب العین کے فروغ کی بجائے تفریحی پروگراموں کی آڑ میں اخلاقی قدروں اور اسلامی تہذیب وثقافت کو پامال کرنے کے لیے برق رفتاری سے دوڑ رہا ہے تو پریس یعنی اخبارات ورسائل بھی کوئی صحت مند کردار ادا نہیں کر رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی پریس کو آزادی اور حریت فکر سے زیادہ جبر کا سامنا ہر دورِ حکومت میں رہا ہے تاہم قابل غور پہلو یہ ہے کہ ہر حکمران نے اخبارات کو تفریح اور ثقافت کے نام پر ہر طرح کی گندگی شائع کرنے کے لیے تو مکمل آزادی دی ہے مگر اخبارات ورسائل کا جو اصل اور منفرد کردار رائے عامہ کی تشکیل، احتساب اور قومی شعور کی بیداری سے وابستہ ہے وہ ادا نہیں کرنے دیا گیا اس سلسلے میں الطاف گوہر، ایوب خان کے دور کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> تاہم مجھے صحافت کی ذمہ داریوں اور اس کے تقاضوں سے حقیقی آشنائی اس وقت ہوئی جب میں نے ۱۹۶۹ء میں ایوب خان کی رخصت کے بعد پاکستان کے سب سے پرانے انگریزی روزنامے "ڈان" کی ادارت سنبھالی ایک شخص جو "پریس" کا نگران تھا پریس کی آزادی کا شکار ہو گیا اس دوران میں نے جو سبق سیکھا اس کا ماحصل یہ ہے کہ حالات چاہے کچھ بھی ہوں سرکاری پروپیگنڈے کے طور پر

> استعمال کیے جانے والا پریس نہ تو عوام کا اعتماد حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی رائے عامہ کو متاثر کر سکتا ہے۔ آپ ایسے پریس کے ذریعے حکومتی کارناموں کا ڈھنڈورا پیٹ سکتے ہیں، ہر قسم کی اختلافی رائے اور تنقید کا راستہ روک سکتے ہیں لیکن اگر آپ اپنے اس عمل سے عوام کی رائے پر ذرہ برابر اثر انداز ہونے کی توقع رکھتے ہیں تو یہ آپ کی خام خیالی ہے صحافت کا ایک ہی مقصد، ایک ہی فریضہ ایک ہی ذمہ داری ہے اور وہ ہے حکومت کی کارکردگی پر کڑی تنقید اور اس کا مسلسل احتساب۔(۲۶)

پاکستانی صحافت بلاشبہ کئی امراض میں مبتلا ہے مگر صحافت کو آمریت ہو یا جمہوریت ریاستی جبر کا سامنا کرنا پڑا ہے مثال کے طور پر سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے حامی ان کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ موصوف پاکستان کے پہلے منتخب وزیر اعظم تھے مگر ان کی جمہوری حکمتِ عملی کا پریس کے ساتھ کیا رویہ رہا ہے ان کے خاص اور معتمد رفیق سابق وزیر اعلیٰ پنجاب جناب حنیف رامے اپنے ایک انٹرویو میں اعتراف کرتے ہیں کہ جو بھی پالیسی بنتی تھی وہ ہر اخبار کی مرکز میں بنتی تھی اس وقت مولانا کوثر نیازی اور یوسف بچ صاحب تھے پھر علی محمد راشدی بھی اس معاملے میں مشیر تھے یہ سب کچھ اوپر ہی سے کنٹرول ہوتا تھا ہمیں جب حکم آتا تھا کہ ان کو مروڑ دو تو ہم صرف چٹکی لیتے تھے اگر حکم آیا ہے کہ نوائے وقت کو بند کر دو اور ہم یہ کوشش کرتے تھے کہ کم از کم یہ قتل میرے ہاتھوں سے نہ ہو۔(۲۷)

جمہوریت کے نعروں اور دعوؤں کے باوجود حکمرانوں کے جابرانہ اور آمرانہ رویے نے پاکستانی معاشرے میں صحافت کو حقیقی کردار ادا کرنے کا موقع نہیں دیا جس کے باعث معاشرتی سطح پر صحافت کے بارے میں بداعتمادی اور مغالطوں کی فضا پائی جاتی ہے اخبارات ورسائل جو عوام کی رائے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ریاستی جبر کے تحت اپنا سماجی کردار ادا نہیں کر پائے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی پاکستانی کلچر میں لکھتے ہیں:

> ہمارے ہاں ذہنی آزادی کی سطح پر اب تک صرف یہ ہوا ہے کہ جو برسرِ اقتدار آیا اس نے دوسروں کی رائے کو دبانے اور کچلنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کبھی حب الوطنی کے خوف سے راستہ ہموار کیا اور کبھی غداری کے الزام سے حریفوں کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈرایا اور ساتھ ساتھ اپنی نیک نیتی کا ڈھنڈورا زور زور سے پیٹا جب حریف برسرِ اقتدار آیا تو اس نے بھی وہی طریقۂ عمل اختیار کیا جو خود اب تک اس پر استعمال کیا جاتا رہا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ اس صورتحال کی وجہ سے رائے عامہ کبھی بیدار نہ ہو سکی جو اچھے اور برے میں امتیاز پیدا کر سکتی اب تو حال یہ ہو گیا ہے کہ سچی خبریں بھی جھوٹی نظر آتی ہیں اس لیے جب جھوٹ اور سچ میں امتیاز باقی نہ رہے تو ہر سچ جھوٹ بن جاتا ہے۔(۲۸)

تاریخ پاکستان کے زیادہ تر سال صحافت میں حریت، آزادی اور تخلیقی فضا کے لیے ناسازگار فضا کا شکار نظر آتے ہیں اگرچہ بعض اہلِ دانش ۱۹۵۸ء سے قبل کے دور کو صحافت کے لیے نسبتاً بہتر قرار دیتے ہیں مگر ایک دوسرا مؤقف یہ ہے کہ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء سے قبل صحافت اور دیگر ذرائع ابلاغ پر بائیں بازو کی مضبوط گرفت تھی بعد ازاں بائیں بازو کے اس مضبوط مورچے کو توڑنے کے لیے مختلف ادوار میں جو اقدامات ہوتے رہے وہ صحافت کو ایک دوسری انتہا کی طرف لے گئے جو صحافت کو حکمرانوں کی خواہشات اور مفادات کے تابع کر دینے کی انتہا تھی۔ جناب مسعود اشعر کے درج ذیل تجزیے سے مذکورہ امر کی تائید ہوتی ہے موصوف لکھتے ہیں:

> ۱۹۵۸ء تک پاکستان میں کسی نہ کسی قسم کی لولی لنگڑی جمہوریت قائم تھی اور ہم کسی نہ کسی نوعیت کے جمہوری معاشرے اور جمہوری کلچر میں سانس لے رہے تھے ابھی ادب، ادیب اور ثقافت کا پاس لحاظ کیا جاتا تھا ادب و ثقافت کے معاملے میں حکومت مداخلت کرنے کی کوشش کرتی تھی لیکن اسے ہر بار پسپائی اختیار کرنے پر مجبور بھی ہونا پڑتا تھا عام آدمی کے اندر بھی کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی کا جذبہ موجود تھا لیکن ۱۹۵۸ء کے بعد یہ سارا ڈھانچہ بکھر گیا اس کے بعد ہماری ساری تاریخ مارشل لاؤں، آمرانہ حکومتوں یا آمرانہ ذہنیت کے حکمرانوں کی تاریخ ہے۔ بیچ میں ایک آدھ دور ایسا آیا جب ہمیں تھوڑی بہت تازگی اور کشادگی کا احساس ہوا لیکن یہ عرصہ اتنا مختصر تھا کہ ہمارے اخلاقی اور سیاسی کلچر میں جو

آمرانہ روایات جڑ پکڑ چکی تھیں ان کی بیخ کنی نہیں ہو سکی اور ہم انہی روایات کو آگے بڑھاتے رہے۔

ایوب خان کا اور روشن خیال مارشل لاء اور عائلی قوانین کا

ضیاء الحق کے مقابلے میں ایوب خان کے مارشل لاء کو ایک روشن خیال مارشل لاء کہا جا سکتا ہے کہ اس نے عائلی قوانین جیسے اصلاحی قانون نافذ کر کے ایک ترقی پسند قدم اٹھایا اور یہ بات ماننا پڑے گی کہ یہ کام ایوب خان ہی کر سکتا تھا جمہوری نام کی کوئی حکومت ایسا انقلابی قدم آج بھی نہیں اٹھا سکتی لیکن ایوب خان بہر حال آمر تھا اور آمر بظاہر کتنا ہی مضبوط اور طاقتور نظر آئے اندر سے نہایت کمزور اور بزدل ہوتا ہے ایوب خان نے عائلی قوانین نافذ کر کے روشن خیال طبقے کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ان سے ڈرتا بھی بہت تھا اسی لیے وہ روزنامہ امروز اور پاکستان ٹائمز شائع کرنے والے ادارے پروگریسو پیپرز پر جارحانہ قبضہ کر کے آزادیٔ اظہار کا گلا گھونٹ چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی فکر و خیال کی آزادی پر پابندیوں کا تاریک دور بھی شروع ہو گیا تھا۔(۲۹)

ترقی پسند مفکر مسعود اشعر اگرچہ صحافت اور آزادیٔ اظہار پر پابندیوں پر تنقید کرتے ہیں مگر ایک لبرل اور روشن خیال دانشور کی حیثیت سے وہ اپنے ہی زاویے اور نگاہ سے صورتحال کا تجزیہ کرتے ہیں جیسا کہ ضیاء الحق کی نسبت ان کے لیے ایوب کا دور زیادہ پسندیدہ اور سازگار ہے کیونکہ ایوب نے عائلی قوانین نافذ کر کے ایک ایسا انقلابی قدم اٹھایا تھا جو پاکستان کے روشن خیالوں کی امنگوں کے مطابق تھا چنانچہ اس تناظر میں صحافت اور ادب کے لیے آزادی کی فضا کے حق میں نعرے بازی تو کی جا سکتی ہے مگر ہر دور اور ہر اقدام کو اپنے طے شدہ نظریات کے معیار پر پرکھنا بھی بہر حال تعصب کا رویہ ہے اسلامی فکر کے ترجمان ادیب جناب نعیم صدیقی کی رائے ہے:

> لبرل ازم کے نعرے لگانے والے تک اتنے لبرل نہیں ہیں کہ وہ اپنی رائے کو دوسروں کے بہتر دلائل کے زیر اثر چھوڑ دیں یا دوسروں کے کسی خیال کو کھلے دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے قبول کریں۔ جمہوریت کے بے شمار دیوانے مستانے ملیں گے مگر گفتگو اور بحث و استدلال کے ذریعے ایسے انداز پر تبادلہ خیال کرنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے عاری ہوں گے کہ دو طرفہ اچھے خیالات اور اچھی آراء کا لین دین ہو سکے۔(۳۰)

مختلف مفکرین کی آراء کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ پاکستانی پریس کو آزادی میسر نہیں ہے مگر اس مؤقف کی تائید میں اسلام پسندوں اور روشن خیالوں کے دلائل قطعی طور پر مختلف اور انتہا پسندانہ ہیں کیونکہ اپنے نظریات اور افکار کی عینک اتار کر غیر جانبدارانہ اور حقیقت پسندانہ انداز میں رائے تشکیل دینا آسان نہیں ہے جیسا کہ مسعود اشعر بھی صحافت پر پابندی کے خلاف ہیں مگر ان کے دلائل اپنی ایک ایک سطر سے جس معیار کو پیش کرتے ہیں وہ لبرل ازم کا معیار ہے موصوف لکھتے ہیں:

"سیاست، سیاستدانوں اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگی تو اخباروں کے لیے زندہ رہنا مشکل ہو گیا ان کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ وہ کیا چھاپیں صرف ایوب خان کے بیان، ان کے احکام یا تقریریں اخبار کی سرکولیشن برقرار نہیں رکھ سکتی تھیں چنانچہ انہوں نے وہی کچھ کیا جو دنیا کی تمام آمرانہ حکومتوں کے زمانے میں اخبار کرتے ہیں۔ فرانکو کی آمریت میں سپین کے اخبار عورتوں کی ننگی تصویریں اور ہیجان انگیز جنسی کہانیاں شائع کر کے اپنی سرکولیشن برقرار رکھتے تھے پاکستان میں اس وقت اخلاقی معیار ذرا مختلف تھا اس لیے یہاں کے اخباروں نے عوام کی جہالت اور اوہام پرستی سے فائدہ اٹھایا انہوں نے عام لوگوں کے مذہبی جذبات سے کھیلنا شروع کیا اب اخباروں میں مسلمانوں کی تاریخ کے جھوٹے سچے واقعات شائع ہونے لگے۔ پیروں، فقیروں کی کرامات بلکہ معجزات چھپنے لگے ایسے روحانی بزرگ پیدا ہو گئے جن کا کسی نے نام بھی نہیں سنا تھا اور ان کے عُرسوں پر ایک ایک اور دو دو صفحے کے فیچر چھپنے لگے اخباروں میں سیاستدانوں کے بیان تو چھپ نہیں سکتے تھے اس لیے اب ان مولویوں کے بیان اور تقریریں شائع ہونے لگیں جنہیں اخبار کبھی گھاس بھی نہیں ڈالتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ وہی ایوب خان جو اپنی ملا دشمنی کے لیے مشہور تھا ملّا کو خوش کرنے پر مجبور ہو گیا اس نے سکولوں کے

نصاب میں مذہبی مضامین کا اضافہ کیا ایسے مضامین جو تنگ نظری اور توہم پرستی سکھاتے تھے۔

اب مجھے ایک شخص یاد آ رہا ہے خدا اس کی روح کو نہ شرمائے وہ آدمی تو اچھا نہیں تھا لیکن اس وقت اس نے بڑے پتے کی بات کہی تھی اس نے کہا تھا کہ آج سکولوں اور کالجوں میں جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے اسے پڑھ کر پندرہ یا بیس سالوں بعد نوجوانوں کی جو نسل سامنے آئے گی وہ پوری طرح کٹھ ملّاؤں کی مٹھی میں ہو گی اس نے یہ بھی کہا تھا کہ مذہب آئے اور مولوی نہ آئے یعنی گانا سننا چاہیں اور کوٹھے والی نہ آئے یہ میرے الفاظ نہیں ہیں یہ الفاظ ہیں جمیل الزمان کے جو اس وقت ملتان میں تعلقات عامہ کا ریجنل ڈائریکٹر تھا اور بعد میں ضیاء الحق کو امیر المؤمنین منوانے کی کوشش میں نعرے لگاتے لگاتے اپنی جان ہار بیٹھا۔ اب آپ دیکھ لیجئے اس نے جو کچھ کہا تھا عین عین وہی ہوا خانہ خالی ہو تو دیو قبضہ کرتے ہیں آزادئ اظہار اور کھلے مکالمے پر پابندی لگی تو اس حلقے اور اس طبقے نے اس سے فائدہ اٹھایا جو سرے سے پاکستان کے ہی خلاف تھا چنانچہ یحییٰ خان کے مارشل لاء کے بعد جو جمہوریت آئی اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ شمار کیا جاتا ہے کہ اس نے قادیانیوں کو آئینی طور پر کافر قرار دے دیا اور مذہبی مدرسوں کے وظیفے مقرر کر دیے۔ یہاں تک پہنچ گئی تھی ملّاں کی طاقت اور ہماری خود غرضی۔

میرا خیال ہے ضیاء الحق کے زمانے کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ وہ دور پاکستان ہی نہیں دنیا بھر کے مسلمانوں کی زندگی کا تاریک ترین دور تھا اس شخص نے پاکستان کی اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی قبا کا تانا بانا ہی بکھیر دیا وہ سارے تہذیبی، فکری اور اخلاقی سانچے ہی توڑ ڈالے جو مسلمانوں نے ہزاروں سال کے تہذیبی لین دین سے بنائے تھے۔ اب ہمارا نصب العین جھوٹ منافقت اور ریاکاری و مکاری ٹھہرا اس شخص نے نوجوانوں کے ہاتھ سے قلم چھین کر اس میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کلاشنکوف تھاوی اور ہمارے اخباروں نے اس موقع پر بھی وہی رول ادا کیا جو منافع خورو کا ندار ادا کرتا ہے۔(۳۱)

یہ سچ ہے کہ پاکستانی اخبارات نے منافع خوری کو اپنا اصل ہدف سمجھا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ پریس کی آزادی کا خواب نہ تو ایوب کے دور میں شرمندہ تعبیر ہو سکا اور نہ یحییٰ اور بھٹو کے دور میں مگر مسعود اشعر اپنے مخصوص افکار اور نظریات کے زیر اثر ایک صحیح بات کو ایسے دلائل کے ساتھ پیش کرتے ہیں جن پر فکری تعصب اور جانبداری کے علاوہ گروہی عصبیت کا رنگ غالب ہے اگرچہ پاکستان کے لبرل جبر اور پابندی کے خلاف بات کرتے ہیں مگر دہرے معیارات کے زیر اثر جیسا کہ معروف دانشور پروفیسر شریف المجاہد کہتے ہیں:

> پاکستان کے روادار (لبرل) عناصر کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اتنے بھی روادار نہیں جو کوئی اصولی موقف اختیار کریں ان کی توجہ کا مرکز شخصیات اور ان کی گرم گفتاری ہوتی ہے ان کی تائید اور مذمت دونوں اپنی پسند کے مطابق ہوتی ہے کہ کرنے یا کہنے والا کون ہے مثال کے طور پر بھٹو نے ۱۹۷۴ء میں جو ناقص فیصلہ کیا تھا اس پر کسی لبرل کے رد عمل کا شائبہ تک نظر نہیں آتا (یا مشرقی پاکستان میں فوجی کاروائی کے سلسلے میں یحییٰ خان کے ساتھ بھٹو کا گٹھ جوڑ یا بلوچستان میں فوجی کاروائی یا نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی یا متعدد جرائد و اخبارات کی بندش) مزید مثال یہ کہ آدم جی انعام یافتہ شوکت صدیقی نے ہفت روزہ الفتح میں جماعت اسلامی کے ترجمان، روزنامہ جسارت اور روزنامہ حریت کراچی کی بندش کی تائید کی اس فیصلے کو بہت سراہا ان اخبارات نے اگست ۱۹۷۳ء میں آنے والے سیلاب کی روداد شائع کی تھی۔(۳۲)

دائیں اور بائیں بازو کی غیر اصولی روش نے اخبارات کو کسی بھی قسم کے مثبت کردار سے محروم کر کے ایک منافع بخش انڈسٹری کا روپ دیا ہے جناب نعیم صدیقی لکھتے ہیں:

> خصوصیت کے ساتھ مناظرہ باز واعظوں کے طرز پر اب اخبارات نے یہ پختہ انداز اختیار کر لیا ہے کہ ہر ایک اپنے نظریات و مقاصد کے مطابق چیزوں کو اچھالتا

> ہے اپنے پسندیدہ گروہوں کو کھل کر جگہ دیتا ہے اور اپنے کالم نویسوں کا جھنڈا خوب اونچا کرتا ہے اور ان کا کوئی جواب دے تو اول تو اسے شائع نہ کیا جائے کیا جائے گا تو دیر کی جائے گی۔ پھر جب جگہ بھی دی جائے گی تو کتر بیونت کا خود ایجاد کردہ لامحدود حق استعمال کیا جائے گا بعض اوقات بے تکی سرخیوں سے مضمون کا پہلا اثر قاری کے لیے بدل دیا جائے گا بعض اوقات اصل بات مسخ کر دی جائے گی خبر کے چہرے کا مثلہ کر دیا جائے گا اور بیان کا حلیہ بدل دیا جائے گا زیادہ اہمیت کی چیز کو غیر اہم اور غیر اہم بات کو اہم بنا کر پیش کرنا لوگوں کے ذہنوں کو کسی بھی تجویز کردہ رخ پر ڈال دینا عوام کے ادنیٰ جذبات کو اکسا کر فائدہ اٹھانا یہ ایسی باتیں ہیں جو اب لازمہ صحافت بن گئی ہیں اور صحافت کا اثر روزانہ کی خوراکیں دینے کی وجہ سے نئی نسلوں پر بڑا گہرا ہوتا ہے۔(۳۳)

مختصر یہ کہ زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح صحافت کے محاذ پر بھی مادیت کا قبضہ ہے ہاں دوسرے نمبر پر اخبارات پر کبھی اسلام پسندوں کا رنگ غالب آتا ہے تو کبھی روشن خیالوں کا تاہم ایک مجموعی تاثر کے اعتبار سے اردو اخبارات کا فکری قبلہ اسلام پسندی کی طرف ہے جبکہ انگریزی اخبارات سیکولر اور روشن خیال طبقوں کی کمین گاہ ہیں مگر پاکستانی معاشرے میں کم تر شرح خواندگی کے باعث انگریزی اخبارات کا دائرہ کار عوامی سطح پر بے حد محدود ہے لیکن مؤثر طبقات اور جدید تعلیم یافتہ طبقوں کے ذہنوں پر انگریزی صحافت کا اثر زیادہ ہے۔ موسیٰ خان جلال زئی لکھتے ہیں:

> اس سارے کیس کا ایک اور پہلو دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ بعض اخبارات کے مالکان جن کے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں اخبارات چھپ رہے ہیں وہ دو مختلف اور متضاد پالیسی چلا رہے ہیں مثلاً ان کا اردو اخبار تو باقی اخبارات کے ساتھ چل رہا ہے لیکن انگریزی اخبار جوہری پروگرام اور ایٹمی دھماکے کے خلاف مضامین شائع کرتا رہا ہے زیادہ تر پاکستانی اخبارات خصوصاً انگریزی اخبارات کا قبلہ اول یہ بین الاقوامی ادارے ہیں جو اپنے فنڈز کے ذریعے اپنی مرضی کی خبریں اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رپورٹیں اخبارات میں شائع کرواتے ہیں اور اس طرح ان کی مرضی کی رائے عامہ کی تشکیل ہوتی ہے۔(۳۴)

کسی بھی ریاست اور حکومت میں صحافت کو کلیدی اہمیت حاصل ہوتی ہے بلکہ جدید دور میں صحافت ریاست کا پانچواں ستون کہلاتی ہے پاکستانی صحافت بھی دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح پاکستانی معاشرے کی فکری ضروریات پوری کرنے کی بجائے مادیت اور آزاد خیالی کی ترجمان ہے۔ ذرائع ابلاغ ریڈیو۔ ٹی وی اور اخبارات ورسائل پر بحث کو مکمل کرنے سے قبل ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کی روشنی میں یہ بات واضح کرلی جائے کہ ذرائع ابلاغ انسانی زندگی کے سب سے حساس اعضاء پر اثرانداز ہوتے ہیں اور انہی اعضاء سے انسانی شخصیت کی انفرادی واجتماعی تشکیل ہوتی ہے نیز یہی اعضاء انسانی شخصیت کا اصل اظہار اور ماخذ ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان اعضاء کی حفاظت، تربیت اور ان کے استعمال میں احتیاط کا درس دیا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد پاک ہے:

﴿ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا۔﴾(۳۵)

بے شک کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے پوچھ گچھ کی جانے والی ہے۔

انسان کے ذہنی خیالات اور قلبی جذبات کے پروان چڑھنے میں سماعت اور بصارت کی صلاحیت کلیدی کردار ادا کرتی ہے لہٰذا ذرائع ابلاغ انسانی سماعت اور بصارت کو ذریعہ بنا کر ہی دلوں اور ذہنوں میں جڑ پکڑتے ہیں اور اپنی مرضی کی شخصیت پروان چڑھاتے ہیں جس سے معاشرہ ذرائع ابلاغ کے زیر اثر سفر کرتا ہے۔ الیاس انصاری عہد حاضر کے ذرائع ابلاغ کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مغرب میں لبرل ازم نے خواہشات کی بے قید تکمیل کو انسانی زندگی کا مقصد قرار دیا اور اپنی زندگی اور جسم پر اختیار کو عورت کی آزادی اور نجات کا چارٹر، چنانچہ خاندانی زندگی تیزی سے منتشر و منہدم ہونے لگی اور جنسی بے راہ روی کا ایک سیلاب امنڈ آیا ابلاغ عامہ کے ذرائع کی طرف سے ہر قسم کی فحاشی اور تشدد کی بے محابا اشاعت اور ترغیب نے دو آتشہ کا کام کیا اس کی زد سب سے بڑھ کر بچوں پر پڑی ٹوٹے پھوٹے طلاق زدہ گھر، بے باپ کے گھر، ٹی وی اور دیگر میڈیا ان سب نے ایک طرف ننھے منے بچوں کو سنگین مجرم بنا دیا اور دوسری طرف خود بچوں

> کے خلاف ناقابل تصور جنسی اور تشدد کے جرائم میں بے تحاشا اضافہ کر دیا یہ ایک وسیع موضوع ہے آج عمومی طور پر دنیا بھر میں ویڈیو، فلم اور ٹیلی ویژن اپنے مخصوص عمل سے لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کو گمراہ کر کے ان کے راستے بدل رہے ہیں اور یہ سلسلہ کافی پرانا ہے عوام الناس کی نفسیات اور مشاہدے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ باتیں جن کا حقائق اور سچائی سے کوئی بھی تعلق نہ ہو۔ انہیں بار بار دہرانے سے لوگوں کے خیالات پر گہرا اثر ڈالا جا سکتا ہے۔ ٹیلی ویژن کے پس پردہ یہی فلسفہ کارفرما ہے کہ یہ انسانوں کے شعور ہی نہیں بلکہ لاشعور پر بھی اپنی گرفت مضبوط کرتا ہے مخصوص نظریات اور ثقافت ناظرین پر اس طرح لادنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ انہیں کسی نوعیت کا (ثقافتی حملہ یا) پراپیگنڈہ نہیں سمجھتے بلکہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ یہی ان کی اپنی طے شدہ رائے ہے۔
>
> جن ذرائع کو ذرائع ابلاغ کا نام دیا گیا ہے وہ دراصل انسانوں کی رائے کو بگاڑنے کے اوزار ہیں یعنی ریڈیو ٹیلی ویژن (اب ویڈیو، سٹلائیٹ اور کمپیوٹر گیمز وغیرہ) کے پروگرام اور اخبارات (رسائل و جرائد) چند افراد ان کو تیار کرتے ہیں اور لاکھوں افراد انہیں دیکھتے ہیں پھر لاشعوری طور پر ان کے مطابق ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔(۳۶)

پاکستانی معاشرہ ذرائع ابلاغ کی قوت سے کیسے اپنی شناخت کھوتا چلا گیا اس کا تذکرہ معروف مفکر پروفیسر شمیم احمد اپنی ذاتی یادداشتوں کے حوالے سے اس طرح کرتے ہیں:

> لیکن جب ٹی وی کے پروگرام شروع ہوئے تو آہستہ آہستہ کھلا کہ اس نشست میں جو کچھ سامنے آیا تھا اس پر پوری حکمتِ عملی سے عمل ہو رہا ہے جنریشن گیپ کے نام پر جس طرح ہماری تہذیبی اقدار، خاندانی روایت اور اسلامی اخلاق کی دھجیاں اڑائی جا رہی تھیں، مغرب سے درآمد شدہ جرائم پر مبنی فلموں کا جس قدر زور تھا، جس طرح مجرموں کو ہیروز کے روپ میں پیش کر کے عریانی اور میخواری کا زور باندھا گیا تھا جس طرح مشرقی لباس اور اسلامی اقدار کے ساتھ مضحکہ کیا جا رہا تھا وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رپورٹیں اخبارات میں شائع کرواتے ہیں اور اس طرح ان کی مرضی کی رائے عامہ کی تشکیل ہوتی ہے۔(۳۴)

کسی بھی ریاست اور حکومت میں صحافت کو کلیدی اہمیت حاصل ہوتی ہے بلکہ جدید دور میں صحافت ریاست کا پانچواں ستون کہلاتی ہے پاکستانی صحافت بھی دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح پاکستانی معاشرے کی فکری ضروریات پوری کرنے کی بجائے مادیت اور آزاد خیالی کی ترجمان ہے۔ذرائع ابلاغ ریڈیو۔ٹی وی اور اخبارات ورسائل پر بحث کو مکمل کرنے سے قبل ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کی روشنی میں یہ بات واضح کرلی جائے کہ ذرائع ابلاغ انسانی زندگی کے سب سے حساس اعضاء پر اثرانداز ہوتے ہیں اور انہی اعضاء سے انسانی شخصیت کی انفرادی واجتماعی تشکیل ہوتی ہے نیز یہی اعضاء انسانی شخصیت کا اصل اظہار اور ماخذ ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان اعضاء کی حفاظت، تربیت اور ان کے استعمال میں احتیاط کا درس دیا ہے۔سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد پاک ہے:

﴿ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا۔﴾(۳۵)

بے شک کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے پوچھ گچھ کی جانے والی ہے۔

انسان کے ذہنی خیالات اور قلبی جذبات کے پروان چڑھنے میں سماعت اور بصارت کی صلاحیت کلیدی کردار ادا کرتی ہے لہٰذا ذرائع ابلاغ انسانی سماعت اور بصارت کو ذریعہ بنا کر ہی دلوں اور ذہنوں میں جڑ پکڑتے ہیں اور اپنی مرضی کی شخصیت پروان چڑھاتے ہیں جس سے معاشرہ ذرائع ابلاغ کے زیر اثر سفر کرتا ہے۔الیاس انصاری عہد حاضر کے ذرائع ابلاغ کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مغرب میں لبرل ازم نے خواہشات کی بے قید تکمیل کو انسانی زندگی کا مقصد قرار دیا اور اپنی زندگی اور جسم پر اختیار کو عورت کی آزادی اور نجات کا چارٹر، چنانچہ خاندانی زندگی تیزی سے منتشر و منہدم ہونے لگی اور جنسی بے راہ روی کا ایک سیلاب امنڈ آیا ابلاغ عامہ کے ذرائع کی طرف سے ہر قسم کی فحاشی اور تشدد کی بے محابا اشاعت اور ترغیب نے دو آتشہ کا کام کیا اس کی زد سب سے بڑھ کر بچوں پر پڑی ٹوٹے پھوٹے طلاق زدہ گھر، بے باپ کے گھر، ٹی وی اور دیگر میڈیا ان سب نے ایک طرف ننھے منے بچوں کو سنگین مجرم بنا دیا اور دوسری طرف خود بچوں

> کے خلاف ناقابل تصور جنسی اور تشدد کے جرائم میں بے تحاشا اضافہ کر دیا یہ ایک وسیع موضوع ہے آج عمومی طور پر دنیا بھر میں ویڈیو، فلم اور ٹیلی ویژن اپنے مخصوص عمل سے لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کو گمراہ کر کے ان کے راستے بدل رہے ہیں اور یہ سلسلہ کافی پرانا ہے عوام الناس کی نفسیات اور مشاہدے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ باتیں جن کا حقائق اور سچائی سے کوئی بھی تعلق نہ ہو۔ انہیں بار بار دہرانے سے لوگوں کے خیالات پر گہرا اثر ڈالا جا سکتا ہے۔ٹیلی ویژن کے پس پردہ یہی فلسفہ کارفرما ہے کہ یہ انسانوں کے شعور ہی نہیں بلکہ لاشعور پر بھی اپنی گرفت مضبوط کرتا ہے مخصوص نظریات اور ثقافت ناظرین پر اس طرح لادنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ انہیں کسی نوعیت کا (ثقافتی حملہ یا) پراپیگنڈہ نہیں سمجھتے بلکہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ یہی ان کی اپنی طے شدہ رائے ہے۔
>
> جن ذرائع کو ذرائع ابلاغ کا نام دیا گیا ہے وہ دراصل انسانوں کی رائے کو بگاڑنے کے اوزار ہیں یعنی ریڈیو ٹیلی ویژن (اب ویڈیو، سٹلائیٹ اور کمپیوٹر گیمز وغیرہ) کے پروگرام اور اخبارات (رسائل و جرائد) چند افراد ان کو تیار کرتے ہیں اور لاکھوں افراد انہیں دیکھتے ہیں پھر لاشعوری طور پر ان کے مطابق ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔(۳۶)

پاکستانی معاشرہ ذرائع ابلاغ کی قوت سے کیسے اپنی شناخت کھوتا چلا گیا اس کا تذکرہ معروف مفکر پروفیسر شمیم احمد اپنی ذاتی یادداشتوں کے حوالے سے اس طرح کرتے ہیں:

> لیکن جب ٹی وی کے پروگرام شروع ہوئے تو آہستہ آہستہ کھلا کہ اس نشست میں جو کچھ سامنے آیا تھا اس پر پوری حکمتِ عملی سے عمل ہو رہا ہے جنریشن گیپ کے نام پر جس طرح ہماری تہذیبی اقدار، خاندانی روایت اور اسلامی اخلاق کی دھجیاں اڑائی جا رہی تھیں، مغرب سے درآمد شدہ جرائم پر مبنی فلموں کا جس قدر زور تھا، جس طرح مجرموں کو ہیروز کے روپ میں پیش کر کے عریانی اور میخواری کا زور باندھا گیا تھا جس طرح مشرقی لباس اور اسلامی اقدار کے ساتھ مضحکہ کیا جا رہا تھا وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سب وہی تھا جس کی نشاندہی اس نشست میں کی جا چکی تھی (تذکرہ ہے ٹی وی کے پہلے جنرل مینجر کے ساتھ نشست کا جس میں انہوں نے ٹی وی کے قیام کے لبرل مقاصد کا اظہار کیا تھا اور پروفیسر شمیم اختر اس میں موجود تھے) ایوب خان کا آخری زمانہ تھا اور الطاف گوہر، ابھی سیکرٹری اطلاعات تھے آج کے الطاف گوہر اور اس الطاف گوہر میں بہت بڑا فرق تھا اس وقت انہوں نے بھٹو کے ہاتھوں زخم نہیں کھائے تھے اور ایک ممتاز بیوروکریٹ کی حیثیت میں ان سے میرا واحد دور کا رشتہ ادب کا رشتہ تھا چنانچہ میں نے انہیں اسی نشست کی روداد لکھتے ہوئے ایک خط لکھا کہ میں آپ کی مجبوری سمجھتا ہوں کہ ایک بیوروکریٹ کو اپنی نوکری قائم رکھنے اور ترقی کی خواہش کے لیے حکومت کو خوش کرنے کے لیے کیا کیا کرنا پڑتا ہے لیکن ادب کے رشتہ سے جس الطاف گوہر سے واقف ہوں اس سے مجھے یہ امید نہیں لگتی کہ وہ اسلام، پاکستان کی بنیادی اقدار اور اس کے عوام کی خواہشات کے خلاف بھی استعمال ہو سکتا ہے اس کا جواب مجھے نہیں ملا مگر اچانک اسلم اظہر صاحب کے ایک فرستادہ میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ اسلم اظہر صاحب آپ سے فوراً ملنا چاہتے ہیں آپ وقت دے دیں وہ آجائیں گے میں اتنے بڑے صاحب بہادر کی توجہ پر حیران ضرور ہوا کیونکہ اس سارے عرصے میں انہوں نے مجھے بھولے سے یاد نہیں کیا تھا میں نے کہا میں خود ان سے مل لوں گا۔

اسلم اظہر صاحب سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ الطاف گوہر صاحب کی ہدایت پر وہ مجھ سے ٹی وی کے بارے میں مکمل تحریری رپورٹ اور تجاویز چاہتے ہیں میں نے ان کو یہ مکمل رپورٹ چند روز میں دے دی اور آج اسی کی نقل کے حوالے سے آپ کے سامنے یہ روداد پیش کر سکا ہوں مجھے چند روز بعد یہ اطلاع دی گئی کہ میری رپورٹ کا جائزہ اعلیٰ سطح پر لیا جا رہا ہے لیکن زمانہ تیزی سے بدل رہا تھا اور تھوڑے سے عرصے کے بعد ۷۰ کے انتخابات ہو رہے تھے پیپلز پارٹی کے جلسوں

میں اسلم اظہر صاحب بنفس نفیس شریک ہو رہے تھے اور جیسے ہی انتخابات کا اعلان ہوا ٹی وی کا کریلا اور نیم چڑھا ہو گیا اور وہ ننگا کھیل شروع ہو گیا جس کا انتظار تھا اسلام اور ہماری تہذیب کے خلاف ہر تیر زیادہ زہریلا ہو گیا تھا ٹی وی پر عورتیں آنکھیں مارنا سکھا رہی تھیں اور اپنی بغلوں کی نمائش کر رہی تھیں جج فلم کے ساتھ میں نے یہ تماشا بھی دیکھا کہ اس سے قبل کمال شو دکھایا گیا اور جج فلم کے فوراً بعد ایک نہایت عُریاں فلم کی نمائش رکھی گئی نئی نسلوں کے ذہنوں سے بہر قدر مذہبی تقدس مٹانے کے لیے ہر سطح پر یہ اہتمام کیا جا رہا تھا میں نے ایسے گھرانے میں جہاں کی تربیت ابھی تک مسلم معاشرے کی تمام خصوصیات سنبھالے ہوئے تھی اور جہاں پردہ ابھی باقی تھا یہ دیکھا کہ مذہبی پروگراموں کے وقت ٹی وی بند کر دیا جاتا تھا کمال شو اور فلم شو میں گھر کا ہر فرد اور ہر بچہ موجود ہوتا تھا جج فلم دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ پانچ وقت کے صوم و صلوٰۃ دادا کے ساتھ پوتے پوتیاں ڈانس کرتے تھے اور آنکھیں مارتے تھے اور کیسا سوہان روح منظر تھا جب میں نے ان بزرگ کو ٹی وی کے کسی پروگرام کے لیے مغرب کی اذان سے قبل مغرب کی نماز اور عشاء کی نماز رات کو گیارہ بجے ادا کرتے دیکھا ترقی اور تفریح کے نام پر جو چاٹ لگا دی تھی وہ تباہ کر رہی تھی ذرائع ابلاغ کا ایک مؤثر ترین ادارہ پاکستان میں ہر اسلامی، اخلاقی اور تہذیبی قدر کے شعور کو اجاگر کرنے کی بجائے اس کے خلاف جہاد کر رہا تھا الطاف گوہر جیل میں تھے میں اسلم اظہر صاحب سے اپنی رپورٹ کے نتیجے کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے ملا ان کا جواب تھا شمیم صاحب ہم نے آپ سے رپورٹ اس وقت مانگی تھی جب ہم آپ کو معاشرے کی اکثریت کا نمائندہ سمجھ رہے تھے مگر انتخاب کے نتائج نے ثابت کر دیا ہے کہ عوام نے آپ کے نقطۂ نظر کے خلاف ووٹ دیا ہے اور ہمارے نقطۂ نظر کی تائید کی ہے۔(۳۷)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پروفیسر شمیم احمد کے بیان سے ذرائع ابلاغ کے طاقتور آلے ٹیلی ویژن کی سرکاری سرپرستی میں فکری سمت کا اندازہ تو ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ پاکستانی معاشرے میں تہذیب اور کلچر کی سطح پر اقدار کی تبدیلی میں ٹی وی کے اثرات و نتائج بھی سامنے آتے ہیں لیکن سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ معاشرے نے ٹیلی ویژن کے لبرل پروگراموں کو نہ صرف قبول کیا بلکہ انتخابات میں ایسی ہی قیادت کا انتخاب کیا جو آزاد خیالی کی پشت پناہ بن سکے اور پھر آہستہ آہستہ معاشرے کی قوتِ مزاحمت بھی اس کے سامنے دم توڑتی چلی گئی۔

فصل سوم

لبرل ازم کے فروغ میں این جی اوز کا کردار

بیسویں صدی میں عالمی جنگوں کے بعد عالمی سامراج نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اپنی حکمتِ عملی کو نئے سرے سے ترتیب دیا تو سامراجی تہذیب کی دیگر معاشروں اور ممالک میں نفوذ پذیری کے لیے این جی اوز کا راستہ اختیار کیا گیا۔ بظاہر یہ تنظیمیں رضاکارانہ طور پر معاشرے کے پسے ہوئے اور استحصال کا شکار طبقات کی رضاکارانہ خدمات سرانجام دینے کا پروگرام بناتی ہیں مگر پس پردہ کئی دیگر مقاصد کو ترجیح حاصل ہوتی ہے بالعموم این جی اوز درج ذیل مقاصد کے لیے کام کرتی ہیں۔

- بچوں کی بہبود
- نوجوانوں کی بہبود
- معذوروں کی بھلائی
- تفریحی پروگرامات
- سماجی تعلیم اور تعلیم بالغاں
- قیدیوں کی فلاح و بہبود
- بھکاریوں کی بھلائی
- صحت عامہ اور طبی سہولتوں کی فراہمی
- سماجی بہبود کے کاموں کی تربیت اور سماجی خدمت کے اداروں میں باہم تعاون کو فروغ دینا
- نشے اور دیگر سماجی برائیوں کے خلاف جدوجہد
- ریٹائرڈ افراد کی بھلائی
- عورتوں کے حقوق کی جدوجہد
- آلودگی کے خلاف مہم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ این جی اوز عام معاشرے سے بھی فنڈز اکٹھے کرتی ہیں لیکن فی الواقع ان کو حکومتی فنڈز بھی ملتے ہیں اور ایسی تنظیموں کی ایک کثیر تعداد بیرونی ممالک سے بھی بھاری فنڈز وصول کرتی ہیں۔ اقوام متحدہ کے کئی ادارے بھی سماجی ترقی، عورتوں اور بچوں کے حقوق کے نام پر بڑے بڑے فنڈز فراہم کرتے ہیں۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے اس وقت ملک بھر میں کوئی تیس ہزار (۳۰۰۰۰) رضاکار تنظیمیں کاغذوں پر موجود ہیں ان میں سے نصف سے زائد پنجاب میں ہیں پنجاب کے صوبائی محکمہ سماجی بہبود کے ساتھ رجسٹر ہونے والی تنظیموں کی تعداد ۴۶۶۱ ہے ان میں وہ تنظیمیں بھی شامل ہیں جو عملاً غیر فعال ہیں انہیں مردہ تنظیمیں بھی کہا جاتا ہے۔(۳۸)

اس امر کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد آزاد خیال عناصر نے بڑے زور و شور سے پاکستان کو ایک سیکولر سٹیٹ بنانے کا آغاز کیا اور قیادت کی سطح پر زبردست کشمکش کا آغاز ہوا اسی دور میں ایک لبرل معاشرے کی تعمیر کے لیے بھی جدوجہد کا آغاز کر دیا گیا جس کو حکومتی سرپرستی حاصل تھی۔ موسیٰ خان جلال زئی لکھتے ہیں:

ہمارے ہاں ۱۹۵۱ء میں جب رعنا لیاقت علی نے اپوا (Apwa) کے نام سے این جی او قائم کی تو اس کے پس پردہ ان بین الاقوامی اداروں کی بھرپور تائید موجود تھی اس این جی او کا مقصد خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا تھا مگر اس نے خواتین کی فلاح و بہبود کے نام پر خواتین کو بے حیائی کی راہ پر لگایا اور انگریزی تہذیب و تمدن کو فروغ دیا۔ اس کے پیچھے بین الاقوامی قوتوں کے فنڈز کے ڈھیر موجود تھے ملکی و بین الاقوامی سطح پر خوب عزت اور شہرت بخشی گئی بیرونی ممالک سے سیر سپاٹوں کی دعوتیں آنے لگیں بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے اصرار کیا جانے لگا اور حکومتیں امریکہ کے خوف سے انہیں سر آنکھوں پر بٹھانے لگیں تو دیکھا دیکھی دوسرے سیکولر عناصر کو بھی یہ اچھا اور منافع بخش پیشہ ہاتھ آگیا اس ایک این جی او کے قیام کے بعد پھر دوسرے میدانوں میں کام کرنے کے لیے دوسری کئی این جی اوز کا قیام بھی عمل میں آنے لگا۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ پوری دنیا میں پانچ کروڑ کی تعداد میں این جی اوز اپنا کھیل کھیل رہی ہیں پاکستان میں ان این جی اوز کی تعداد تیس ہزار ہے جبکہ صرف صوبہ پنجاب میں ۵۹۶۷ کی تعداد میں موجود ہیں جن میں صرف ۱۹۴۱ این جی اوز پر پابندی لگائی گئی جب بیگم

رعنا لیاقت نے این جی او بنائی تھی تو اس وقت یہ محض خواتین کے حقوق کے لیے بنائی گئی تھی مگر بعد ازاں سیاسی، معاشی اور معاشرتی ہر میدان میں ملک کی نظریاتی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کے لیے این جی اوز آموجود ہوئیں پاکستان میں بننے والی این جی اوز کو عالمی بینک اور آئی ایم ایف کی پالیسیوں سے بھی پنپنے کا موقع ملا پہلے تو ان عالمی مالیاتی اداروں نے پاکستان کی معیشت کو قرضوں کی معیشت میں تبدیل کر دیا اور بعد ازاں اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشی مسائل کے لیے اپنی تربیت یافتہ این جی اوز کے ذریعے یہ حل قوم پر مسلط کرنے کی کوشش کی کہ ایٹمی میزائل پروگرام بند کر دیا جائے۔ موسیٰ خان جلال زئی Naoki Suzuki کی کتاب "Inside NGOs" سے اقتباس نقل کر کے این جی اوز کے مقاصد کو مزید وضح کرتے ہیں:

> Develop room for NGO's to show their own intensions. Then donors attempt to select an appropriate NGO to fund, they are advised to understand what funding means for NGO's and how NGO's deal with donors. However, understanding NGO's real intensions is difficult, because the necessity of funding is the singular most important reality NGO's expend significant effort in seeking funds and may even change their mission for the sake of getting funds. Thus donors should understand that NGO's proposals or reports do not necessiraily represent the mission of NGO's.(۳۹)

گویا کہ این جی اوز زیادہ تر خریدے ہوئے لوگوں کی آماجگاہ ہوتی یا پھر وہ خود اپنی قیمت لگوانے کے لیے ہر مقصد کے لیے کام کرنے کو تیار ہوتی ہیں اس المناک اور افسوسناک صورتحال کی بنیاد تاریخ پاکستان کے پہلے چند برسوں میں ہی رکھ دی گئی تھی جب پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کی اہلیہ رعنا لیاقت نے اپوا قائم کر کے حکومتی سرپرستی میں لبرل ازم کو تقویت دی۔ لبرل ازم کے لیے این جی اوز حالات کو کس طرح سازگار بناتی ہیں نجم الحسن عارف اپنے مضمون "این جی اوز اور بیرونی ممالک سے بھاری فنڈز" میں تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں:

> این جی اوز کے بیرونی رابطے محض مالی حوالے سے نہیں ہیں بلکہ سیاسی اعتبار سے بھی ان این جی اوز کو چلانے والی شخصیات بیرون ملک پاکستان کے کسی بھی بڑے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیاستدان سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ سیاستدان اگر کسی غیر ملکی دباؤ یا اقتدار کے لالچ میں آگے بڑھتا ہی چلا جائے تو عوامی جوابدہی کا احساس اسے دامن گیر رہتا ہے لیکن این جی اوز اس حوالے سے مادر پدر آزاد ہیں یہ نہ کسی ضابطے کی پابند ہیں نہ کسی کو جوابدہ ہیں حتی کہ اب تو ان کی اہمیت یہ ہو گئی ہے کہ یہ ایک ایسے پریشر گروپ کی صورت اختیار کر گئی ہیں جن کی خدمات اور تعاون کی مقامی سیاسی جماعتوں کو بھی ضرورت پیش آنے لگی ہے جن قومی ایشوز پر سیاسی جماعتیں عوامی رد عمل کے خوف سے لب کشائی نہیں کر سکتیں ان کے لیے یہ این جی اوز انہیں چھتری فراہم کرتی ہیں مثلاً گزشتہ سال حکومت نے پندرھویں ترمیم کا بل قومی اسمبلی میں پیش کیا تو بعض سیاسی جماعتیں جو اگرچہ ایک سیکولر امیج رکھتی ہیں پندرھویں ترمیم پر صرف پارلیمنٹ کے اثرات اور اختیارات کے ارتکاز کے حوالے سے تنقید کرتی ہیں بلکہ یہ تک کہتی رہیں کہ وہ اسلام کی مخالف نہیں لیکن پندرھویں ترمیم کی حمایت نہیں کریں گی بلکہ اس کی مزاحمت کی جائے گی حتی کہ اجمل خٹک نے بھی اسلام کے ساتھ گزشتہ دنوں اپنی کمٹمنٹ کا اظہار ضروری سمجھا ہے لیکن این جی اوز ایک ایسی کمیونٹی ہیں جو اسلام کے خلاف بات کرتے ہوئے کسی احتیاط کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں اسلام کے خلاف یہ اپنی آواز جتنی بلند کرتی ہیں غیر ملکی مارکیٹ میں ان کا ریٹ اتنا ہی بڑھنا شروع ہو جاتا ہے پاکستان میں ان پر کوئی مشکل آتی ہے تو پورا یورپ اور امریکہ ان کی پشت پر موجود ہوتا ہے حد یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں معاشرتی اقدار کو پامال کرنے والے اور اسلام کا چہرہ مسخ کرنے والے خواتین و حضرات بھی امریکہ اور یورپ میں عزت اور احترام کے مستحق سمجھے جاتے ہیں ان کے لیے راتوں رات ویزوں کا بندوبست ہوتا ہے اور انہیں منہ اندھیرے ملک سے باہر "سمگل" کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ قانون کی نظر اور زد سے بچ سکیں امریکہ اور یورپ کی یہ بھی عجیب بات ہے کہ اپنے ہاں تو معاشرتی اقدار و روایات پامال کرنے پر صدر کو بھی معافی دینے پر تیار نظر نہیں

آتے لیکن پاکستان میں قانون کی عملداری اور اقدار و روایات کا امین معاشرہ انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا اسلام کے خلاف اہل یورپ نے شروع سے ہی "این جی اوز" کو فعال کرنے کا منصوبہ بنا لیا تھا قرار دادِ مقاصد پاس ہونے کے زمانے میں ہی "اپوا" قائم ہو گئی تاکہ اسلام کے حوالے سے ہونے والی اس پیش رفت کو ابتداء ہی میں روک دیا جائے یقیناً اہل یورپ کی یہ حکمتِ عملی کامیاب رہی اور قرار دادِ مقاصد تین دہائیوں سے زیادہ عرصے تک پاکستان کے آئین کا آپریٹو حصہ بن سکی اور نہ اس پر عمل کی کوئی راہ ہموار ہو سکی۔

۱۹۷۰ء کی دہائی میں دستور کی منظوری اور اس میں اسلامی دفعات شامل ہونے پر اہل مغرب اور سوشلزم کے حامی اپنی اپنی جگہ ہوشیار ہو گئے کہ اگر جغرافیائی اہمیت کے علاقے میں قائم پاکستان اسلام کا گہوارہ بن گیا تو روشنی کی یہ لہر افغانستان کے راستے وسط ایشیاء تک اور خلیج کے راستے عرب دنیا تک پہنچ جائے گی اسی طرح آر سی ڈی کے نام سے ایران، پاکستان اور ترکی میں خلافت کے خاتمے کے بعد پھر ایک بار اسلام کی طرف مائل ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا کیونکہ امریکہ اور حلیف قوتیں ایران میں شہنشاہیت کو اپنے انجام کی طرف جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اس سارے تناظر میں اسلام کی ایک ایسی لہر ابھر سکتی تھی جس کے اثرات ایک طرف یورپ تک پہنچ سکتے تھے اور دوسری جانب یورپ، امریکہ اور سوویت یونین کی اجتماعی اولاد اسرائیل کے لیے خطرے کا موجب بن سکتی تھی اسلام سے خائف امریکہ، یورپ اور سوویت یونین کے دانشوروں نے اپنے اپنے طور پر اس خوف کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کی متفقہ منظوری بھی ایک طرح سے پاکستان کے استحکام کی کڑی تھی جو پاکستان کے ہمسائے بھارت کے لیے بھی کسی صورت خوش کن نہ تھی نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف ایک ارتعاش اور سرسراہٹ محسوس کی گئی اسی دہائی میں جب تحریکِ ختمِ نبوت شروع ہوئی اور ذوالفقار علی بھٹو مرحوم عوامی تحریک کے سامنے اپنے موقف پر قائم نہ رہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکے اور انہوں نے قادیانیوں کو اقلیت قرار دیا تو وہ تمام قوتیں متحرک ہو گئیں جو اسلام اور پاکستان کے حوالے سے مثبت سوچ نہ رکھتی تھیں ذوالفقار علی بھٹو جو کہ نظریاتی اعتبار سے سوشلزم کے حامی تھے ان کے ہاتھوں اس اقدام سے ملک کے اندر اور باہر وہ قوتیں ان سے مایوس ہو گئیں جو پہلے بلاشبہ یہ توقع رکھتی تھیں کہ بھٹو مرحوم کی ذہین و فطین شخصیت اسلام پسندوں کے کسی ایسے دباؤ میں نہ آئے گی پاکستان کو معاشی حوالے سے مغربی جمہوری کلچر کے قریب لانے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن قادیانیوں کو اقلیت قرار دیئے جانے کے واقعے نے تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا اگرچہ اس سے قبل بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے میں جس فراخدلی کا ثبوت بھٹو مرحوم نے دیا تھا اس پر مذکورہ حلقے خوش تھے لیکن قادیانیوں والے معاملے میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دینا بھٹو مرحوم کی ایسی غلطی تھی جو قابل معافی نہ تھی۔

ملک کے اندر کے آزاد خیال حلقوں اور غیر ملکی طاقتوں نے اپنی سپاہ کو این جی اوز کے نام پر پاکستان میں اتارنے کا فیصلہ کیا اس کا بنیادی مقصد اسلام کے حوالے سے ہونے والی سرگرمیوں پر نظر رکھنا اور ان کی مزاحمت کرنا تھا بھٹو صاحب کی حکومت دھاندلی کے الزام میں مسائل کا شکار ہو گئی تو ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء لگ گیا جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء ابھی جاری تھا کہ افغانستان میں سوویت فوجیں داخل ہو گئیں افغان قوم کی مزاحمت جہاد کے حوالے سے سامنے آئی اہل پاکستان نے بھی دامے، درمے، سخنے اس جہاد میں حصہ لینا ضروری سمجھا نتیجتاً اس پورے خطے میں اسلام، جہاد، شہادت اور ہجرت کے حوالے سے اسلام کے ساتھ لوگوں کی وابستگی کا بے مثال اظہار سامنے آنے لگا اس صورتحال میں آزاد خیال حلقوں، عالمی سامراجی طاقتوں اور اداروں نے اپنی مشترکہ "سپاہ" کو پاکستان میں زیادہ سرگرم اور فعال ہونے کے لیے ہر ممکن سہولت فراہم کرنا شروع کر دی دولت، شہرت اور عزت سب انعام ان کے لیے حاضر کر دیے اس سپاہ میں وہ لوگ جو

کبھی بائیں بازو کے محاذ پر سرگرم تھے سوویت یونین کی افغانستان میں شکست کے بعد اس محاذ سے ایسے پسپا ہوئے کہ انہیں نئے مقامات و مکان کی حاجت ہوئی نظریات کی فائل سے نکل کر مالیات کی فائل میں آ گئے یہ کام زیادہ دلچسپ اور منفعت بخش تھا اس پر ہینگ لگتی نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آتا تھا ماضی میں سڑکوں پر مارے مارے پھرنے والے جو چائے خانوں میں عام میلے کچیلے لوگوں کے ساتھ گپ لگاتے تھے دیواروں پر پوسٹرز لگاتے تھے، مزدوروں کے سنگ رہتے تھے لیکن اب ان کی دنیا ہی جدا ہو گئی مارے مارے پھرنے کی بجائے گاڑیاں مل گئیں جو سڑکوں پر فراٹے بھرتیں تو ایک سہانے خواب کی تعبیر معلوم ہوتی عام چائے خانوں کی بجائے اب فائیو سٹار ہوٹلوں کی لابیاں اس نئی لابی کے لیے ہمہ وقت چشم براہ ہوتیں مزدوروں کی جگہ اب ان کا مالکان سے براہِ راست رابطہ تھا جن کے مظالم سے "شکاگو" کا ہولناک واقعہ یکم مئی کو پیش آیا تھا "مالکان" کے ساتھ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے کے تو اپنے ہی مزے ہوتے ہیں "خود عزتی" کو دل چاہتا ہے بائیں بازو کے ان عناصر نے فیصلہ کیا کہ ماضی میں وہ جو نقطۂ نظر سرخ سویرے کے حوالے سے رکھتے تھے اب اس کا دور بیت چلا ہے۔ اب نظریات کی خدمت بھی کریں گے اور معاوضہ بھی بھرپور لیں گے پاکستان کے دستور میں آٹھویں ترمیم اس حوالے سے ایک سنہری موقع تھا جو اس سپاہ کے ہاتھ آیا عالمی سامراجی طاقتوں کو اسلام کی ایسی سفاکانہ تصویر بنا کر دکھائی کہ اس سپاہ کے بجٹ میں روز بروز اضافہ ہو گیا جوں جوں ملک میں اسلام کی بات عام ہونے لگی این جی اوز کی تعداد اور سرگرمیاں بھی بڑھنے لگیں اس "سپاہ" میں ان حلقوں نے بھی اپنا حصہ فعالیت سے ادا کیا جنہیں بھٹو دور میں اقلیت قرار دے دیا گیا تھا اب صورتحال یہ ہے کہ اسلام کے خلاف کوئی بات کرنا ہو یہ این جی اوز حاضر ہیں۔ انکا پلیٹ فارم ملک کے اندر ہر اس فرد اور گروہ کے لیے حاضر ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے ہلکا سا بھی معاندانہ طرزِ عمل رکھتا ہے ضیاء دور میں اسلام کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عملی نفاذ کا معاملہ تو تکمیل کو نہ پہنچ سکا لیکن غیر ملکی سپاہ کی تشکیل و تکمیل بہر حال ہو گئی اور یہ سپاہ ہر طرح کے جدید وسائل سے مسلح کر دی گئیں مواصلات کے جدید ترین ذرائع دفاتر کے لیے اپنی عالی شان عمارات، دل خوش کن معاوضے اور دل آویز ماحول سب حاضر اور موجود ہے غیر ملکی فنڈز سے چلنے والی کسی بھی این جی اوز کے ہاں چلے جائیں وہاں ایک ایسا کلچر پروان چڑھا ہوا ملے گا جس کا تعلق اس دھرتی یا اس دھرتی کی اقدار و روایات سے نہیں بلکہ "مغربی روایات" سے ملتا ہے ان این جی اوز کی تقریبات میں بھی شرم و حیاء سے عاری مناظر دیکھنے میں آتے ہیں ان تقریبات میں خواتین و حضرات سرِعام گلے ملنے سے بھی نہیں چوکتے ان تنظیموں میں شامل خواتین کی بڑی تعداد انہی طبقوں کی نمائندہ ہے جو گزشتہ پچاس سالوں میں عام آدمی کے استحصال کی ذمہ دار ہے۔(۴۰)

مسلم لیگ نواز گروپ کی حکومت توڑ کر برسرِ اقتدار آنے والی فوجی حکومت کی کابینہ میں بطور خاص این جی اوز کے نمائندے فیصلہ سازی کے حساس ترین مقام اور منصب تک پہنچ گئے ہیں اس سلسلے میں وفاقی وزیر عمر اصغر خان اور صوبائی وزیر شاہین عتیق الرحمٰن کا خاص طور پر تذکرہ کیا جاتا ہے جناب عمر اصغر خان تو ویسے بھی جناب اصغر خان کے فرزند ہیں جن کی زندگی پاکستان کو ایک سیکولر سٹیٹ بنانے کا خواب دیکھتے گزری ہے۔ مسلم لیگ کی حکومت کے صوبائی وزیر بن یامین رضوی نے این جی اوز کے خلاف بڑی موثر اور منظم مہم کا آغاز کیا تھا مگر نواز حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی این جی اوز کے لیے نئے موسم بہار کا آغاز ہو گیا جناب عمر اصغر خان نے دھمکی آمیز لہجے میں بیان دیا کہ این جی اوز کا تحفظ حکومت کی ذمہ داری ہے ہر صورت میں عہدہ براء ہوں گے۔(۴۱)

مذکورہ بیان سے پاکستان میں این جی اوز کے اثر و رسوخ اور نفوذ کا اندازہ کرنا مشکل نہیں، مذہبی طبقات نے اس بیان پر اپنے شدید ردعمل کا ثبوت دیا جامعہ نعیمیہ لاہور کے ترجمان رسالے ماہنامہ عرفات میں جناب عبدالرشید ارشد نے لکھا:

> ماضی میں بادشاہوں کے وزراء کے متعلق باندبیر کا لفظ معروف تھا بلکہ لکھا ہی وزیر باندبیر جاتا تھا مگر ۲۱ ویں صدی کی طرف سفر کیا شروع ہوا ہے کہ وزیر بے

> تدبیر بنتے چلے گئے اور میر جعفر و میر صادق کی طرح اپنی دھرتی کا حق نمک ادا کرنے کی بجائے غیر ملکی آقاؤں کے نمک کی لاج رکھنے کی خاطر ہر لحہ بے قرار دیکھے جاتے ہیں۔
>
> NGO's، Non Governmental Organizations کا مخفف ہے عرف عام میں سماجی رفاہی اداروں پر منطبق کیا جاتا ہے مگر قوم جن کو NGO مافیا کے نام سے پکارتی ہے ان کا سماج کی بہبود سے دور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ یہ امر واقع ہے کہ غیر ملکی سرمایہ پر پلنے والا یہ سماج دشمن مافیا ہے جو غیر ملکی آقاؤں کی ضروریات پوری کرتا ہے یہ ممکن ہے کہ بعض شعور سے یہ خدمت سرانجام دے رہے ہوں تو بعض غیر شعوری ایجنٹ ہوں مگر اس میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ مقاصد غیروں ہی کے پورے کرتے ہیں۔(۴۲)

بظاہر تو یہ این جی اوز سماجی فلاح و بہبود، تعلیم اور صحت کے میدانوں میں خدمات سرانجام دینے کا دعویٰ کرتی ہیں مگر فی الحقیقت ہماری معاشرتی اقدار اور خاص طور پر پاکستانی معاشرے کا خاندانی نظام تبدیل کرنا اور غیر مستحکم کرنا ان این جی اوز کا اصل ہدف ہے اس غرض کے لیے یہ تنظیمیں مردوں سے زیادہ عورتوں کو استعمال کرتی ہیں کیونکہ اچھائی یا برائی دونوں معاملوں میں عورت میں قبولیت کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ عبدالرشید ارشد لکھتے ہیں:

> یہود و نصاریٰ کی مشترکہ خواہش و کاوش ہے کہ مسلمان کے قلوب و اذہان سے اسلامی اقدار اور شعائر سے محبت کھرچ کر اسے قطعاً "بے ضرر انسان" کے قالب میں ڈھال دیا جائے اور عورت کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے کہ عورت مرد کو نہ صرف موم بناتی ہے بلکہ خود اس کا بگاڑ خاندانوں کا بگاڑ ثابت ہوتا ہے۔(۴۳)

ماہنامہ ترجمان القرآن میں جناب عنایت اللہ اسماعیل این جی اوز کے خوابوں کے معاشرے کی جھلک دکھاتے ہیں۔

> ۱۰ فی صد خاندان بغیر باپ کے پائے جاتے ہیں یعنی ناچاقی کے باعث علیحدگی ہو چکی ہے یا ماں کے سر پر ناجائز بچوں کی کفالت کی ذمہ داری بھی ہے ۱۵ سال کی عمر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تک پہنچ کر اکثر بچے اپنے گھروں کو چھوڑ دیتے ہیں ۱۳ سال کی عمر ہی سے بچوں میں شراب کی لت پڑ جاتی ہے معاشرے کے صرف ۱۰ فی صد افراد بوجوہ شراب نہیں پیتے خواتین اور بوڑھے رات کے وقت تنہا کہیں جا نہیں سکتے ۷۰ فی صد ایسے لڑکے اور لڑکیاں تھیں جن کو ان کے محبوب یا منگیتروں نے موت کے گھاٹ اتارا میاں بیوی کے تعلقات کچے دھاگوں میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں جو ذرا ذرا سی بات پر طلاق پر منتج ہوتے ہیں۔ معاشرے کا ہر فرد اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتا ہے پارکوں میں جا بجا بوڑھے لوگ الگ الگ اکیلے بیٹھے دور خلاؤں میں تکتے نظر آتے ہیں آخری عمر میں بزرگوں کا ٹھکانہ اولڈ ہاؤس ہوتے ہیں جہاں وہ مرتے دم تک صرف اپنے بچوں کی یادوں کو سینے میں بسائے ان سے ملنے کی آرزوئیں ہی کرتے رہتے ہیں سال میں ایک آدھ مرتبہ کرسمس کارڈ یا فادرز ڈے اور مدرز ڈے کا مبارکبادی پیغام مل جائے تو ان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا اسکولوں اور دفاتر کے باتھ رومز میں "کنڈومز" موجود رہتے ہیں تاکہ تعلیم حاصل کرتے وقت یا کام کے دوران "جنسی جذبات" بیدار ہو جائیں تو خواتین و حضرات اور طلبہ وطالبات "محفوظ طریقوں" سے اپنی سفلی خواہشات کی تسکین کر لیں۔(۴۴)

این جی اوز اپنے مرعوبانہ ذہن اور لبرل نظریات کے باعث مغربی معاشرے کی ظاہری چکا چوند سے اتنا متاثر ہوتی ہیں کہ انہیں اپنے ہاں کا وہ معاشرتی اطمینان نظر نہیں آتا جو آج بھی پسماندگی، جہالت، معاشی ابتری کے باوجود خاندانی مسرت، بزرگوں کے احترام، بچوں سے شفقت اور اخلاقی اقدار کی صورت میں ہمارا امتیاز ہے جس کا مغربی معاشروں میں تصور بھی محال ہے۔

پٹنہ یونیورسٹی انڈیا کے سابق وائس چانسلر پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

> پردہ تقریباً اٹھ گیا ہے مغربی تہذیب کے ڈرامے کا سین ہمارے سامنے ہے۔ نئے کلچر کے نام پر وحشت کی ہوائیں چل رہی ہیں، گھروں کے خیمے اکھڑ رہے ہیں، بازار کی رونق بڑھ رہی ہے، پارک آباد ہو رہے ہیں، ہوٹل گھر بن رہے ہیں اکبر کی

> پیشین گوئی صحیح ثابت ہو رہی ہے، اپ ٹوڈیٹ اور ناڈرن شرفاء کی عمریں، بالخصوص ترقی یافتہ ممالک میں، ہوٹلوں میں کٹ رہی ہیں اور مرتے ہیں ہسپتال کے بستروں پر، دریاؤں کے کنارے صحت افزاء جھونپڑوں میں اور ریت کے بستروں پر بحر محبت موجیں مار رہا ہے۔ یہ صرف آزادئ نسواں (Women's Lib) کا کرشمہ ہے اب Women's Empowerment کا ہائیڈروجن بم جو پھٹے گا تو انسانیت کے ذرات فضاؤں میں اڑیں گے جبکہ مغربی تہذیب کے تنکے مشرق کے سمعی وبصری ذرائع (Audio-Visual Media) پر ٹیلی ویژن اور بھیانک وی سی آر کے ہاتھوں گھر گھر میں اڑ رہے ہیں اور گویا پورا گھر خوابگاہ (Bed-room) بنا ہوا ہے۔(۴۵)

پاکستان میں این جی اوز کا تذکرہ ہو تو جو چند نمایاں نام فوری طور پر سامنے آتے ہیں ان میں عاصمہ جہانگیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں، محترمہ ایک معروف این جی او کی سربراہ ہیں اور حقوقِ انسانی کے لیے مسلسل جدوجہد کی دعویدار ہیں مگر ان کی عملی کارکردگی پر جناب عبدالرشید ارشد رقمطراز ہیں:

> عاصمہ جہانگیر کا کردار دیکھ لیجئے کہ حقوقِ انسانی کے نام پر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے مسلمہ دشمنوں کے ساتھ باہم شیر وشکر بلکہ دشمن کے سپاہیوں میں عملاً شکر پارے بانٹنے، پاکستان میں جاسوسی کرنے والے دشمن کے گھر جا کر ملاقات کرنے اور بھارت میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کی پالیسیوں کے خلاف انٹرویو اور بیان بازی پر میڈیا کی گواہی کافی ہے۔

قومی سلامتی کے حوالے سے یہ رویہ اسلامی جمہوریہ پاکستان سے کھلی غداری قرار پاتا ہے مگر عاصمہ جہانگیر جو اپنے خالق و مالک کی باغی ہے، اسلامی جمہوریہ پاکستان سے بغاوت کو کہاں خاطر میں لائے گی کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ قانون دان ہے اور آئین و قانون کی جو توجیح چاہے کر لے، کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عاصمہ جہانگیر بھی ایک NGO کی سربراہ ہے اس NGO کے ذمہ اسکے آقاؤں نے قرآن وسنت اور شعائر واقدار اسلام کی بیخ کنی کا کام سونپا ہوا ہے صرف دو مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

۱) عاصمہ جہانگیر کی NGO ایک ماہوار خبر نامہ "صدائے آدمؑ" کے نام سے شائع کرتی ہے اس نے شمارہ جنوری ۲۰۰۰ء کے سرورق پر قرآن حکیم کی سورۃ النساء کی آیت ۳۴ پر ایک کارٹون شائع کیا ہے جو قرآن حکیم کی آیت کی توہین کے ساتھ سنت رسولؐ کی بھی توہین ہے۔

مذکورہ آیت نمبر ۳۴ کے الفاظ یہ ہیں۔

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض

(یعنی مرد عورتوں پر قوام ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے) اس آیت کی کارٹون کی شکل میں تشریح کرتے ہوئے ایک ترازو بنایا گیا ہے جس کے اوپر اٹھے پلڑے میں ایک عورت اور اس کا ایک بچہ ہے اور دوسرے خاصے جھکے پلڑے میں ایک مولوی کی داڑھی بھی عورت اور اس کے بچے سے بھاری ہے یہ قرآن کی آیت اور سنت رسول کی کھلی توہین ہے۔

۲) فروری ۲۰۰۰ء کے صدائے آدم کے سرورق پر شائع کارٹون پہلے کارٹون سے بھی توہین قرآن کے حوالے سے بازی لے گیا ہے یہ کارٹون سورۃ الاعراف کی آیت ۴۰ پر مبنی ہے جو یوں ہے۔

ان الذین کذبوا بایٰتنا واستکبروا عنھا لاتفتح لھم ابواب السماء ولا یدخلون الجنۃ حتی یلج الجمل فی سم الخیاط وکذلک نجزی المجرمین۔

(یعنی جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور مقابلے میں متکبر ہوئے ان کے لیے نہ تو آسمان کے دروازے کھلیں گے نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے کہ یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اگر اونٹ سوئی کے سوراخ سے گزر جائے یعنی نہ اونٹ سوئی کے سوراخ سے گزر سکتا اور نتیجتاً نہ ایسے مجرم جنت میں جا سکتے ہیں۔)

اس آیت پر مبنی کارٹون میں ایک مولوی صاحب اونٹ کی نکیل پکڑے اس میں سوئی پروئے (ڈالے) اونٹ کو اپنی جانب کھینچ کر سوئی کے سوراخ سے گزارنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔(۴۶)

جذباتی طور پر ہی سہی مگر اسلام سے گہری وابستگی رکھنے والے پاکستانی معاشرے میں جہاں قرآن وسنت دستورِ پاکستان کا ماخذ قرار دیے گئے ہیں ایک این جی او کی طرف سے زبانی نہیں تحریری طور پر قرآن وسنت کے ساتھ تضحیک اور مذاق کا مذکورہ طرزِ عمل پاکستان میں روشن خیالوں کی دیدہ دلیری اور جارحیت کا ثبوت ہے۔ معروف محقق اور صحافی عطاء اللہ صدیقی اسی دیدہ دلیری اور جارحیت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جنرل پرویز مشرف کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد پاکستان میں این جی اوز کی اچھل کود اور آؤ بھگت میں غیر معمولی اضافہ ہوا فوجی حکومت نے آتے ہی وفاقی اور صوبائی کابینہ میں این جی اوز کے متحرک افراد کو وزارتیں دے دیں عمر اصغر خان، عطیہ عنایت اللہ، جاوید جبار، زبیدہ جلال، شاہین عتیق الرحمٰن اور چند دیگر خواتین وحضرات دیکھتے ہی دیکھتے فوجی حکومت کے نفس ہائے ناطقہ بن گئے حکومت کے دیگر روشن خیال وزراء کی رفاقت سے این جی اوز برانڈ وزراء کو مزید روحانی تقویت ملی۔
>
> جنرل پرویز مشرف نے مصطفیٰ کمال اتاترک کو جب اپنا آئیڈیل کہا تو این جی اوز کی ان کے متعلق خوش اعتقادی کا گراف آسمان کو چھونے لگا انہوں نے پاکستان میں کمال ازم کے عملی نفاذ کے لیے درجہ بدرجہ منصوبہ بندی کا آغاز کر دیا کئی ماہ تک این جی اوز کے انگریزی گپ باز دانشوروں نے چیف ایگزیکٹو کے گرد اپنا روشن خیال حلقہ قائم کیے رکھا حکومت کو یقین دلایا گیا کہ این جی اوز دیگر سیاسی جماعتوں کے متبادل کے طور پر خدمات انجام دینے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں لہٰذا حکومت کو نہ تو کرپٹ سیاستدانوں سے بات کرنے کی ضرورت ہے اور نہ رجعت پسند مولویوں کو منہ لگانے کا فائدہ ہے اس ملک کی ترقی اور خوشحالی کا اگر کوئی ترقی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پسندانہ ماڈل ہے تو اس کو عملی جامہ صرف اور صرف این جی اوز کے روشن دماغ ہی پہنا سکتے ہیں اصلاحات کے نام پر تہذیب مغرب کے غیر محسوسانہ نفاذ کے پھندے تیار کیے جانے لگے عوامی سطح پر اختیارات کی تقسیم کا ایک دلفریب نقشہ پیش کیا گیا چیف ایگزیکٹو کو بریف کیا گیا کہ رجعت پسند مذہبی طبقہ پاکستان کی ترقی کی راہ میں اصل رکاوٹ ہے جب تک اس کا اثر و رسوخ کم نہیں کیا جاتا نتائج کا حصول ممکن نہیں ہے۔(۴۷)

این جی اوز میں سرگرم عمل زیادہ تر افراد وہ ہیں جن کے لیے ماضی میں بائیں بازو، لبرل یا ترقی پسند کے عنوان اختیار کیے جاتے تھے نجم الحسن عارف کہتے ہیں کہ وہ ماضی میں آجر اور اجیر کے درمیان تقسیم اور طبقاتی کشمکش کا ماحول پیدا کرنے کے حوالے سے جانے اور پہچانے جاتے تھے اب انہوں نے تقسیم کا یہی عمل جنس کی بنیاد پر شروع کر دیا ہے اب آجر اور اجیر کو ایک دوسرے سے لڑانے کی بجائے مرد اور عورت کو آمنے سامنے کھڑا کرنے کے لیے سرگرم ہیں اور عورت کے سارے مسائل کی ذمہ داری مرد اور مردوں کے غلبے والے معاشرے پر ڈالتے ہیں اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ عورتوں کو جہاں مردوں کے باعث بہت سے تحفظات حاصل ہیں وہیں عورت کی بہت ساری مشکلات اور مصائب کا سبب مرد سے زیادہ عورت خود ہے یہ خواتین مردوں کی ازدواجی زندگی کو بھی خواتین کے استحصال سے تعبیر کرتی ہیں لیکن ان میں کئی خواتین ایسی خود ہیں جن کی وجہ سے کسی دوسری کا گھر اجڑا یا وہ بے گھر ہوئی ایک اور بات جو ان این جی اوز کی سرگرمیوں کے حوالے سے محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی تمام تر کوششوں کا محور ان مٹھی بھر خواتین کے چونچلوں کا تحفظ ہے جو پاکستان میں مراعات یافتہ طبقے سے تعلق رکھتی ہیں یا بد قسمتی سے ان سرگرمیوں میں ملوث ہیں جو پاکستان جیسے اسلامی اور مشرقی اقدار کے حامل ملک میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتیں البتہ بیرونِ ملک خصوصاً یورپ اور امریکہ میں ان کے لیے ہر "آزادی" اور

"سہولت" موجود ہے اسی مراعات یافتہ طبقے کی نمائندگی کرتے ہوئے وہ حدود کے اسلامی قانون، دیت اور حجاب کی مخالفت کرتی ہیں اور انہیں کی تسکین، اطمینان کے لیے نسائیت پسندی کی تحریک کی حامی ہیں۔(۴۸)

این جی اوز کی اقسام، طریق کار اور سرگرمیوں کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ زیادہ تر این جی اوز پاکستانی معاشرے میں آزاد خیالی اور مغربی تہذیب کی کمین گاہ ہیں وہ کام جو کسی اور راہ سے پاکستانی معاشرے میں سرانجام دینا معاشرے کی اسلام سے جذباتی وابستگی کے باعث مشکل ہے این جی اوز کے محاذ پر آسانی سے سرانجام دیا جا سکتا ہے گو کہ این جی اوز کا معاشرتی نفوذ بڑے پیمانے پر نہیں ہے مگر انتہائی اہم شعبہ ہائے زندگی میں این جی اوز کے ذریعے نقب لگائی گئی ہے جن میں صحت، تعلیم اور سماجی بہبود کے علاوہ حکومتی ایوان، ذرائع ابلاغ اور الیکٹرانک میڈیا ان این جی اوز کی آواز اور پیغام کو توانا بناتے ہیں اگر لوگ ان کے ہمنوا نہیں بھی بنتے تو بھی اپنی معاشرت، تہذیب اور اقدار پر ان کا اعتقاد متزلزل ضرور ہو جاتا ہے پھر ان این جی اوز کو سیاسی جماعتوں کی طرح ووٹ لینے کے لیے عوام کے پاس نہیں جانا ہوتا اس لیے یہ پورے اعتماد اور دیدہ دلیری سے جارحیت کا انداز اختیار کرتی ہیں۔ عطاء اللہ صدیقی لکھتے ہیں:

> آئین پاکستان کے آرٹیکل ۲ کی رو سے اسلام پاکستان کا سرکاری مذہب ہے مگر ان نام نہاد غیر سرکاری تنظیموں کا "غیر سرکاری مذہب" اسلام دشمنی ہے پاکستانی این جی اوز کے راہنماؤں کو آئین پاکستان کے صرف دو تین آرٹیکل یاد ہیں مثلاً آرٹیکل نمبر ۴ آرٹیکل نمبر ۸ اور آرٹیکل نمبر ۲۵ جن میں مساوی حقوق اور عورتوں کے حقوق کا ذکر ملتا ہے وہ ایسے تمام آرٹیکل پر یقین نہیں رکھتے جن میں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اسلام یا اسلامی قوانین کی بالادستی کا ذکر ملتا ہے آرٹیکل ۲۲۷ جس میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کے تمام مروجہ قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالا جائے گا، کو یہ سخت ناپسند کرتے ہیں عاصمہ جہانگیر اپنے بیانات میں آرٹیکل ۶۲، ۶۳ کا بارہا مذاق اڑا چکی ہے کیونکہ اس میں عوامی نمائندوں کے لیے اسلامی معیارات کی بات کی گئی ہے این جی اوز پاکستانی آئین میں سے وفاقی شرعی عدالت کے باب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نکالنے کا مطالبہ کرتی ہیں یہ این جی اوز آرٹیکل ۶ کے نفاذ کو بھی بھول جاتی ہیں اگر پاکستان کے آئین کی روشنی میں این جی اوز کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو یقیناً غیر آئینی قرار پائیں گی کیونکہ آئین میں نظریہ پاکستان کے منافی سرگرمیوں کی گنجائش نہیں ہے این جی اوز انسانی حقوق اور اظہار رائے کی آزادیوں کے علاوہ جمہوری اقدار کے فروغ کا بہت واویلا کرتی ہیں جمہوری آزادیوں کے تحفظ کے لیے ماضی میں آئے دن این جی اوز جلوس نکالتی رہتی تھیں مگر موجودہ حکومت کے دور میں این جی اوز نے جمہوریت کی بحالی کے لیے کوئی جلوس نہیں نکالا۔(۴۹)

این جی اوز لبرل ازم کے فروغ میں کیا کردار ادا کر رہی ہیں اس سوال کے جواب میں زیادہ تر این جی اوز کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے تاہم این جی اوز کے راستے ہی کو اختیار کر کے سچے جذبے، اخلاص اور محنت کے ساتھ خدمت عامہ کا فرض ادا کرنے والے ادارے، تنظیمات اور انجمنیں معاشرے کے لیے باعثِ خیر ہیں مگران کی تعداد قلیل ہونے کے باعث مجموعی طور پر بداعتمادی کی فضا غالب ہے این جی اوز کی پس پردہ حکمتِ عملی کے نقائص اور مذموم محرکات کے تذکرے کا یہ مطلب نہیں کہ معاشرے کے حقیقی مسائل (جن کی آڑ لے کر لبرل ازم کو فروغ دیا جارہا ہے) سے صرفِ نظر کر لیا جائے فی الواقع پاکستانی معاشرے کو سلگتے مسائل کا سامنا ہے جن کا حل اسلامی اقدار اور نظامِ حیات میں تلاش نہ کیا گیا تو این جی اوز کو تنقید کا نشانہ بنا کر ان کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنا ناممکن ہوگا۔

www.KitaboSunnat.com

فصل چہارم

تحریک آزادیٔ نسواں

تاریخ انسانی شاہد ہے کہ عورت مظلومیت کا شکار رہی ہے اور بالعموم عورت کے بارے میں جو رائے بھی اختیار کی گئی ہے اس میں عورت کو موم کی گڑیا سمجھ کر مردوں کی ترجیحات اور خواہشات کے مطابق ڈھالا گیا ہے حتی کہ دنیا کی بڑی بڑی تہذیبوں کے عروج اور ترقی کے باوجود عورت استحصال کا سامنا کرتی رہی۔ یونان اور مصر کی تہذیب ہو یا بابل و نینوا کے دورِ عروج کا تذکرہ ہو چاہے سرزمین چین اور جزیرۃ العرب کی داستان، عورت ظلم اور ستم کی چکی میں پستی رہی جبکہ انسانی زندگی میں بگاڑ اور توازن دونوں کا انحصار مرد اور عورت کے تعلق پر ہے بقائے نسل انسانی میں مرد اور عورت دونوں برابر کے حصے دار ہیں جیسا کہ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے۔

﴿یاایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا ونساء﴾۔(۵۰)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی کو پیدا کر کے ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔

گویا کہ عورت انسانیت کا نصف ہے لہٰذا مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں معاشرتی و تمدنی بقا کا ضامن جتنا مرد ہے اتنا ہی انحصار عورت پر بھی ہے مگر بدقسمتی سے عورت کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا جاتا رہا ہے اس پر معروف سکالر ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں:

افلاطون نے عورت اور مرد کی مساوات کا دعویٰ کیا تھا لیکن یہ محض زبانی تعلیم تھی اخلاقی بنیادوں پر عورت کی حیثیت بے بس غلام کی سی تھی اور مرد کو اسی معاشرہ میں ہر اعتبار سے فوقیت حاصل تھی بلکہ بداخلاقی کی اس فضا میں عورت صرف ہوس کا نشانہ تھی؛ عورتوں کے مجسمے عام تھے نکاح سے بالکل بے نیازی تھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک خیالی عورت کو تمام مصائبِ انسانی کا سبب قرار دیا گیا تھا معاشرتی زوال کے دور میں تو بڑے بڑے فلاسفہ اور معلمین اخلاق زناء اور فحش گوئی میں کوئی قباحت خیال نہیں کرتے تھے شہوت پرستی کوئی اخلاقی عیب نہ تھا کام دیوی کی پرستش سے دیوداسیاں معرضِ وجود میں آئیں اور فحاشی ایک مقدس فعل بن گیا روم کے ابتدائی دور میں عورت کی حیثیت کو تھوڑا بہت تسلیم کیا جاتا تھا لیکن کچھ مدت کے بعد حالات نے پلٹا کھایا تو باپ اور شوہر کو یہ اختیارات مل گئے کہ وہ عورت کو جب چاہیں گھر سے نکال دیں بلکہ شوہر تو بیوی کو قتل تک کر سکتا تھا غلاموں کی مانند عورت کا مقصد بھی خدمت اور چاکری سمجھا جاتا تھا معاشرہ میں اس کی گواہی کو معتبر خیال نہیں کیا جاتا تھا ایران میں عورت کی حیثیت کچھ عجیب ہی تھی اس کی ذات میں کوئی اخلاقی قدر نظر نہ آتی ماں، بیوی اور بیٹی کی کوئی تمیز نہ تھی بابل میں تو دیوداسیوں کی ایک کثیر تعداد مختلف مواقع پر بھجن گاتی ہوئی نظر آتی ہے اور ان کی یہ تصویر شرافتِ انسانی کا ماتم کرتی نظر آتی ہے۔(۵۱)

مذاہبِ عالم نے بھی عورت کے ساتھ امتیازی سلوک جاری رکھا یہودی روایات کے مطابق عورت ناپاک وجود ہے اور ایک مسیحی راہنما کے الفاظ میں عورت شیطان کے آنے کا دروازہ ہے وہ شجرِ ممنوعہ کی طرف لے جانے والی اور خدا کے قانون کو توڑنے والی اور خدا کی تصویر مرد کو غارت کرنے والی ہے۔(۵۲)

برصغیر پاک وہند کی کثیر آبادی کے مذہب ہندومت میں عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ بچپن میں باپ کے اختیار میں رہے جوانی میں شوہر کے ماتحت اور بیوہ ہونے کے بعد بیٹوں کے اختیار میں رہے۔خود مختار ہو کر کبھی نہ رہے۔(۵۳)

اسلام نے جس سرزمین پر عورت کے وقار اور عظمت کا اعلان کیا وہ جزیرۃ العرب کا جاہلی معاشرہ تھا جن کا عورت کے ساتھ سلوک کس نوعیت کا تھا قرآن نے درج ذیل تبصرہ کیا ہے۔

﴿واذا بشر احدھم بالانثی ظل وجھہ مسوداً وھو کظیم﴾۔(۵۴)

ان میں سے جب کسی کو لڑکی ہونے کی خبر دی جائے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور دل ہی دل میں گھٹنے لگتا ہے۔

اس پس منظر میں جب ہم اسلام میں عورت کے مقام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان احسانات کا پتہ چلتا ہے جو دینِ فطرت نے صرف عورت پر ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت پر کیے ہیں کیونکہ جب انسانی زندگی میں عورت کے مقام کے تعین میں کجی کا رویہ اختیار کیا جائے گا تو معاشرہ فساد اور انتشار کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔اسلام کی آمد سے جہالت کے اس دور کا خاتمہ ہوا جس میں بیٹی زندہ گاڑ دی جاتی تھی۔عورت کو تو اپنے مقام اور مرتبے کا خود بھی پتہ نہ تھا اسلام نے اسے آگہی اور شعور بخشا۔اہلِ ایمان مردوں سے کہا گیا کہ یہ صنفِ نازک ہے اس سے نرمی اور پیار کا رویہ اختیار کرو۔باپ کی بجائے جنت کو ماں کے قدموں میں تلاش کرنے کا حکم دیا گیا عورت کو وراثت میں حصہ دیا گیا۔بیٹی کو زندہ گاڑنے والے معاشرے کی جہالت میں لڑکی کی پرورش پر حضور اکرم ﷺ نے خوشخبری دی:

﴿عن أنس/ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من عال جاريتين حتى تبلغا جاء يوم القيامة أنا وهو هكذا- وضم أصابعه﴾۔(۵۵)

یعنی جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ میں اور وہ اس طرح ہوں گے آپؐ نے دو انگلیاں ملا کر بتایا(جس طرح یہ دونوں ساتھ ہیں اسی طرح)

اسی طرح رسالتمآب ﷺ نے فرمایا:

﴿عن انس/ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم حبب الى من الدنيا كم النساء والطيب وجعلت قرة عيني فى الصلوٰة﴾۔(۵۶)

یعنی مجھے دنیا میں سے یہ چیزیں محبوب ہیں عورت، خوشبو اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

اسلام نے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم و تربیت پر زور دیا تاکہ معاشرے کی تعمیر و ترقی میں عورت اپنا کلیدی کردار صحیح طریقے سے ادا کر سکے۔تعلیم کو فرض قرار دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا:

﴿طلب العلم فريضة على كل مسلم﴾(۵۷)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علم کی طلب ہر مسلمان پر فرض ہے۔

عورتوں کے معاملے میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کو بھی ترجیح دی گئی تاکہ اسلامی معاشرے کی خاتون دین واخلاق کا مجسمہ ہو کیونکہ عورت کی تربیت کا نقص پورے سماج کو بگاڑ کے راستے پر لے جاتا ہے۔ تربیت کے ضمن میں ہی عورت کے لیے عملی زندگی کی حدود کا تعین کر دیا گیا لہٰذا ہنگامی حالت کے علاوہ ان حدود کا لحاظ ضروری قرار دیا گیا مجبوری کی صورت کے علاوہ عورت کو عام معاشی جدوجہد سے بھی الگ رکھا گیا تاکہ بہترین خاندانی نظام مستحکم ہو جو اسلامی معاشرے کی اصل بنیاد ہے انسانیت کو فساد اور بگاڑ سے بچانے کے لیے اسلام نے ایک طرف عورت کو غلامی سے نجات دے کر عظمت عطا کی ہے تو دوسری طرف ایسی آزادی (Liberty) سے بھی روکا ہے جس سے تاریخ کے مختلف ادوار میں اخلاقی قدریں تباہ ہوئیں اور معاشرے کا اجتماعی سکون غارت ہوا۔ چنانچہ تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں سیاسی عروج وزوال کے باوجود ایک مستحکم اسلامی معاشرے کی بقاء میں یہ بنیادی حقیقت نمایاں حیثیت رکھتی ہے کہ خواتین نہ صرف اپنے حقوق سے پوری طرح آگاہ تھیں بلکہ ان حدود کا بھی لحاظ کرتی تھیں جن میں اسلامی معاشرے کا توازن اور حسن پوشیدہ ہے مگر مسلمانوں کے زوال سے اور مغرب کے تہذیبی غلبے اور یلغار سے عورت کی حیثیت اور عورت کے بارے میں افکار میں تبدیلی آتی چلی گئی مغربی اقوام اپنے توسیع پسندانہ عزائم کے ساتھ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اقوام عالم کو تاخت و تاراج کر رہی تھیں گو ان کا نعرہ یہ تھا کہ ہم دنیا کو مہذب بنانا چاہتے ہیں چنانچہ مہذب بنانے کی اس مہم میں پاک وہند بھی ان کا ہدف تھا اپنے تہذیبی غلبے اور تسلط کے لیے عورت ان کا نشانہ تھی اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے کافی عرصے تک مزاحمت جاری رکھی مگر مغربی تعلیم اور تجدد پسندوں کے اثرات کے باعث، پھر بیسویں صدی کے نصف آخر میں ذرائع ابلاغ کی عظیم الشان قوت کے بل پر اس خطے کی عورت پر بھی مغرب کے اثرات تیزی سے مرتب ہونا شروع ہوئے اور عہدِ حاضر میں اس تبدیلی نے کتنی منزلیں طے کر لی ہیں جناب موسیٰ خان جلال زئی بڑا جامع تجزیہ کرتے ہیں:

> مغرب کی عورت کی طرح اسے بھی گھر کی زینت بننے سے زیادہ محفل کی شمع بننے میں لطف آنے لگا ہر بات میں مردوں کی برابری کی جانے لگی تحریکِ نسواں کے نام پر اٹھے ہوئے طوفان نے مغربی ممالک کے ساتھ ساتھ تیسری دنیا کے ان

> ممالک کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا جو کہ ابھی اس عالم میں اپنی شناخت ہی نہیں کروا سکے ہیں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں ان کی عورتیں بھی مغرب کی خواتین کی دیکھا دیکھی آزادی کا مطالبہ کرنے لگیں مردوں کے ساتھ ان کے شانہ بشانہ کام کرنے میں فخر محسوس کیا جاتا تھا "بچے دو ہی اچھے" کا نعرہ عام ہو گیا بچوں کو مستقبل کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جانے لگا عام عورت پیسہ کمانے کے لیے باہر نکل رہی تھی لیکن طبقہ خاص کی عورت کو بھی کرنے کے لیے کچھ چاہیئے تھا اس کے پاس وقت کا بہترین مصرف یہ تھا کہ وہ کلب جوائن کرے اور سماجی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے ایسی سرگرمیوں کے لیے مختلف غیر سرکاری تنظیمیں سامنے آگئیں جنہوں نے عورتوں کے مسائل پر آواز بلند کی لیکن بات اگر صرف مسائل پر بات کرنے کی ہوتی تو ٹھیک تھا بات اسلامی تعلیمات اور اسلامی آرڈیننس کے خلاف کی جانے لگی ان این جی اوز میں شامل بعض خواتین نے تو یہ تک کہا کہ "اگر ہماری دیت آدھی ہے ہماری شہادت آدھی ہے تو پھر ہم نماز بھی آدھی پڑھیں گی روزے بھی آدھے رکھیں گی اور حج بھی آدھا کریں گی" اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے عورت کے حقوق کا سب سے زیادہ خیال رکھا ہے مغرب کی وہ عورت جو کہ معاشرے کی ستائی ہوئی ہے مغرب کے معاشرے میں دوسرے درجے کی شہری ہے جسے ہر جگہ بے عزت کیا جا رہا ہے برابری کے نام پر اسے گھر اور دفتر دونوں سنبھالنا پڑ رہے ہیں لیکن مرکز سے ہٹی ہوئی ہر شے ایک وقت تباہ ہو جاتی ہے عورت کا مرکز اس کا "گھر" ہے اور اپنے گھریلو مسائل حل کرنے اور پالیسیاں بنانے میں عورت خود مختار ہوتی ہے لیکن اس وقت کی عورت اپنے گھر اور جنت کا آرام چھوڑ کر باہر نکل پڑی ہے اور گھر جیسے ادارے کا شیرازہ بکھر گیا۔(۵۸)

پاکستان کی اسلامی شناخت اور نظریاتی پہچان کے باوجود یہاں کی عورت بھی ایک دوراہے پر کھڑی ہے اسلام یا لبرل ازم۔ اور یہ پیچیدہ صورتحال محض مغرب کی تہذیبی یلغار کا نتیجہ نہیں بلکہ پاکستان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں اسلامی فلاحی معاشرے کی عدم تشکیل بھی اس کا قوی سبب ہے۔ ستم یہ ہوا کہ پاکستان اپنے ابتدائی برسوں میں ہی لادینیت کے جن طوفانوں کی زد میں آیا ان میں سرِ فہرست حقوقِ نسواں کی تحریک تھی جس کو عوامی سطح پر تو مقبولیت حاصل نہ ہو سکی مگر حکومتی سطح پر حکمرانوں کی پشت پناہی کے باعث اس کے قدم آگے بڑھے۔ مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی اس روش پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> حد یہ ہے کہ دستور ساز اسمبلی میں قرارداد بھی پاس کر دیتے ہیں کہ اس ملک کا دستور کتاب وسنت کی بنیادوں پر بنے گا لیکن دوسری طرف عمل کی دنیا میں یہ حال ہے کہ اسلام کے مٹے ہوئے آثار و نقوش کو اجاگر کرنے کی کوشش کرنا تو الگ رہا اسلامی تہذیب وروایات کے جو آثار انگریزی دورِ حکومت کی دستبرد سے تھوڑے بہت بچ رہے تھے ان کو بھی مٹانے اور ان کی جگہ مغربیت کو غالب کرنے کی کوشش ہو رہی ہے اور لطف یہ ہے کہ اس دعویٰ کے ساتھ ہو رہی ہے کہ یہ اسلام قائم ہو رہا ہے اس بات کی شہادت یوں تو ان حضرات کے ہر قول و عمل سے مل رہی ہے لیکن عورتوں کی اصلاح وترقی کے معاملہ میں انہوں نے جو روش اختیار کی ہے اس کو دیکھنے کے بعد تو کوئی اندھا ہی ہوگا جو ان کے اصل عزائم کی طرف سے شبہ میں رہے گا۔(۵۹)

مولانا اصلاحی نے حکمرانوں کی طرف سے حقوقِ نسواں کی تحریک کی سرپرستی پر مذکورہ تنقید کن حالات میں کی ان حالات کا اندازہ پاکستان میں حقوقِ نسواں کی تحریک کی بانی اور پہلے وزیر اعظم جناب لیاقت علی خان کی اہلیہ رعنا لیاقت علی کے بیان سے کیا جاسکتا ہے جنہوں نے اپنے اخباری بیان میں کہا کہ مغرب میں بھی عورتوں کے مردانہ کاروائیوں اور مصروفیتوں میں حصہ لینے کا خیال ابھی نیا نیا ہی پیدا ہوا ہے بہر حال پردہ دیر سویر ختم ہو کے رہے گا لڑکیوں کی نئی پود جن کی تربیت لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط درسگاہوں میں ہو رہی ہے وہ پردہ میں نہیں جائے گی۔(۶۰)

بیگم رعنا لیاقت علی خان کے بیان کے بعد مولانا اصلاحی کا یہ تبصرہ بھی اہم ہے جس میں انہوں نے پاکستان میں لبرل ازم کے فروغ کی حکمتِ عملی کو بے نقاب کیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> اس ملک کے اربابِ اقتدار مغرب زدگی کی جو لعنت اس ملک پر مسلط کرنے کے متمنی ہیں اس کا پہلا تجربہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت وہ پہلے ہماری بہنوں اور بیٹیوں پر کرنا چاہتے ہیں وہ سمجھتے ہیں اور ان کا یہ سمجھنا ایک حد تک صحیح ہے کہ اگر عورتوں نے اس طاعون کے جراثیم قبول کر لیے تو ہماری سوسائیٹی کا بقیہ حصہ اس سے بچنا بھی چاہے گا تو نہ بچ سکے گا۔(۶۱)

جہاں تک عورت کے مسائل اور حقوقِ نسواں کا تعلق ہے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پاکستانی عورت بے پناہ مسائل میں مبتلا ہے اور حقوق سے محروم ہے۔ گھروں میں لڑکیوں پر لڑکوں کو ترجیح دی جاتی ہے تعلیم کے معاملے میں لڑکیوں کو محروم رکھا جاتا ہے وراثت سے محروم رکھا جاتا ہے۔ شادی کے معاملے میں لڑکے اور مرد کی رائے نہ صرف لی جاتی ہے بلکہ ترجیح حاصل کرتی ہے جبکہ لڑکیوں کو محض مشرقی تہذیب کی آڑ لے کر بعض اوقات غلط خاندانی فیصلوں کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے شادی کے بعد جہیز نہ لانے کی صورت میں سسرال والے طعنہ زنی کرتے ہیں اور اگر نرینہ اولاد کی بجائے بچی جنم دے تو بھی عورت کا جینا دوبھر کر دیا جاتا ہے عام سماجی زندگی میں عورتوں کے لیے صحت کے الگ مراکز نہ ہونے کے برابر ہیں اور اگر صحت کے مراکز شروع کیے بھی گئے ہیں تو خاندانی منصوبہ بندی اور ضبطِ ولادت جیسی استعماری مہمات کے فروغ کے مراکز بنا دیے گئے ہیں ان مراکز کے پروگرام میں اگرچہ حفظانِ صحت کے سلوگن بھی شامل ہیں مگر حقیقت میں عورتوں کے مسائل کی آڑ لے کر پاکستان کے گلی گلی، محلّہ محلّہ، کوچہ کوچہ میں بہبودِ آبادی کے دفتر کھل گئے ہیں پاکستان میں صحت کے کل بجٹ سے زیادہ بجٹ بہبودِ آبادی کا ہے دوائیوں کو بالکل فری فراہم کیا جاتا ہے کئی ہزار LHV کو بھرتی کیا جا چکا ہے پاکستان میں THQ, DHQ اور تعلیمی اداروں اور ہسپتالوں میں بجٹ کم کر دیا گیا ہے مگر بہبود آبادی کی مد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ Ladies Health Supervisors کو گاڑیاں فراہم کی گئی ہیں ایک طرف پیسہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے تو دوسری طرف سکول کی نصابی کتب میں یہ مستقل مضمون شروع کر دیئے گئے ہیں کہ خوشحال گھرانہ، آبادی کے مسائل، چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائیں یہ پرائمری اور مڈل کی نصابی کتب کے موضوعات ہیں جی ہاں یہی وہ سازش ہے جس کے تحت پچھلے ۲۰ برسوں میں ان لاکھوں بچوں کو ماؤں کی کوکھوں میں ہی دفن کیا جا رہا ہے جو انقلاب بن کر زمین پر طلوع ہونے تھے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اخلاقی و جنسی بیماریوں کا ایک سیلاب ہے جو مغربی معاشرے میں آچکا ہے اور منہ کھولے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔(۶۲)

گو کہ پاکستانی عورت کو مسائل کا سامنا ہے مگر صحت کے مسئلے کی آڑ میں جس طرح بہبودِ آبادی پروگرام کے تحت اباحیت کو فروغ دیا جارہا ہے اسی طرح دیگر مسائل کا حل بھی اسلام کی روشنی میں تلاش کرنے کی بجائے حقوقِ نسواں کی تحریک لبرل ازم کو فروغ دینے کا سبب بنتی ہے۔ موسیٰ خان جلال زئی اس تناظر میں لکھتے ہیں:

> اس وقت غیر سرکاری تنظیموں کے مقاصد میں سرِ فہرست مسائل بچوں کی بہبود، خاندانی منصوبہ بندی، پسماندہ افراد کی بھلائی، مریضوں، بوڑھوں اور معذوروں کی فلاح و بہبود اور خواتین کے مسائل ہیں جن کے لیے عاصمہ جہانگیر، نگہت سعید خان، نگار احمد، حنا جیلانی اور ان جیسی دوسری خواتین کافی کام کر رہی ہیں گھروں سے بھاگی ہوئی خواتین ان کے بنائے ہوئے اداروں میں پناہ لیتی ہیں لاہور میں دستک، ایدھی ہوم اور دارالکفالہ، کاشانہ، عافیت ایسے ادارے ہیں جہاں پناہ لینے والی زیادہ تر خواتین لوکل مجسٹریٹ، وکلاء، سرکاری افسران اور عدالتوں کے حوالے سے آئی ہیں۔(۶۳)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورتوں کے مسائل کے حل اور حقوقِ نسواں کے لیے صرف این جی اوز ہی کیوں آواز اٹھاتی ہیں اس سوال کا یہ جواب ناکافی اور غیر تسلی بخش ہے کہ یہ غیر سرکاری تنظیمات بیرونی امداد کے بل پر محض استعماری عزائم کے ساتھ کام کرتی ہیں کیونکہ بے حد جزوی طور پر ہی سہی بعض سماجی خدمات سچے جذبے سے بھی سرانجام دی جارہی ہیں مگر پاکستانی معاشرے کے وہ مذہبی گروہ، سکالر، دانشور اور طبقات حقوقِ نسواں کی بحالی کے لیے اسلام کو قابل عمل ضابطہ حیات کے طور پر پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے بلکہ ستم یہ ہے کہ ساری اسلام پسندی کے باوجود حقوقِ نسواں کی پامالی پر کوئی اضطراب بھی نہیں پایا جاتا۔ سید جلال الدین عمری بجا طور پر اس مسئلے کی نشاندہی درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

> عام مسلمان اپنے اس یقین اور ایمان کا زبان سے اظہار تو کرتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے ہیں وہ خدائے تعالیٰ کے دیے ہوئے ہیں۔ یہ حقوق لازماً ادا ہونے چاہئیں ان میں ترمیم و تنسیخ کو وہ اللہ تعالیٰ کے قانون میں براہِ راست مداخلت تصور کرتے ہیں اور اسے روکنے اور اس قانون کو صحیح شکل میں باقی رکھنے کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے بھی تیار نظر آتے ہیں لیکن عملاً وہ ان احکام کے پوری طرح پابند نہیں بلکہ قدم قدم پر اس کی خلاف ورزی ان سے ہوتی رہتی ہے باپ بیٹی کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ اس کی تعلیم و تربیت کی طرف اتنی توجہ نہیں دی جاتی جتنی توجہ کہ لڑکوں کی تعلیم کی طرف دی جاتی ہے لین دین میں دونوں میں فرق کیا جاتا ہے مختلف بہانوں سے وہ حقِ وراثت سے محروم رکھی جاتی ہے ماں اور باپ کے ساتھ اولاد کا رویہ خاص طور پر شادی اور گھر بسانے کے بعد بہت غلط ہوتا ہے ان کے ساتھ حسنِ سلوک نہیں ہوتا ان کے قانونی حقوق ادا نہیں کیے جاتے ان کے پاس اگر کوئی ذریعہ معاش نہ ہو تو وہ عُسرت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں بیوی کو شوہر کی محبت نہیں ملتی سسرال میں اس کے ساتھ ملازمہ کی طرح سلوک ہوتا ہے وہ اپنے بہت سے حقوق سے محروم رہتی ہے بات بات پر سختی شروع ہو جاتی ہے معمولی سے اختلافات طلاق کا بہانہ بن جاتے ہیں مہر کے بارے میں یہ تصور ہے کہ وہ طلاق کی صورت میں دیا جاتا ہے طلاق نہ ہو تو اس کے ادا کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہوتی یہی رویہ بالعموم ان تمام عورتوں کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے جن کے حقوق اسلام نے مرد پر عائد کر رکھے ہیں اور جن کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم دی ہے اسلام نے (اپنے حدود کے اندر) عورت کو معاشی جد وجہد کی اجازت دی ہے وہ اسے تعلیم میں آگے بڑھانا چاہتا ہے اسے دعوت و تبلیغ، نشر و اشاعت، تنقید و احتساب اور سیاسی و سماجی خدمات کا حق ہے لیکن عملاً ان میں سے کسی میدان میں اس کا وجود نہیں ہے پھر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دنیا کیسے یقین کر سکتی ہے کہ اسلام نے اسے ترقی کے تمام مواقع فراہم کیے ہیں اور اسے وہ سب کچھ دیا ہے جو اسے ملنا چاہیے۔

اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے ہیں مسلم معاشرے میں اگر ان کا احترام پیدا ہو جائے اور وہ ٹھیک ٹھیک ادا کیے جانے لگیں تو وہ مسائل ہی شاید پیدا نہ ہوں جن کا حوالہ دے کر پورے اسلامی قانون ہی کو بدنام کرنے اور اسے بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے اگر مسلمان خود عورت کے حقوق ادا نہ کریں تو وہ کس منہ سے دوسروں سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ حقوق ان کے لیے پوری طرح واجب الاحترام ہیں اس میں کسی قسم کی تبدیلی کو وہ گوارا نہیں کر سکتے ان کی بے عملی خود اس بات کی دلیل بن جائے گی کہ اس کی تقدیس ختم ہو چکی ہے اور اس کی کم از کم عملی اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔

یہ بات اچھی طرح ذہن میں رہنی چاہیئے کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے ہیں وہ اگر خوش دلی سے ادا نہ کیے جائیں تو ان کے حصول کے لیے وہ غیر اسلامی قوانین کا سہارا لے سکتی ہے اس کے اندر یہ احساس بھی ابھر سکتا ہے کہ جس قانون سے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے اسے بدل ہی جانا چاہیے یہ محض قیاس آرائی نہیں ہے بلکہ واقعات اس کی تائید کر رہے ہیں۔(۶۴)

جب اہل اسلام ہی عورتوں کو اسلام کے عطا کردہ حقوق دینے کے لیے تیار نہ ہوں تو عورت جو نصف انسانیت ہے کسی بھی فتنے اور بیرونی تمدنی و تہذیبی یلغار کے لیے کمزور ہدف بن جاتی ہے اسلام کے نام لیوا معاشرے کے باوجود پاکستان میں خواتین کے ساتھ بے انصافی کا جو رویہ اختیار کیا جاتا ہے اس سے عورتوں میں محرومی کا احساس تو موجود ہی ہوتا ہے اس پر مزید ستم یہ ہے کہ آزاد خیال عناصر بھی اپنے مقاصد کے لیے صنفِ نازک کو آلہ کار بناتے ہیں اور طرح طرح کے اعتراضات و سوالات خواتین کے ذہنوں میں پیدا کیے جاتے ہیں چونکہ ذرائع ابلاغ بھی کافی حد تک ان کی کمین گاہ ہیں اس لیے پاکستانی عورت کے قلب و دماغ میں آزادی، حریت اور مساوات مرد و زن کے خواب مستحکم ہوتے چلے جا رہے ہیں جن خوابوں سے حقیقی مسائل کا کوئی ٹھوس حل تو ممکن نہ ہو سکے گا تاہم مسائل کے باوجود معاشرتی

وحدت اور یگانگت (جو جتنی بھی موجود ہے) کی بنیادیں ضرور متزلزل ہو رہی ہیں۔ پاکستان کے لبرل بالعموم خواتین کے حوالے سے درج ذیل اعتراضات اور سوالات سامنے لاتے ہیں۔

- تعلیم و تربیت میں لڑکیوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔
- شادی کے معاملے میں لڑکی سے رائے نہیں لی جاتی۔
- خواتین کو گھر سے باہر نکل کر معاشی جدوجہد کرنے کی اجازت نہیں ہے۔
- عورتوں کو سماجی سرگرمیوں میں شرکت سے روک دیا جاتا ہے۔
- مرد ہی خاندان کا سربراہ کیوں ہے۔
- مرد خود جو چاہے کرتا ہے مگر عورت کو ذرا سی لغزش پر بلکہ بعض اوقات شک کی بناء پر غیرت کے نام پر قتل کر دیتا ہے جبکہ معاشرہ مرد کا ساتھ دیتا ہے۔
- حجاب اور پردہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے کیونکہ پردے کی صورت میں قوم کے آدھے انسانی وسائل عضوِ معطل بن کر رہ جاتے ہیں اسی طرح حجاب اور پردہ فطری جذبات پر پابندی ہے۔
- مہر کے ذریعے ایک طرح سے عورت کو لونڈی کی طرح خریدا جاتا ہے اور اسے مرد کی باندی بن کر رہنا پڑتا ہے۔
- صرف مرد کو ایک سے زائد شادیوں کی اجازت ناانصافی ہے۔
- طلاق کا حق مرد کی بالادستی کو مزید مستحکم کرتا ہے اور اس سے بیوی کا استحصال کرنے میں مرد کے لیے آسانی پیدا ہوتی ہے۔
- عورت کی گواہی یا شہادت آدھی ہونا ناانصافی ہے عورت مکمل ہے اس لیے عورت کو آدھا اور مرد کو پورا کیوں تصور کیا جاتا ہے، اسی طرح عورت کی دیت بھی آدھی کیوں ہے۔
- عورت امامت نہیں کروا سکتی نہ ہی سربراہ حکومت بن سکتی ہے حالانکہ عورت کی صلاحیت سے استفادہ بھی ہونا چاہیے۔
- مجموعی طور پر عورتوں کو وراثت میں حصہ نہیں دیا جاتا اور ویسے بھی وراثت میں مردوں کا حصہ زیادہ کیوں ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذکورہ اعتراضات کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ زیادہ تر اعتراضات مغرب کی فکر اور تہذیب کے زیر اثر کیے جاتے ہیں اور اگر مغرب میں عورت کے حقوق اور آزادی کا تجزیہ و مشاہدہ کیا جائے تو وہاں کی عورت بدتر استحصال کا شکار ہے۔

- چالیس سال کی عمر کے بعد جب بالعموم عورت کا حسن اور دلکشی ماند پڑ جاتی ہے تو وہ عدم توجہی کا شکار ہو جاتی ہے۔
- آزادی کے مغربی تصور کے تحت بچے بالغ ہوتے ہی آزادی کی ایسی شاہراہ پر گامزن ہو جاتے ہیں جہاں خاندانی نظام میں ماں کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔
- عورت ایک طرف تو معاشی جدوجہد پر مجبور ہے تو دوسری طرف گھر کی ذمہ داری بھی آج تک مرد سے زیادہ عورت ہی ادا کرتی ہے اور اس طرح عورت کو دوہری ذمہ داری ادا کرنی پڑتی ہے۔
- نکاح کے آبرومندانہ ادارے کو وجود میں لائے بغیر ایسے بچوں کی ایک بڑی تعداد مغربی ممالک کا سنگین معاشرتی مسئلہ ہے جس کی کوئی ذمہ داری مرد تو نہیں لیتا مگر عورت اپنی فطری طبیعت، نرمی اور مزاج کے باعث اس بوجھ کو برداشت کرنے پر مجبور ہوتی ہے مغرب کے معاشرتی المیوں کا ترجمان ادب، افسانہ، فلم اور ڈرامہ آج بھی گواہ ہیں کہ حرامی بچوں کی ایک کثیر تعداد کا باپ شناخت کرنے کے لیے عورتوں کو عدالتی چارہ جوئی کے ساتھ اور کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔
- مساواتِ مرد و زن کے دعویدار مغربی معاشروں میں بھی مجرمانہ حملے مردوں پر نہیں عورتوں پر ہوتے ہیں بعض اوقات عورتیں عزت و آبرو کا گنجینہ ضائع کرنے کے ساتھ ساتھ جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔
- ہمارے ہاں عورتوں کی سربراہی کے لیے زور و شور سے آواز بلند کی جاتی ہے مگر خود مغرب کی تاریخ قدیم و جدید میں عورتوں کے سربراہ خاندان اور سربراہ حکومت ہونے کی مثال آٹے میں نمک کی طرح بھی نہیں ہے۔

رہ گیا یہ مسئلہ کہ پردہ عورتوں کی آزادی اور جذبات پر بندش کے علاوہ ترقی کی راہ میں بھی رکاوٹ ہے تو اس اعتراض کا وزن بھی اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب عالمِ مشرق کی تہذیبیں مغرب سے سوال کرتی ہیں کہ مساوات مرد و زن اور آزادی کے خوش کن نعروں پر مبنی صدیوں کے سفر میں کن کن شعبہ جات میں عورتوں نے مردوں پر سبقت حاصل کی ہے مثلاً سائنس کے میدان میں یا سماجی علوم میں اور ٹیکنالوجی میں عورتوں نے کس تناسب سے کامیابی کے جھنڈے گاڑے ہیں ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ عورت کو ہوس و شہوت کی تسکین کے لیے چار دیواری سے باہر نکالنے کے لیے ترقی اور مساوات کے نعروں کی آڑ لی گئی تو خاندانی نظام منتشر ہو گیا۔ حقوقِ نسواں کے علمبردار روشن خیالوں کے اعتراضات کی بنیاد مغربی فکر کے اثرات اور مغربی تہذیبی غلبہ ہیں مگر ان اعتراضات اور سوالات کے جارحانہ ابلاغ سے معاشرتی سطح پر تمام لوگوں نے مغربی رنگ کو اگرچہ قبول تو نہیں کیا تاہم آرام اور چین سے رواں دواں معاشرتی و خاندانی نظام میں رخنہ اندازی ضرور ہوئی ہے۔ حقوقِ نسواں کے نام پر مبنی کوئی تحریک اور تنظیم پاکستانی عورت کے کسی مسئلے کا کوئی ٹھوس حل پیش نہیں کر سکی اسی ضمن میں یہ امر بھی توجہ کا مستحق ہے کہ پاکستانی معاشرے کی اکثریت دینِ فطرت کے فہم اور اسکے نعمت ہونے کے ادراک سے عاری ہے۔ حقوقِ نسواں کی آڑ میں اسلام کی تعلیمات پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں قرآن و سنت کے مطالعے سے نہ صرف وہ اعتراضات رفع ہو سکتے ہیں بلکہ اللہ کی نازل کردہ حدود و قیود کے عظیم نعمت ہونے کا احساس اور یقین بھی مزید پختہ ہو جاتا ہے اس لیے اسلام کا صحیح مطالعہ نہ ہونے کے باعث جو اعتراضات جڑ پکڑتے ہیں وہ فی الواقع عورت کے حقوق اور تحفظ کے ضامن بن کر سامنے آجاتے ہیں۔ عام طور پر عورت اور مرد کی باہمی زندگی اور تعلق کے باب میں مرد کے اختیارات اور بالادستی و فوقیت کو مرد کے ظلم کی وجہ کے طور پر نمایاں کیا جاتا ہے اسلام نے مرد کو ظلم سے باز رکھنے اور حسنِ معاشرت پر قائم رکھنے کے لیے بہترین ہدایات دی ہیں جو حسنِ سلوک کی ضمانت بن جاتی ہیں۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے:

عن عائشة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم خيركم خيركم لاهله وانا خيركم لاهلي۔ (۶۵)

تم میں سے اچھا وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے لیے اچھا ہو اور میں تم میں سے (زیادہ) اپنے اہل کے لیے اچھا ہوں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿وعاشروهن بالمعروف۔﴾(٦٦)

عورتوں کے ساتھ اچھے طریقہ سے بود و باش رکھو۔

ڈاکٹر خالد علوی اپنی کتاب اسلام کا معاشرتی نظام میں لکھتے ہیں:

حضور ﷺ نے بعض خواتین کی شکایت پر عورتوں کو مارنے سے روک دیا تھا اس پر حضرت عمرؓ نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی کہ اب عورتیں سر پر چڑھ گئی ہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اعتدال کی راہ اختیار کرو کیونکہ انتہا پسندی میں معاشرتی نقصانات کا اندیشہ ہے نبی کریم ﷺ نے عورت کی فطرت اور طبیعت کو ٹیڑھی پسلی سے تشبیہ دی ہے۔ استعارہ کی زبان میں اس طرح بیان کیا گیا کہ کچھ باتیں ایسی ہیں جو عورت کی فطرت میں ہیں اور انہیں اس کی فطرت سے نکالنا ظلم بھی ہے اور ناممکن بھی اس میں اس کا کوئی قصور نہیں خالق نے اسے اسی طرح بنایا ہے اس لیے ربط و تعلق میں اس حقیقت کو سامنے رہنا چاہیے۔(٦٧)

اسی تناظر میں عہد حاضر کی بعض تحریکیں عورت کے حق آزادی کے لیے زور و شور سے کوشش میں مصروف ہیں حالانکہ عورت کی محرومی اسلام کی وجہ سے نہیں بلکہ اسلام سے دوری کی وجہ سے ہے اسلام نے عورت کی فطری آزادی کو جو تحفظ دیا ہے وہ اسلامی معاشرت کا عملی ماڈل نہ ہونے کے باعث محض زبانی طور پر (Lip Service) سمجھانا یا علمی استدلال سے معاشرتی سطح پر ثابت کرنا مشکل امر ہے حالانکہ شریعت نے شوہر کے انتخاب اور شوہر کے ساتھ رہنے میں عورت کو اس کی فطرت اور نفسیات کے مطابق اختیار دیا ہے اس کی رائے کا احترام کرنے کی ترغیب ہے اور معاملاتِ زندگی میں عورت کی جذباتیت کو وزن دینے کی تلقین کی گئی ہے جب تک اسلامی معاشرت کا ایک جیتا جاگتا اجتماعی نمونہ موجود نہ ہو کم از کم موعظۃ الحسنہ اور حکیمانہ اسلوب کے ساتھ اسلامی حسن معاشرت کی نشر و اشاعت اور تبلیغ سے بھی حقوقِ نسواں کے ضمن میں مغالطوں کا ازالہ کسی حد تک ممکن تو ہو مگر جب یہ ذمہ داری بھی ادا کرنے سے گریز کا رویہ اختیار کیا جائے تو حقوقِ نسواں کے محاذ پر بھی لبرل ازم کے فروغ کے امکانات بڑھ جائیں گے۔

فصل پنجم

نظامِ تعلیم

ہر جاندار جغرافیائی و ماحولیاتی اثرات کو کسی نہ کسی درجے میں قبول کرتا ہے اور یہ اثرات اس کے طرزِ زندگی کو ایک خاص سمت بھی دیتے ہیں مگر انسان جو اس کائنات کا دولہا ہے اس کا معاملہ اتنا سادہ نہیں کہ یہ محض ماحولیاتی اور جغرافیائی عناصر کے رحم و کرم پر ہو بلکہ اس کی کردار سازی میں کئی دیگر عوامل بھی حصہ لیتے ہیں جن میں سب سے اہم اور مؤثر تعلیم کا عمل ہے ہر نظریاتی معاشرہ اپنے متعین مقاصد کے لیے فرد کو ایک خاص ڈھانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے اور یہ کام تعلیم کے نظام سے ہی سرانجام پاتا ہے۔ دنیا میں خسارے کا سودا کرنے والی نہ جانے کتنی تہذیبیں ایسی گزری ہیں جن کی معاشرتی زندگی خود رو جھاڑیوں کے مماثل ہوتی ہے اور معاشرہ مجموعی طور پر مقصدی زندگی سے عاری ہوتا ہے مگر پاکستان جیسی نظریاتی مملکت کا معاشرہ اگر اپنے مقاصد کا تعین کر کے اپنے افراد کو تعلیم کے عمل کے ذریعے ایک خاص رخ نہ دے تو یہ طرزِ عمل اپنی موت آپ مرنے کے مترادف ہو گا اسی حقیقت کی جانب شاعرِ مشرق نے اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
پھر چاہے جدھر اُس کو اُدھر پھیر

اگر پاکستان ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل کا دعویدار ہے تو اس کے لیے یقینی طور پر نظامِ تعلیم سے اہم کوئی اور شے نہیں ہے چنانچہ جب نظامِ تعلیم کا تذکرہ ہو تو اولین درجے کی اہمیت تصورِ تعلیم کو حاصل ہوتی ہے اسی ضمن میں پروفیسر سید محمد سلیم لکھتے ہیں:

اسلامی معاشرہ کا معاملہ ان سے بالکل مختلف ہے مسلمان قوم ہدایتِ الٰہی کی بنیاد پر قائم ہے مسلمان معاشرہ ایک نظریۂ حیات پر مبنی ہے مسلمان کی ساری زندگی اور زندگی کا ایک ایک گوشہ اس نظریۂ حیات سے متاثر ہوتا ہے مسلمان قوم کے معمارِ اول نے ایک ایک فرد کو اسلامی نظریۂ حیات کے سانچے میں ڈھالا ہے ملتِ اسلامیہ ایسی تعمیر ہے جس کی ایک ایک اینٹ کو پہلے ایک خاص نقطۂ نظر سے گھڑا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گیا ہے تراشا گیا ہے اور پھر اس کو ایک دیوار میں چنا گیا ہے ملتِ اسلامیہ ان گھڑ، ناکندہ تراش من موجی سیلانیوں کا ٹولہ نہیں ہے جس میں ہر سر پھرا جو چاہے کہہ دے اور ہر من چلا جو چاہے کر ڈالے اور جہاں چاہے مٹر گشت کرتا پھرے، نہ کوئی قدغن، نہ کوئی پابندی، مسلمان کی ساری زندگی اس کے نظریۂ حیات کے مطابق بسر ہوتی ہے اس کی ساری تگ ودو ایک محور کے گرد گھومتی ہے حق و باطل، صحیح وغلط، جائز وناجائز کے جانچنے اور پرکھنے کا لازوال معیار اور دائمی کسوٹی اس کے پاس موجود ہے حتی المقدور وہ جائز بات اختیار کرتا ہے اور ناجائز بات سے پرہیز کرتا ہے۔

یہ معیار حق و باطل انسان کا تجویز کردہ نہیں ہے اس لیے ہر دم متغیر نہیں ہے انسانی عقل زیادہ سے زیادہ اپنے سامنے کی مادی بہار دیکھ سکتی ہے گزشتہ اس کے لیے دھندلا اور مستقبل گھپ اندھیرا ہے اس کی ساری گفتگو ظن و تخمین سے ہوتی ہے اس کا طریق کار تجزیاتی و تحلیلی ہے اس کے پیشِ نظر وقتی وہنگامی مصلحت ہوتی ہے تلوّن مزاجی اس کی فطرت میں شامل ہے صداقتِ کامل کو اپنی گرفت میں لانے سے عقلِ انسانی عاجز ہے مزید برآں عقل کی راہنمائی نہ بے لوث ہوتی ہے نہ بے لاگ۔ عالم جمادات میں مطالعہ کرتے وقت انسانی عقل جذبات سے عاری ہو سکتی ہے اس لیے صداقت کا پتا چلایا جا سکتا ہے مگر عالم انسانی میں کسی عقل کا جذبات واحساسات سے عاری ہو جانا ناممکن ہے ماحول اور جذبات کی رنگین عینک ہر وقت ہر شخص کی آنکھوں پر چڑھی رہتی ہے جب بھی کوئی شخص دیکھتا ہے رنگین شیشوں سے دیکھتا ہے اس لیے عالم انسانی میں صداقت تک رسائی حاصل کر لینا عقلِ انسانی کے لیے ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ضرور ہے۔

فضلِ خداوندی نے انسان کو محض عقل کی ناقص راہنمائی پر نہیں چھوڑا اس نے وحی کی فضل [illegible] دور کر دیے۔ تکمیلی علوم اس کو عطا کر دیے اللہ کے فرستادہ برگزیدہ رسولوں نے انسانی

زندگی کا مفہوم اور مطلب سمجھایا، مطلوب اور مقصود بیان کیا۔ مقصود تک پہنچنے کا راستہ متعین کیا راستہ کے لیے ہدایات دیں تاکہ انسان اندھیروں میں نہ بھٹکتا پھرے۔ وحی الٰہی کی ہدایات زمان ومکان کی دستبرد سے محفوظ ہیں یہ ابدی ہیں اور دائمی ہیں مگر ان میں توسیع پذیری اور سازگاری موجود ہے ہر دور اور ہر ملک کے لیے یہ یکساں طور پر قابل عمل ہیں یہ ہدایات تصلب اور لچک کا نادر امتزاج ہیں استحکام اور سازگاری کا عجیب وغریب مجموعہ ہیں یہ وصف اسلامی تعلیمات کا خاص طرہ امتیاز ہے۔(٦٨)

پاکستان میں نظامِ تعلیم کی فکری بنیادوں میں مادی اور دنیوی علوم پر وحی کی بالادستی کا یقین اور عملی رویہ ہی مملکت خداداد کی نظریاتی شناخت کا ضامن ہے اس امر کا تذکرہ تو عام کیا جاتا ہے کہ اسلام کا آغاز ہی "اقراء" سے ہوا ہے ظاہر ہے یہ اسلام کے علم دوست دین ہونے کی روشن دلیل ہے مگر محض اقراء کا لفظ تو پڑھنے کی مہارت اور صلاحیت کی غمازی کرتا ہے جبکہ پورے جملے سے اسلامی تصور تعلیم کا تعارف ہو جاتا ہے یعنی۔

﴿اقراء باسم ربک الذی خلق﴾۔(٦٩)

اپنے رب کا نام لے کر پڑھ جس نے پیدا کیا۔

گویا کہ وہ خواندگی یا پڑھنا جو خالق کے نام کی روشنی سے محروم ہو وہ مقصود نہیں ہے قرآن نے اسی تعلیم میں سوال کیا ہے۔

﴿هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون﴾(٧٠)

علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں

یقیناً قوموں کے عروج وزوال میں علم ہی فیصلہ کن عامل ہے چنانچہ علم رکھنے اور نہ رکھنے والے کبھی برابر نہیں ہو سکتے یہی مذہب کا فیصلہ ہے اور یہی انسانی تاریخ کا سبق بھی لیکن پاکستان میں بد قسمتی یہ ہوئی کہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں سب سے اہم نظام تعلیم تھا جو سب سے بڑھ کر مؤثر توجہ، ترجیح اور اہمیت سے محروم رہا۔ پاکستان کی تخلیق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک معتدل اور مؤثر نظام تعلیم کی تشکیل ہماری اولین ضرورت تھی جو قوم کے مادی اور نظریاتی تقاضوں کو بیک وقت پورا کر سکے لیکن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قیامِ پاکستان سے آج تک بے سمت اور کسی حد تک دوہرا نظامِ تعلیم ملکِ خداداد میں رائج ہے جس نے فکری اور طبقاتی کشمکش کو تقویت دی ہے ماہرِ تعلیم جناب ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

> ہمارے ہاں مغربی طرز کے تعلیمی ادارے اور قدیم طرز کے اسلامی مدارس اسی تفریق اور ثنویت کی نشاندہی کرتے ہیں ایک طرف مادی ماحول کے تقاضوں کی پاسداری کا اہتمام ہے اور دوسری طرف اپنے بنیادی نظریۂ حیات یعنی اسلام کے تصور کو محدود کرتے ہوئے ایسی نصابی قدغنیں لگادی گئی ہیں جو مدرسے کے نظامِ تعلیم کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہونے دیتیں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں طرح کے نظامِ ہائے تعلیم کی فیکٹریوں سے نکلنے والے افراد میں کسی طرح کی کوئی ذہنی و فکری ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکی بلکہ یہ کہنا بے محل نہ ہو گا کہ دونوں کے فکر و نظر میں تضاد پیدا ہوا اور دونوں طبقے ایک دوسرے کے حریف ٹھہرے۔(۷۱)

ان دونوں طبقوں میں حریفانہ کشمکش سے ایک راستہ ملاں کا اور دوسرا مسٹر کا قرار پایا۔ دو الگ الگ راستوں کا برصغیر میں ماخذ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے فوراً بعد کے حالات ہیں جب تحریکِ علی گڑھ کی صورت سرسید احمد خان نے جدید تعلیم اور مغربی طرزِ تعلیم کو مسلمانوں کی نجات کا واحد راستہ قرار دیا جبکہ دیوبند اور دیگر مذہبی طبقوں نے علومِ اسلامیہ کے دفاع کو ترجیح قرار دیتے ہوئے جدید تحریکِ تجدد کی مخالفت کی۔ نظامِ تعلیم کے یہ دونوں دھارے آج بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں جدید تصورِ تعلیم پر مغربیت کی واضح چھاپ مغرب کی تہذیبی غلبے کے باعث ہے ایک ایسا تہذیبی غلبہ جس نے اپنے عروج کے لیے مذہب عیسائیت کو شکست دی اور اپنے تصورات تعلیم کو سیکولر بنیادوں پر استوار کیا جس میں دین و دنیا کی ثنویت ہی اصل امتیاز تھا اب چونکہ تحریکِ پاکستان اسلام کی بنیاد پر برپا تو کی گئی تھی تاہم قیادت جدید تعلیم یافتہ اور قیامِ پاکستان کے بعد سے آج تک حکمران بھی مغربی تعلیم سے آراستہ اس لیے مجموعی طور پر مغربی نظامِ تعلیم ہی پاکستانی معاشرے میں سکہ رائج الوقت ہے جس میں اسلامائزیشن کی پیوند کاری کا ہر حربہ اس لیے عبث ہے کہ یہ نظام اپنے خمیر کے اعتبار سے ہی سیکولر ہے جس میں اگر کسی روحانی

تقاضے کا لحاظ رکھا بھی گیا ہے تو اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات سے زیادہ محض ایک مذہب تصور کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

> اسلام ایک مذہب نہیں ایک دین ہے جہاں مذہبی امور الگ روحانی بستی نہیں بساتے بلکہ ایک ضابطۂ حیات ایک نقطۂ نظر اور ایک خارجی پیکر رکھتے ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں اور ان کے باہمی عمل اور رد عمل سے وہ اکائی ہاتھ آتی ہے جو اصل زندگی ہے اور جس میں خیر و شر کی آویزش اور نیکی و بدی کا امتیاز ایک اہم فریضہ ادا کرتا ہے ذہن کی بیداری اور حق و باطل میں امتیاز کی صلاحیت وہ شرف ہے جو انسان کو حاصل ہے اور جس کی بناء پر وہ پیہم جدوجہد اور مسلسل تگ و دو میں مصروف رہتا ہے۔(۷۲)

پاکستانی معاشرے کا غالب نظامِ تعلیم مغربی نظامِ تعلیم کے مماثل ہے گو کہ اس سلسلے میں بعض شعبوں میں کارآمد اور مفید طریقے رائج ہیں ان کو قابلِ قدر اور مستحسن قرار دیا جا سکتا ہے مگر درس و تدریس کی مہارتیں مؤثر اور مفید ہونے کے باوجود نئی نسلوں کی تعمیر میں اصل کردار تصورِ تعلیم، مقصدِ تعلیم اور اقدارِ تعلیم کا ہوتا ہے لہٰذا نظامِ تعلیم کے اس تذکرے میں اس امر کا تعین کرنا ضروری ہے کہ رائج تعلیمی نظام سے کن تصورات اور اقدار کو فروغ حاصل ہو رہا ہے مغربی نظامِ تعلیم چونکہ انکارِ مذہب پر استوار ہوا ہے اس لیے اس کی رگ رگ میں لادینی تصورِ حیات ہے نوخیز طلبہ کی کثیر تعداد لادینیت کی طرف مائل ہوتی ہے یا لادینیت کا عملی رویہ قبول کرتی ہے یا پھر کم از کم دین کے قابلِ عمل اور مکمل ضابطۂ حیات ہونے کا اعتقاد متزلزل ہو جاتا ہے مذہب فرد کا ذاتی معاملہ قرار دیا جاتا ہے اور دین و دنیا کی تفریق قائم کر دی جاتی ہے، پھر اس کے بعد جب مذہب کو زندگی کے انفرادی دائرے تک محدود کرنے کا ہدف حاصل ہو جاتا ہے تو غیر جانبداریت کو فروغ دیا جاتا ہے غیر جانبدار ہونا اہلِ مغرب کے ہاں بے حد قابلِ ستائش قدر ہے مغربی طرزِ فکر میں غیر جانبدار ہونا ہی اصل میں لبرل ازم ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص کو آزادی حاصل ہونی چاہیے کہ وہ کائنات، زندگی اور آخرت کے متعلق خود اپنا نظریہ اور مؤقف وضع کرے۔ عقیدہ اختیار کرنے بلکہ ایجاد کرنے میں ہر فرد کو آزادی ہو پھر مزید یہ کہ فرد کو کسی مخصوص مذہب اور اخلاق کی تعلیم دینا اس کی شخصی آزادی کے خلاف ہے لہٰذا نظامِ تعلیم جیسے مؤثر راستے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے ایک نظریاتی معاشرے کی نئی نسل کو پہلے مرحلے پر دین و دنیا کی تفریق کا شعور دیا جائے تاکہ دین کا کلّی اور اجتماعی تصور ختم ہو جائے پھر جب زندگی کے روحانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے انسان کو انفرادی اختیار حاصل ہو جائے کہ وہ چاہے تو کسی قانونی و اخلاقی بندش کو قبول کرے یا نہ کرے تو یہ وہی فلسفہ حیات ہے جو قبل مسیح زمانے میں سوفسطائیوں نے اختیار کر کے یونانی معاشرے کو انتشار میں مبتلا کر دیا تھا جب پروٹاگورس نے کہا:

Man is the measurement of all the things.

اور عہدِ حاضر میں دنیائے مغرب کی معروف قدر آزادی ہے جس کی اجتماعی صورت کا نام لبرل ازم ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک طاقتور معاشرتی روایت، مؤثر نظامِ تعلیم اور تیز رفتار ذرائع ابلاغ کے سامنے کوئی بھی فرد اپنا غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر کیسے وضع کر سکتا ہے جب استاد، کتاب اور ادارہ پورے زور و شور سے اور منظم انداز میں مذہب بیزاری اور مذہب سے لاتعلقی کا پروپیگنڈہ کر رہے ہیں جبکہ مذہبی بنیادوں پر ہونے والی ہر سرگرمی کی مزاحمت کی جائے اور غیر جانبداری کا مفہوم صرف لامذہبیت بن جائے تو طالب علم کا ذہن لادینیت اور منفی اندازِ فکر پر خود بخود مستحکم ہوتا چلا جاتا ہے۔ نظامِ تعلیم کے ذریعے غیر جانبداری کے رویے کا فروغ دراصل لبرل ازم کا فروغ ہے جس میں اخلاقی اقدار اور نظریاتی تعلیم کے علاوہ ہر رطب و یابس کی اجازت ہے البتہ اخلاقی اقدار اور نظریاتی تعلیمات کی ترویج سے باور کیا جاتا ہے کہ یہ جبر ہے اس سے طلبہ کی تخلیقی صلاحیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور آزادانہ تحقیق کے امکانات مسدود ہو جاتے ہیں اس لیے مغربی نظامِ تعلیم میں آزادی کے تصور کو کلیدی اہمیت حاصل ہے گو کہ آزادی انسان کا فطری حق ہے اور جدید دور میں روسو کا یہ جملہ آزادی کا ماخذ ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوا تھا لیکن آج ہر جگہ وہ پابندِ سلاسل ہے مگر مغربی نظامِ تعلیم عمرانی و سماجی افکار میں جس آزادی کے تصور کو پیش کرتا ہے اور شاعری، ادب، افسانے اور ڈرامے سے جس آزادی کو انسان کے فطری حق کے طور پر متعارف کرواتا ہے وہ فطری حدود سے متجاوز ہے جیسا کہ پروفیسر سید محمد سلیم کے خیال میں:

> مغرب میں آزادی کا تصور فطری حدود سے تجاوز کر گیا ہے آزادی کے ڈانڈے مادر پدر آزادی سے جا کر مل گئے ہیں روسو اور دوسرے مفکرین نے جوشِ جذبات میں آ کر ہر قسم کی پابندیوں، بندشوں اور ضابطوں کے خلاف جنگ شروع کر دی فلسفہ وجودیت (Existentialism) کا یہودی نژاد فلسفی ژاں پال سارتر تو

> اس حد تک آگے بڑھ گیا کہ انسانوں کی آزادی کے لیے وہ خدا، مذہب اور اخلاق کے انکار کو ضروری سمجھتا ہے ناعاقبت اندیشی سے ان سب لوگوں نے ایک ایسی تحریک کو ہوا دی جس نے پروان چڑھ کر معاشرہ کے تار و پود بکھیر دیے۔ مذہب و اخلاق سے مکمل رہائی حاصل کر لی، ضبطِ نفس کی بندشیں ٹوٹ گئیں عریانی، ہوس رانی اور کام جوئی دل پسند مشاغل بن گئے نئی نسل نے غضب کر دیا تمام مسلمہ انسانی آداب اور معاشرتی روایات پر قینچی چلا دی اب وہ فی الواقع مادر پدر آزاد ہے۔(۷۳)

مادر پدر آزادی کی یہی لہر عہدِ برطانیہ میں پاک و ہند کا رخ کرتی ہے تو اس کی طرف لپکنے اور اسے انسانیت کی نجات دہندہ سمجھنے والے مقامی روشن خیال اس مخصوص پس منظر کو خاطر میں نہیں لاتے جس نے روشن خیالی کے امکانات پیدا کیے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ پاک و ہند کا پس منظر بالکل مختلف تھا اور آج بھی پاکستان کے معاشرے کی مذہبی روایت یکسر مختلف ہے۔ مغرب میں لبرل ازم کا فروغ جس ماحول میں ہوا وہ مذہب کے نام پر معاشرتی جبر، مذہبی قیادت کے استحصالی رویے اور تشکیک کا ماحول تھا جس میں مغربی مفکرین نے عیسائیت کی مسخ شدہ تصویر سے بے زار ہو کر آزاد خیالی کا راستہ اختیار کیا۔

فکر و دانش کی دنیا میں رسل کا مقام اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں ہے مگر فلسفے اور فلسفیانہ نظریات کی دنیا میں رسل کے عقائد کو اس کے ماحول سے کاٹ کر سمجھنے میں مغالطوں کا امکان ہے۔ مذکورہ حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے کہ مغربی نظامِ تعلیم میں مذہب بے زاری، لادینیت، غیر جانبداری اور آزادی کے رجحانات کا ایک مخصوص پس منظر تھا اب اس پس منظر میں پروان چڑھنے والے عقائد و افکار اور تعلیمی نظام کو قبول کرنا کوئی دانش مندانہ امر نہیں ہے پھر جب آزاد خیالی کی قدر کے ساتھ نظامِ تعلیم وضع کیا جائے گا اس کا طالبعلم کی شخصیت سازی سے تعلق کمزور ہو گا جبکہ وہ محض معلومات (Information) مہیا کرے گا گویا کہ تعلیم کے ساتھ تربیت کا عنصر مفقود ہو گا جبکہ پاکستان جیسے نظریاتی معاشرے میں نظامِ تعلیم اگر محض معلومات فراہم کر رہا ہے تو وہ معاشرے کے لیے مطلوب افراد کی تیاری کا کام نہ کر سکے گا۔ پروفیسر سید سلیم لکھتے ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہب اور اخلاق سے رشتہ منقطع کر لینے کے بعد مغربی مفکرین کے یہاں تعلیم معلومات اندوزی کا ہم معنی قرار پا گئی تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ معلومات کی ذخیرہ اندوزی کر لی جائے تاکہ بوقت ضرورت کام آئے نظریۂ معلومات اندوزی قبول کر لینے کے بعد مغربی نظامِ تعلیم میں لائبریری، لیبارٹری، امتحانات، سندات، دفتریت اور عمارات کو اصل اہمیت حاصل ہو گئی ان کے اہتمام اور انصرام اور آرائش وزیبائش پر بے تحاشا دولت صرف کی جاتی ہے حسنِ تعمیر اور حسنِ تزئین کا باہم مقابلہ ہوتا ہے بے چارے استاد اور شاگرد جن کے نام پر یہ سارا ہنگامہ برپا ہے وہ اس غوغا میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ احکام اور ضابطہ کی جکڑ بندی کا یہ عالم ہے کہ استاد اور شاگرد انتظامیہ کے تحت دو بے اثر پرزوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے وہ درس گاہیں آج مفقود ہیں جہاں شفیق استاد اور اطاعت شعار طالبعلم درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے جہاں باہمی تعاون سے کردار سازی اور انسانی آفرینی کا عمل جاری رہتا تھا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ درس گاہ نہیں ہے، کوئی کارخانہ ہے جہاں بے جان پرزے ڈھالے جا رہے ہیں۔ (۷۴)

دورِ جدید میں اپنی ظاہری چمک دمک سے اور انتظامی رعب داب سے بلاشبہ تعلیمی دنیا نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے مگر انسان سازی کا اصل کام جو تعلیم کا بنیادی ہدف ہے بہت ہی پیچھے چلا گیا ہے اس نظامِ تعلیم کا ایک اور وصف تیز رفتاری ہے جس میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات دماغوں میں ٹھونس لینا یا رٹ لینا ہی اصل قابلیت ہے اس کے برعکس ایک مقصدی اور ذمہ دار نسل کی تیاری کے لیے تعلیم، تربیت کے بغیر کارِ لاحاصل ہے۔ ڈاکٹر خالد علوی اسلامی تصورِ تعلیم کے بنیادی ہدف تربیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مدرسہ و مکتب میں استاد کے ساتھ طالبعلم کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اساتذہ اور مدارس فقط طالبعلم کی تربیت اور خدمت کے لیے بنائے گئے ہیں طلبہ ہی کسی قوم کا اصل جوہر ہوتے ہیں کیونکہ یہی آگے چل کر کسی نہ کسی صورت میں انسانی اور معاشرتی حرکت کو برقرار رکھتے ہیں آج کے طالبعلم کل کے اساتذہ، افسر،

> کارکن، وزیر، صنعت کار اور تاجر ہوں گے اس لیے اسلامی مدارس میں طلبہ کی صلاحیتوں کے مطابق ان کی تربیت اور تعلیم پر بہت زور دیا جاتا ہے چونکہ یہ دور تربیتی اور تعلیمی ہوتا ہے اس لیے اس میں سب سے بڑا کمال یہ ہوتا ہے کہ طالبعلم زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے اور زیادہ سے زیادہ اپنے کردار کا تحفظ کرے۔ (۷۵)

پاکستانی معاشرے میں تربیت اور اخلاقی اقدار سے عاری نظامِ تعلیم کی جڑیں اتفاقاً مستحکم نہیں ہوئیں بلکہ عالمی سطح پر مادیت، سرمایہ دارانہ تہذیب اور لبرل ازم کے فروغ کے لیے سرگرم عمل قوتوں اور ان کے نمائندوں نے ٹھوس منصوبہ بندی سے تعلیم کو بھی محض ایک معاشی عامل بنا کر رکھ دیا ہے ترقی پسند مفکر اقبال خان لکھتے ہیں:

> آج کل کے زمانے میں تعلیم کا مقصد صرف ایک ہی قرار دیا جاتا ہے یعنی نوجوان نسل کو ملازمتیں حاصل کرنے کے لیے تیار کرنا اور اس غرض سے سکولوں میں ان ہنروں کی تربیت دینا جن کی ملکی معیشت میں مانگ ہے تعلیم کے کلچرل اور اخلاقی مقاصد جن پر تعلیمی مفکرین ہزاروں سالوں سے زور دیتے چلے آ رہے تھے وہ سب اگر بالکل ہی رد نہیں کر دیے گئے ہیں تو بہت بڑی حد تک پس پشت ڈال دیے گئے ہیں ان رجحان کا سب سے مکمل اور طاقتور اظہار ہمیں انگلستان کی نئی قومی ایجوکیشنل پالیسی میں ملتا ہے جو مسز تھیچر کی حکومت نے وضع کی تھی اور جس پر زور شور سے عمل ہو رہا ہے لیکن یہ رجحان کسی مخصوص قوم یا حکومت تک محدود نہیں بلکہ عالمی طور پر ایک غالب رجحان ہے تعلیم کے اس نظریے کو فروغ دینے اور مستحکم کرنے کے پیچھے دو طاقت ور عوامل کام کر رہے ہیں ایک تو یہ کہ خواہ مغرب ہو یا مشرق، صنعتی طور پر ترقی یافتہ قومیں ہوں یا ترقی پذیر قومیں، ہر جگہ لوگ قدرتی طور پر اپنے بچوں کے لیے مالی اور مادی بہبود اور اعلیٰ سے اعلیٰ سماجی پوزیشن اور اقتدار چاہتے ہیں اور چونکہ جدید زمانے میں اس کا بہت حد تک تعلق اچھی تعلیم اور ٹیکنالوجی پر مہارت سے ہے اس لیے وہ سکولوں اور کالجوں سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بجا طور پر یہ توقع کرتے ہیں کہ اپنے ذرائع (جو بہر حال انہی لوگوں کے ٹیکسوں اور فیسوں کے ذریعہ حاصل کیے جاتے ہیں) ایسی تعلیم مہیا کرنے پر ہی صرف کریں جو معاشرے میں ان کی حیثیت بڑھانے میں مددگار ثابت ہو۔

دوسرا فیکٹر (Factor) جس نے تعلیم کے متذکرہ بالا نظریے کو غالب نظریہ بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے وہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آخری دور میں تقریباً ہر جگہ جمہوری قوتوں کو شکست ہوئی ہے اور ہر ملک کے حکمرانوں کی یہ خواہش رہی ہے کہ وہ مستقل برسرِ اقتدار رہیں یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب عوام سیاست میں دلچسپی لینا اور سیاست میں ملوث ہونا چھوڑ دیں بلکہ کسی بھی قسم کے آئیڈیلز کے چکر میں نہ پڑیں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے حکمرانوں نے دو حربے استعمال کیے ہیں ایک طرف تو تعلیم کے دائرے میں عملی طور پر جہاں تک بھی ہو سکا ہے ایسے مضامین کو "بے مصرف" قرار دے کر انکی طرف حقارت آمیز رویے کو فروغ دیا ہے جن کا تعلق سوچ اور کلچر سے ہے اور جو انسان کو تصورات اور آئیڈیلز بنانے میں مدد کرتے ہیں اور خاص طور پر ایسے آئیڈیلز جن کا اثر براہِ راست مروجہ سیاسی نظام پر پڑتا ہے اور لوگوں کو اس نظام کے خلاف سوال اٹھانے پر اکساتا ہے دوسری طرف ان حکمران طبقوں نے ایک نہایت عظیم الشان پیمانے پر تفریحی انڈسٹری کو فروغ دیا ہے جس میں ٹیلی ویژن اور ویڈیو وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان تفریحی ذرائع کے ذریعے عوام کے ذہنوں کو چوبیس گھنٹے اس طرح "مصروف" رکھنے کے مواقع فراہم کر دیے گئے ہیں کہ انہیں سوچنے یا غور و فکر کرنے کا نہ وقت ملتا ہے نہ ضرورت محسوس ہوتی ہے چنانچہ لوگ صبح و شام کام میں یا ٹیلی ویژن دیکھنے میں لگے رہتے ہیں یعنی آرام و آسائش کی مادی اشیاء اور تفریحات کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں اور وہ یہ چیزیں جتنی حاصل کرتے ہیں اتنی ہی اور چاہتے ہیں ان کی پیاس کبھی نہیں بجھتی اور اس طرح مشینوں کے پہیے رات دن چلتے رہتے ہیں فیکٹریاں آسائش اور تفریح کے نت نئے سامان

اگلتی رہتی ہیں سرمایہ دار کمپنیاں اور بنک دولت بٹورتے رہتے ہیں اور چونکہ لوگوں کو سکولوں میں ہی اس طرح کا پروگرام دیا جاتا ہے کہ وہ بس زیادہ سے زیادہ آسائش اور تفریح ہی چاہتے ہیں کچھ اور نہیں چاہتے۔(۷۶)

عالمی سطح پر لبرل جمہوریت اور سرمایہ دارانہ تہذیب کے غلبے نے تعلیم اور خاص طور پر ذرائع ابلاغ کے ذریعے مغرب کی بے خدا ثقافت کو دنیا بھر میں روشناس کروایا ہے اور بد قسمتی سے پاکستان بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ وہ گنے چنے افراد جو اس تہذیبی یلغار کے خلاف دفاعی مورچوں پر ڈٹے ہوئے تھے ان کی مدافعت تعلیم کے جدید رجحانات کے سامنے کمزور پڑتی چلی جا رہی ہے معاشرے کے یہ چند افراد اپنی انفرادی زندگی اور خاندان میں تو مزاحمت کر سکتے ہیں لیکن گلی، مارکیٹ، محلے، ثقافتی مراکز اور تعلیمی اداروں میں لبرل ازم کے بڑھتے قدموں کو روکنا ممکن نظر نہیں آتا حتیٰ کہ دانستہ یا نادانستہ طور پر مغرب کے معیار ہی معاشرے کے معیار بنتے چلے جا رہے ہیں تجدد کے اسی رجحان کا نتیجہ ہے کہ جو چیز مغرب کے معیار پر پوری اترے اسے درست سمجھا جاتا ہے اور قابل فخر قرار پاتی ہے اور جو اس معیار پر پوری نہ اترے ٹھکرا دی جاتی ہے اگرچہ آزاد ہونے کا دعویٰ اپنی جگہ پورے زور شور سے جاری ہے مگر فی الواقع ذہنی غلامی اور محکومی ایک ٹھوس حقیقت ہے ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی نے اپنے مضمون مغربی ثقافتی استعماریت اور تعلیم میں سلیم احمد کی نظم "مشرق ہار گیا ہے" کے چند حصے نقل کیے ہیں جو لبرل ازم کے فروغ اور مقامی مشرقی تہذیب کی پسپائی کا بڑا موثر اظہار ہیں سلیم احمد لکھتے ہیں:

کپلنگ نے کہا تھا
مشرق مشرق ہے
اور مغرب مغرب ہے
اور دونوں کا ملنا ناممکن ہے
لیکن مغرب مشرق کے گھر، آنگن میں آ پہنچا ہے
میرے بچوں کے کپڑے لندن سے آتے ہیں
میرا نوکر بی بی سی سے خبریں سنتا ہے
میں بیدل اور حافظ کی بجائے شیکسپیئر اور رلکے کی باتیں کرتا ہوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اخباروں میں مغرب کے چکلوں کی خبریں اور تصویریں چھپتی ہیں
مجھ کو داڑھی والے اکبر کی کھسیانی ہنسی پر رحم آتا ہے
اقبال کی باتیں (گستاخی ہوتی ہے)۔۔۔ مجذوب کی بڑ ہیں۔۔۔
وارث شاہ اور بلھے شاہ اور بابا فرید
چلئے جانے دیجئے ان باتوں میں کیا رکھا ہے
میں ہار گیا ہوں
میں نے اپنے گھر کی دیواروں پر لکھا ہے۔ میں ہار گیا ہوں
میری روح کے اندر ایک ایسا گہرا زخم لگا ہے
جس کے بھرنے کے لیے صدیاں بھی ناکافی ہیں
میں اپنے بچے اور کتے دونوں کو ٹیپو کہتا ہوں "میں ہار گیا ہوں" (۷۷)

جس کرب اور اضطراب کا اظہار سلیم احمد نے کیا ہے اس کے ادراک سے بھی معاشرہ عاری ہوتا چلا جا رہا ہے گویا کہ

حادثے سے بڑھ کر سانحہ یہ ہوا
لوگ ٹھہرے نہیں حادثہ دیکھ کر

اگر پاکستانی معاشرہ اپنے تشخص، شناخت اور اقدار کے تحفظ میں کامیاب نہیں ہو سکا تو سیاسی عدم استحکام اور حکمرانوں کی نااہلی کے ساتھ ساتھ ایک بڑا اور اہم سبب تعلیمی نظام ہے جو منتشر اور بے سمت بھی ہے اور تہذیب مغرب کا نمائندہ بھی ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں:

ہمارا نظام تعلیم جس طرح کام کر رہا ہے اس کا جائزہ لیں تو واضح ہوتا ہے کہ ہمارے پالیسی سازوں نے دونوں مقاصد کو نظرانداز کر دیا ہے پاکستانی قوم مسلمان قوم ہے اور اسلامی تشخص اور مسلم روایت ہی اس کا قومی نظریہ ہے پاکستان کی تخلیق ہی اس تشخص و روایت کی حفاظت کے لیے ہوئی تھی پاکستان بننے کے بعد پالیسی سازی پر منحرفین اور مرتدین کا تسلط ہو گیا انہوں نے اس اساسی نظریے کے ضمن میں کنفیوژن پیدا کیا اور پھر اسے متنازعہ فیہ بنایا اس کے لیے

تمام ممکنہ حربے استعمال کیے اس وقت صورتحال یہ ہے کہ اس ملک میں بسنے والے اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ یہ ملک کس لیے بنا تھا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستانی قوم کے افراد بکھر گئے ہیں، بچھڑ گئے ہیں اور نظام تعلیم انہیں مجتمع اور متحد کرنے میں ناکام ہو گیا ہے جہاں تک دوسرے مقصد کا تعلق ہے تو اس کا حصول بھی ناممکن ہو گیا ہے سیاسی انتشار بلکہ فساد اور منفی اقتصادی منصوبہ بندی نے اس ملک کو صارفین کی منڈی بنا دیا ہے تعلیمی اداروں کا ملک کی اقتصادی و معاشرتی منصوبہ بندی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ سی ایس پی کی امرت دھارا کلاس نے جہاں ملک کے انتظامی ڈھانچہ کو جامد اور غیر نفع بخش بنایا وہاں تعلیمی اداروں کو بھی برباد کیا۔ اساتذہ کو محروم المعیشت رکھنے اور معاشرتی طور پر کم تر گردانے کی پالیسی نے بے پناہ الجھنیں پیدا کر دی ہیں مسلسل محرومیوں نے اساتذہ کو احتجاجی سرگرمیوں پر آمادہ کیا بلاشبہ نظریاتی تخریب کاری بھی سرگرم عمل ہے لیکن بڑا سبب اساتذہ کی محرومیاں ہیں اربابِ اختیار کی ظالمانہ اور شر پسندانہ پالیسیوں ہی کے نتیجے میں طلبہ میں بے چینی پیدا ہوئی منحرفین اور مرتدین نے ایک منصوبے کے تحت طلبہ کے ایک سیکشن کو تخریب کاری اور نظریاتی فساد پر آمادہ کیا جس کے رد عمل میں طلبہ کی مثبت قوتیں بھی متحرک ہوئیں تصادم کے نتیجے میں تخریب کاری کو پسپا ہونا پڑا اس ساری کشمکش کا حاصل یہ ہے کہ کلاسیں غیر منظم ہو گئیں، نصابی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں، امتحان اور نتائج مؤخر ہوتے چلے گئے تعلیم میں محنت و لگن کا فقدان ہونے لگا امتحان میں ناجائز ذرائع، ڈگریوں کی خرید و فروخت، امتحانی مراکز کی بیع و شراء ہمارے نظامِ تعلیم کا حصہ بن گئے اس سارے عمل کا نقصان عام انسان کو ہوا ہے کیونکہ سرکاری اداروں میں اسی کے بچے تعلیم پاتے تھے بیوروکریسی، صنعتکار اور زمیندار کی اولاد تو پہلے ہی پرائیویٹ مخصوص تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتی یا بیرون ملک داخلے لیتی بیوروکریسی اور پالیسی سازوں کو ملک کے نظامِ تعلیم سے اتنی بھی دلچسپی نہیں جتنی انگریز کو اپنے دورِ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اقتدار میں تھی جس طرح کی بابو کلاس انگریز تیار کرنا چاہتا تھا اسے محنت اور دیانت سے تیار کرتا تھا ہمارے سائنس کے نصابات فرسودہ ہیں انجینئرنگ اور طب میں بھی ہم ترقی پذیر ممالک میں بھی پسماندہ ہیں تحقیق و تصنیف میں بھی بین الاقوامی سطح پر بھی ہمارا کوئی مقام نہیں اردو، پنجابی، پشتو اور سندھی زبانوں کے پی ایچ ڈی پیدا کر رہے ہیں اسی طرح عربی، فارسی اور اسلامیات میں بھی پی ایچ ڈی کا رجحان محض اضافی ترقیاں حاصل کرنے اور ملازمت میں اگلے گریڈ تک پہنچنے کی جدوجہد ہے "احوال و آثار" ہماری تحقیق کا پسندیدہ موضوع ہے حتی کہ اب کوئی شخصیت ہی نہیں بچی ہو گی جس کے "احوال و آثار" ہمارے محققین کی دسترس سے باہر ہوں زندہ و متحرک علوم میں ہمارا کتنا حصہ ہے اس کا اندازہ آپ کو بین الاقوامی مجلّات تحقیق کی ورق گردانی سے ہو گا ملک کے اندر ایسی روایت فروغ پا گئی ہے کہ جس کے نتیجے میں دیانتدارانہ محنت بے معنی ہو کر رہ گئی ہے معاشرے میں عزت اختیارات و دولت کی وجہ سے ہے افسر کے پاس اختیار ہے اور صنعتکار اور زمیندار کے پاس دولت ہے ان دونوں کے غیر مقدس اتحاد نے استاد کے مقام و مرتبہ کو ختم کر دیا ہے سی ایس پی افسروں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ کسی استاد کو خواہ وہ کتنا عالم فاضل ہو اکیسویں اور بائیسویں گریڈ میں نہیں جانے دینا کیونکہ یہ سی ایس پی کی برہمن کلاسوں کی انفرادیت اور اختیار کے خلاف ہے استاد جو اپنی شرافت اور علم کے باعث معزز و محترم تھا، اختیار و دولت نہ ہونے کے باعث معاشرتی پسماندگی کی علامت بن گیا۔(۷۸)

ڈاکٹر خالد علوی صاحب نے بجا طور پر پاکستان میں نظامِ تعلیم کے فرسودہ ہونے کا جامع تجزیہ کیا ہے اور ان اسباب کا تذکرہ بھی کیا ہے جن کے باعث آج یہ تعلیمی نظام بے روح اور پسماندہ ہے جس میں سب سے قوی سبب وہ نوکر شاہی ہے جو سب طبقات سے بڑھ کر آزاد خیالی کی علمبردار ہے کیونکہ اس کلاس کا انتخاب اور تربیت ہی ان خطوط پر ہوتی ہے جو گورے انگریزوں کے جانے کے بعد کالے انگریزوں کی تیاری کے ضامن ہیں لہٰذا ایک بے جان تعلیمی نظام جس میں عام فرد کے بچے کے لیے تعلیم

کی راہ مسدود ہے اور کسی بھی بیرونی تہذیبی و فکری حملے کے مقابل کمزور نظام آج کے پاکستان میں آزاد خیالی کی راہ ہموار کرنے میں کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی نظامِ تعلیم کے بارے میں نوجوان نسل کو خبردار کرتے ہوئے کہا تھا:

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش
اور اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش

جدید اور رائج نظامِ تعلیم نے پاکستان کے نوجوان کو اس طرح ہدف بنایا ہے کہ وہ کسی حد تک تھوڑی سی معلومات (Information) تو اکٹھی کر لیتا ہے یا چند مہارتیں سیکھ جاتا ہے مگر اپنی روایات، اقدار اور تہذیب سے یوں کٹ جاتا ہے جیسے کہ اپنا حافظہ کھو بیٹھا ہو اور مغرب کی پوری فکر کو قبول نہ بھی کرے تو اس تہذیب کی مادی و عسکری برتری کا رعب اس کے اندر کچھ کر گزرنے کا داعیہ ختم کر دیتا ہے گزشتہ نصف صدی سے مغربی تہذیب نے مکمل غلبہ اگر حاصل نہ بھی کیا مگر اسلامی تہذیب کی بہت ساری خوبیاں اس سے متاثر ہو کر مفقود ہو گئیں اور تبدیلی کے اس عمل میں نظامِ تعلیم ہی لبرل ازم کے فروغ کی اصل شاہراہ قرار پایا۔ ایرانی سکالر سید حسین نصر لکھتے ہیں:

> اٹھارویں صدی میں مغرب کی مادی برتری، فوجی اور سیاسی غلبے کو محسوس کر کے بعض مسلمانوں کا ایمان اپنی تہذیب اور اپنے اداروں پر متزلزل ہو گیا ان میں سے بعض تجدد پسندوں نے جدیدیت اختیار کرنے کی کوشش کی وہ چاہتے تھے کہ تہذیب کے تمام مظاہرات کو مغربی رنگ میں رنگ دیا جائے۔ تعلیم سے لے کر موسیقی تک، بس عقائد اور عبادت کا حصہ محفوظ رکھا جائے بعض دوسرے افراد نے مذہب کی تجدید بھی کرنے کی کوشش کی مگر بہت کم کامیابی ہوئی انہوں نے مغربی لباس، فن تعمیر، شہری منصوبہ بندی، ادب، موسیقی، تعلیم اور دوسرے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عناصر جن سے کسی تہذیب کی تشکیل ہوتی ہے ان سب میں مغرب کی نقل اتارنی شروع کر دی ذہنی اور فکری سطح پر انہوں نے بڑی سُرعت کے ساتھ مغربی افکار و تصورات کی تقلید شروع کر دی انہوں نے انیسویں صدی میں رائج فکری نظریات کو اختیار کر لیا جسے ترقی پسندی کہتے ہیں آج ترقی پسندی کا چلن مغرب کے دانشور طبقہ میں ختم ہو چلا ہے مگر مشرق میں کتنے ہی تجدد پسند ہیں، خود مسلمانوں میں کتنے ہیں جو ابھی تک اس کے پرستار بنے ہوئے ہیں۔(۷۹)

تعلیمی میدان میں جدید و قدیم کی دلیل کم نظری پچھلی صدی سے فکری مغالطوں کو جنم دے رہی ہے ٹھیٹھ اسلامی تصورِ تعلیم اور افکار و تعلیمات کے یقین اور رسوخ کے ساتھ اسلامی نظامِ تعلیم کی تشکیل کا نعرہ بھی کمزور پڑتا جارہا ہے فیصلہ ساز شخصیات اور ادارے اس بصیرت سے محروم ہیں جس کے صدقے نظامِ تعلیم ان بنیادوں پر استوار ہو سکتا ہے جو اپنی روایت اور اقدار پر اعتماد پیدا کریں۔ سید حسین نصر لکھتے ہیں:

> In all these cases, the common error results from the loss of vision of the objective, transcendent and immutable Islamic principles which alone can enable one to judge from an Islamic point of view whether a particular form or activity or period of human society is decadent, deviated or resurgent with the characteristics of a true renaissance. Without the absolute the relative can never be fully understood, and without the immutable one can not gauge the direction of flow of that which change.(۸۰)

حسین نصر تعلیمی عمل کو محض ایک جزوی شعبے کے طور پر نہیں بلکہ اس کلی یقین کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں جس کی موجودگی میں کسی دوسری فکر یا عقیدے اور ازم (Ism) کا سکوپ (Scope) ختم ہو جاتا ہے مگر پاکستان کی حد تک متعارف نظامِ تعلیم میں اسلام اور اس کی روایت کی حیثیت ایسے ہی ہے جیسے ایک وسیع و عریض میخانے کے کسی کونے میں چھوٹی سی مسجد کے لیے جگہ مختص کر دی گئی ہو حالانکہ قوموں کے عروج و زوال کی یہ داستان اور خاص طور پر عصرِ حاضر کے عالمی رجحانات شاہد ہیں کہ نظامِ تعلیم میں کلاس روم کی اہمیت میدانِ جنگ پر فوقیت رکھتی ہے ایٹمی طاقت ہونے کے

باوجود فکری و نظریاتی شناخت سے محروم نسلیں استحکامِ سلطنت کی ضمانت نہیں بن سکتیں لیکن زمینی حقائق بتا رہے ہیں کہ اربابِ اختیار کے نزدیک تعلیم ترجیحات میں نہیں ہے گو کہ تعلیم کے حصول پر پاکستانی شہری کا حق ہے۔ غیر ترقیاتی اخراجات کے لیے اور نمود و نمائش کے لیے تو خزانوں کے منہ کھول دیے جاتے ہیں مگر اہم ترین مقصد تعلیم کے لیے عذر لنگ (Lame excuse) پیش کیے جاتے ہیں اور فی الواقع اس کا حقیقی پس منظر یہ ہے کہ جاگیر دارانہ ذہنیت رکھنے والے حکمرانوں اور آمروں نے تعلیم کے فروغ کو ہمیشہ اپنے لیے اور اپنے اقتدار کے لیے خطرہ تصور کیا ہے اس حقیقت کی گواہی قدرت اللہ شہاب ایوبی دور سے دیتے ہوئے شہاب نامہ میں لکھتے ہیں:

> وہ تعلیم کے سراسر مخالف تو ہرگز نہ تھے لیکن دوٹوک طور پر کھلے دل سے اس کے حق میں بھی نہ تھے ان کے نزدیک تعلیم یافتہ شہری طبقہ ہر معاشرے میں ہر فساد کی اصلی جڑ ہوتا ہے پڑھے لکھے بابو لوگوں پر عموماً اور وکلاء کے طبقے پر خصوصاً وہ اپنے شکوک و شبہات اور طنز و مزاح کا برملا اظہار کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ گنواتے تھے ان کے نزدیک اعلیٰ سطح کی تعلیم کا دائرہ فقط سائنسی، تکنیکی، فنی اور پیشہ ورانہ شعبوں تک محدود ہونا چاہیے ان چند مخصوص شعبوں کے علاوہ وہ کالجوں کی سطح پر اندھا دھند عام تعلیم کے دل سے خلاف تھے غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے تحت الشعور میں یہ خطرہ پیوست تھا کہ جب کبھی عوام کسی حکومت کے خلاف ہلچل مچاتے ہیں تو تعلیم یافتہ لوگ اس قسم کی شورش کو زیادہ منظم، موثر، متحرک اور خطرناک بنانے میں پیش پیش ہوتے ہیں اس حوالے سے وہ طلباء اور وکلاء کے متعلق ہمیشہ شش و پنج، شک و شبہ، بے اطمینانی اور بے یقینی کے احساس میں مبتلا رہتے تھے۔(۸۱)

اگر فیلڈ مارشل ایوب خان کے تعلیم کے معاملے میں مذکورہ طرزِ عمل کا تجزیہ کیا جائے تو یہ صرف ان کا رویہ نہیں ہے کم و بیش مملکتِ پاکستان کے اکثر حکمرانوں کی ذہنیت اور تعلیم کے ساتھ طرزِ عمل کی نوعیت ایسی ہی رہی ہے مگر قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ تعلیمی نظام میں مذہب، اسلامی تہذیب اور اقدار کو ختم کرنے والے ہر حربے اور حکمتِ عملی کو نہ صرف قبول کیا گیا بلکہ پشت پناہی کی گئی تاکہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاشرتی اور تمدنی سطح پر ایک لبرل معاشرہ وجود میں آسکے مگر لبرل ازم ہی کے ضمن میں اس نظام کے جو جزوی مثبت اثرات ہو سکتے تھے مثلاً حریت فکر، احتساب اور آزادیٔ رائے وغیرہ تو اس کا ہمیشہ راستہ روکا گیا اور حکمران اس سے خائف رہے جیسا کہ جاگیردارانہ کلچر کے حامل دنیا کے ہر معاشرے میں ہوا ہے نظام تعلیم کے معاملے میں جو طرزِ عمل درکار تھا اس سے محرومی نوخیز نسلوں کا مقدر ٹھہری یعنی سو فیصد شرح خواندگی کا ہدف حاصل کیا جاتا اور علم ہی معاشرے میں معیار فضیلت و برتری قرار پاتا لیکن اس کے برعکس نظام تعلیم کے ذریعے جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا وہ مطلوب نہ تھا بلکہ نوجوان نسل کے قتل عام کے مترادف تھا جیسا کہ اکبر نے کہا تھا جس کا تذکرہ ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے درج ذیل الفاظ میں کیا ہے:

> Ever since the western type of education has been introduced in Muslim lands..... a development which in most cases followed the dominance of Europeon colonial powers...it has generally been resented as a potent agent of de-Islamization, an effective engine for the destruction of Islamic socio-cultural identity. Apart from the more serious academic writings on the subject, Muslim opposition to western education was also strongly expressed through the medium of belles letters, especially poetry. To take just one instance, we find that the poetry of Akbar Allahabadi, one of the most sensitive Muslim poets of this century, is replete with highly laconic sarcasin and biting criticism expressed in the following conplet in which he likens the introduction of western education to pharaoh's genocide of the newly-born male infant's of Israel.

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا

افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی (۸۲)

پاکستان کی نوجوان نسل دنیا کی دیگر اقوام کی طرح مملکت خداداد کا اصل سرمایہ اور اثاثہ ہے اس سرمایہ کو ضیاع سے بچانا اصل میں نظام تعلیم کو لبرل ازم سے بچانا ہے تاکہ ایک ذمہ دار نسل پاکستان کے روشن مستقبل کی ضامن ہو۔۔۔ گو کہ پاکستان کو ایک عظیم اسلامی سلطنت دینا ہی اصل ہدف نہیں بلکہ پاکستانی قوم نے اپنے نعروں، تحریکوں اور دعوؤں میں تو پوری امت کی نشاۃ ثانیہ کے لیے ہراول دستہ بننے

کا عہد ہمیشہ زندہ رکھا ہے مگر اس خواب کی تکمیل کے لیے نہ تو محض فکری اور نظریاتی تعلیم کافی ہے اور نہ ہی دنیاوی علوم و فنون پر گرفت اور کمال بلکہ سید مودودیؒ کے الفاظ میں ایک بہتر مستقبل کے لیے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ علم کے ہتھیار کو اپنے مقاصد کے ساتھ استعمال میں لایا جائے۔ سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

> اسلامی تحریک جب دنیا میں اٹھی تھی اس وقت مسلمانوں نے دوسری قوموں پر محض سیاسی یا فوجی غلبہ ہی حاصل نہیں کیا تھا بلکہ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مسلمان بھی اس وقت ایسے تھے جو تحقیقات کا کام کرنے میں سب سے پیش پیش تھے، جنہوں نے نہ صرف یہ کہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کیں بلکہ ان معلومات کو اپنے نقطہ نظر، اپنے طرزِ فکر اور اپنے عقیدے کے مطابق مرتب کیا۔(۸۳)

جیسا کہ مسلم مفکرین کے نزدیک تعلیم محض معلومات (Information) نہیں بلکہ حاصل شدہ معلومات کو اپنے طرزِ فکر اور عقیدے کے مطابق ڈھالنا ہے مگر پاکستان میں نہ تو اس ضرورت کا ادراک کیا گیا اور نہ ہی کوئی عملی قدم اٹھایا جا سکا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اپنے دین، تاریخ، روایات اور ثقافت سے نابلد ہے تو دینی جامعات اور مدارس کے تعلیم یافتہ طبعیاتی، حیاتیاتی، معاشرتی اور ٹیکنیکل علوم سے ناآشنا ہیں۔ اس سارے تضاد کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف یہ دونوں طبقے کسی مشترک قدر سے عاری ہیں بلکہ ایک دوسرے کے افکار و خیالات اور نقطۂ نظر کو بھی سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں اس بُعد کی اصل وجہ وہ تہذیبی یلغار ہے جس کا نام لبرل ازم ہے ایک طبقہ لبرل ازم کے ردِّ عمل میں دنیا سے کٹتا چلا گیا اور دوسرا روشن خیالی کے حصول میں ہر حد پھلانگتا چلا گیا۔ اس میدان میں ذریعۂ تعلیم کی بحث بھی بے حد اہم ہے اور تاریخی نوعیت کی حامل بھی۔۔۔ پاکستان کے نظام تعلیم میں ذریعہ تعلیم اردو ہو یا انگریزی یہ ایک سلگتا ہوا موضوع ہے جس کا آغاز تحریکِ علی گڑھ کے برپا ہونے سے ہی ہو گیا تھا اصل میں کوئی بھی زبان محض ایک زبان نہیں ہوتی بلکہ ایک طاقتور کلچر کی نمائندہ ہوتی ہے انگریزی زبان کی بالادستی سے ہم اپنے فکری و نظریاتی تشخص اور شناخت سے ہی محروم نہیں بلکہ نئی نسل کی تخلیقی صلاحیت بھی مردہ ہوتی چلی گئی قومی وحدت کا احساس مفقود اور تعاون کی راہیں مسدود بلکہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس سے بڑھ کر لبرل ازم کے سامنے مزاحمت کمزور ہوتی چلی گئی معروف دانشور ڈاکٹر جمیل جالبی کے پُر مغز تجزیے سے اس قومی المیے کی تشخیص کی جاسکتی ہے۔ڈاکٹر جالبی اپنی کتاب پاکستانی کلچر میں لکھتے ہیں:

> انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ جس کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور بھی ہے سارے معاشرے سے الگ ایک شخصیت رکھتا ہے جس کا تعلق یہاں کے کلچر اور عوام سے بہت دور کا بھی نہیں ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ زبانوں کے مسئلے کو اسی طرح الجھا کر انگریزی زبان کو برقرار رکھے تاکہ اس کا اقتدار بھی اسی طرح باقی رہ سکے اس طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ یہ کہیں گے کہ جب مسئلہ اتنا پیچیدہ ہے تو کیوں نہ انگریزی زبان کو باقی رکھا جائے تاکہ ایک طرف ایک زبان ایسی باقی رہے جو مشترک وسیلۂ اظہار بنی رہے اور دوسری طرف ساری دنیا سے ہمارا پورا تعلق بھی باقی رہے لیکن کیا اپنے معاشرے سے دور ہو کر دنیا سے ہمارا کوئی زندہ، تخلیقی رشتہ باقی رہ سکتا ہے؟ لیکن یہ مسئلہ ہمارے اہلِ سیاست کے ادراک سے شاید ماوراء ہے یا پھر وہ اسے سمجھنا نہیں چاہتے۔ تخلیقی رشتے کے بغیر دنیا سے کسی رشتے کے کوئی معنی نہیں ہیں انگریزی تعلیم نے ہمیں بہت سے علمی و ذہنی فائدے پہنچائے ہیں لیکن ہم نے اس زبان کو اوڑھنا بچھونا بنا کر جس طرح اپنے اوپر سوار کر لیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری حقیقی فکر کا تخلیقی اظہار ذیلی حیثیت اختیار کر کے کمزور ہو گیا ہے اور دوسرے یہ کہ ہمارے لیے "معنی" کی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے سارا زور، ساری قوت و صلاحیت روایتی فکر کے روایتی اظہار پر صرف ہو رہی ہے کسی غیر زبان کو اس طور پر قبول کرنے کے معانی یہ ہیں کہ لفظوں کے ذریعے قومی روح کا اظہار بند ہو گیا ہے یہی وجہ ہے کہ معاشرتی و تہذیبی سطح پر تعلیم یافتہ طبقے اور عوام کے درمیان حقارت کی ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی ہے اس حقارت نے تعلیم یافتہ طبقے کو اس سطح پر لا کھڑا کیا ہے جس سطح پر ۱۹۴۷ء سے پہلے انگریز حکمران کھڑا تھا، جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ کس طرح اپنے اقتدار کی عمر کو بڑھا سکتا ہے جس کے لیے قومی وسائل، قومی روح اور قومی یک جہتی بے معنی

الفاظ تھے ہمارا تعلیم یافتہ، آج اسی ذہنیت کا حامل ہے اور ہمارا تخلیقی رشتہ صرف و محض تقلید کا رشتہ بن گیا ہے قومی زبان کا بنیادی عمل یہی ہے کہ وہ معاشرے کے مختلف طبقوں کے درمیان حقارت کی وسیع خلیج کو پاٹ کر قومیت کے تصور کو ابھارتی ہے ہر طبقے میں قومی زبان کے استعمال کے معنی یہ ہیں کہ تہذیبی روایت اور اس کا شعور رنگا رنگ شکلوں میں اعلیٰ سے ادنیٰ اور ادنیٰ سے اعلیٰ طبقے تک پہنچ رہا ہے اور معاشرے کا ہر طبقہ اپنی روح کا اظہار کر کے قومی روح کو پھیلانے اور بڑھانے کا کام انجام دے رہا ہے یہ کام انگریزی زبان یا کوئی اور غیر زبان ہر گز ہر گز انجام نہیں دے سکتی۔

آزادی کے بعد سے پاکستان میں انگریزی زبان کا رواج مسلسل بڑھ رہا ہے قوم کی ذہانت اور صلاحیتوں کے قطرے انگریزی زبان کے سمندر میں گر کر معدوم ہو رہے ہیں تعلیم یافتہ طبقے کی شخصیت دو نیم ہے انگریزی زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کر کے ہم نے لفظوں کا استعمال تو از بر ضرور کر لیا ہے لیکن ان کے تخلیقی معنی سمجھنے سے معذور ہیں کیا آپ کسی ایسے مصنف کی مثال دے سکتے ہیں جس نے زندگی بھر اس زبان کو اپنی تخلیقی قوتوں کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہو اسے انگریزی زبان و ادب کی تاریخ نے وہ درجہ دیا ہو جو دوسرے درجے کے انگریز مصنفین کو دیا جاتا ہے شاید ایک نام بھی ہم مثال کے طور پر ایسا نہیں لے سکتے۔ کیا غالب اور اقبال کی شاعری کو اہلِ ایران نے اپنی تاریخ میں کوئی مقام دیا ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر شخص اپنے معاشرے کے تعلق سے زندہ ہے اور اسی رشتے سے دوسرے معاشروں میں اس کی وقعت اور اس کا وقار قائم ہے اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ انگریزی زبان کو اس طرح اوڑھنا بچھونا بنا کر ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔(۸۴)

پاکستان میں نظامِ تعلیم کے اثرات و نتائج کا بے لاگ تجزیہ کرنے سے درج ذیل امور واضح ہوتے ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

- پاکستانی معاشرے میں مغربی تہذیب اور لبرل ازم کے فروغ میں نظامِ تعلیم نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔
- اس معاملے میں انگریزی کے بالادست اور ذریعۂ تعلیم ہونے کا عمل دخل سب سے بڑھ کر ہے۔
- نظامِ تعلیم نے نہ صرف طبقاتی کشمکش کو جنم دیا ہے بلکہ ایک ایسا جدید تعلیم یافتہ طبقہ پروان چڑھا ہے جو اپنی اقدار و روایات سے تو ناآشنا اور محروم ہے مگر اپنے قول و عمل میں مغربی افکار و نظریات کو سند اور معیار کا درجہ دیتا ہے حتیٰ کہ اپنی تاریخ سے نابلد ہے اور مغرب کی تاریخ کو مشعلِ راہ سمجھتا ہے۔
- جدید نظامِ تعلیم کی بالادستی نے مذہب کے حوالے سے سیکولر رویے کو تقویت دی ہے اور جدید تعلیمی اداروں نے سیکولرازم سے بھی بڑھ کر لبرل ازم کے لیے ماحول سازگار بنایا ہے جس کی مثال مخلوط تعلیمی ادارے، ان کا نصاب اور ان کی سماجی تقاریب ہیں چنانچہ ایک بے خدا ثقافت نے تعلیمی نظام کے ذریعے ہر شعبۂ زندگی کو متاثر کیا ہے۔
- جدید نظامِ تعلیم نے اخلاقی اوصاف کو پس پشت ڈالا ہے محض حروف شناسی، معلومات اور مہارت و ہنر کو ترجیح دی ہے لہٰذا یہ نظامِ تعلیم انسان کی شخصیت سازی کے اہم کام کو نظرانداز کر کے تعلیم کو ڈگری اور ڈگری کو حصولِ رزق کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور اس طرح مادیت کا لبرل فلسفہ فروغ پاتا ہے۔
- تخلیق سے بڑھ کر تقلید اور جدوجہد کی راہ کو چھوڑ کر جمود اس نظامِ تعلیم کے بنیادی خدوخال ہیں۔

نظامِ تعلیم کے ضمن میں محض جزوی خرابی پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس نے سارے معاشرے کو متاثر کر کے انحطاط اور زوال کے راستہ پر ڈال دیا ہے انفرادی و اجتماعی زندگی میں جذبۂ عمل مفقود ہے اور قومی سطح پر نصف صدی سے اجتماعی ڈپریشن کی فضا ہے۔

حوالہ جات باب سوم

۱۔ خرم مراد، مسائل و افکار، البدر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص: ۴۶، ۴۷

۲۔ جالبی، ڈاکٹر جمیل، پاکستانی کلچر، نیو تجاز پریس، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص: ۱۹۴، ۱۹۵

۳۔ زاہد اسلام، آج کے پاکستان کی ترقی پسند سیاست، مکتبہ فکر و دانش لاہور، ۱۹۹۰ء، ص: ۶۷

۴۔ سی آر اسلم، ایضاً، ص: ۴۴، ۴۵

۵۔ خرم مراد، مسائل و افکار، ص: ۴۹

۶۔ محمد عثمان، پروفیسر، مسعود اشعر، پاکستان کی سیاسی جماعتیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص: ۲۴، ۲۶

۷۔ انتظار حسین، اکیسویں صدی کی جانب، مرتبہ حکیم محمد سعید، ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی، ۱۹۹۳ء، ج ۲، ص: ۳۷

۸۔ جالبی، ڈاکٹر جمیل، پاکستانی کلچر، ص: ۲۰۴

۹۔ اکبر علی، پاکستان جدید دور کے تقاضے، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص: ۳۶۶

۱۰۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، اسلام اور پاکستان، مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص: ۴۱

۱۱۔ اصغر خان، محمد، صدائے ہوش، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص: ۸۵، ۸۶

۱۲۔ ایضاً، ص: ۹۳

۱۳۔ اشفاق احمد، مقالہ اکیسویں صدی کے لیے تیاریاں، کتاب "اکیسویں صدی کی جانب"، مرتبہ حکیم محمد سعید، ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ۱۹۹۳ء، ص: ۲۹

۱۴۔ انصاری، محمد الیاس، وڈیو جنریشن، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص: ۲۰، ۲۱

۱۵۔ صدیقی، ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن، تعلیم و تدریس: مباحث و مسائل، پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص: ۹۸، ۹۹

۱۶۔ محمد سلیم، پروفیسر، سید، آزادیٔ صحافت اور غیر جانبداری، ترجمان القرآن، لاہور، جون ۱۹۸۷ء، ص: ۱۸۷، ۱۸۸

۱۷۔ زمان، شیر محمد، ڈاکٹر، پاکستان میں نفاذِ اسلام کا عمل، ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، مارچ ۲۰۰۱ء، ص: ۵۹، ۶۰

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۸- Shireen Pasha, A historical overview of television in Pakistan, published in The News International, July 4, 2000.

۱۹- Ibid

۲۰ -شاہتاز، ڈاکٹر نور احمد، تاریخ نفاذِ حدود، فضلی سنز اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص: ۳۹۷

۲۱-نوائے وقت ملتان، ۲۲ دسمبر ۱۹۹۹ء بحوالہ ترجمان القرآن، لاہور، مئی ۲۰۰۰ء، ص: ۵۷

۲۲-زمان، شیر محمد، ڈاکٹر، پاکستان میں نفاذِ اسلام کا عمل، ص: ۶۰

۲۳-ماہنامہ تحریکِ اصلاح معاشرہ (اگست ۹۴ء) میں شائع شدہ ڈاکٹر زاہد الحق قریشی کا مضمون بحوالہ الیاس انصاری، وڈیو جنریشن، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص: ۲۷، ۳۲

۲۴-صدیقی، ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن، تعلیم وتدریس، ص: ۱۰۰

۲۵-زمان، ڈاکٹر، شیر محمد، پاکستان میں نفاذ اسلام کا عمل، ص: ۶۰

۲۶-الطاف گوہر، ایوب خان، فوجی راج کے پہلے دس سال، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص: ۸

۲۷-انٹرویو محمد حنیف رامے از رفیق ڈوگر، سیاسی ملاقاتیں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص: ۱۳۹

۲۸-جالبی، ڈاکٹر جمیل، پاکستانی کلچر، ص: ۲۰۰

۲۹- مسعود اشعر، مضمون "ادب سیاست اور رواداری" کتاب "پاکستانی معاشرہ اور عدم رواداری" تالیف حسن عابدی، مشعل، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص: ۶۹، ۷۰

۳۰-صدیقی، نعیم، اشارات، ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، جنوری ۱۹۸۷ء، جلد ۱۰۶، ص: ۲۳۴

۳۱- مسعود اشعر، پاکستانی معاشرہ اور عدم رواداری، ص: ۷۰، ۷۲

۳۲-المجاہد، پروفیسر، شریف، پاکستان میں ناروا داری، ص: ۹۸

۳۳-صدیقی، نعیم، اشارات، ص: ۲۳۴

۳۴-جلال زئی، موسیٰ خان، این جی اوز اور قومی سلامتی کے تقاضے، فیروز سنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص: ۵۰

۳۵-القرآن، ۱۷:۳۶

۳۶-انصاری، محمد الیاس، وڈیو جنریشن، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص: ۴۱، ۴۲

۳۷- شمیم احمد، پروفیسر، "پاکستان ٹیلی ویژن کی بنیاد مذہب دشمنی پر رکھی گئی"، ماہنامہ الفجر، کراچی، ص: ۲۰، ۲۲

۳۸-ام کلثوم، ڈاکٹر، این جی اوز کا حقوقِ نسواں کے حصول میں کردار، این جی اوز اور قومی سلامتی کے تقاضے مصنف موسیٰ خان جلال زئی، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص: ۱۳۲

۳۹-جلال زئی، موسیٰ خان، این جی اوز اور قومی سلامتی کے تقاضے، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص: ۲۸، ۲۹

۴۰- عارف، نجم الحسن، این جی اوز اور بیرونی ممالک سے بھاری فنڈز، کتاب این جی اوز اور قومی سلامتی کے تقاضے، ص: ۷۴، ۷۸

۴۱-قومی اخبارات، عمر اصغر کا بیان، ۱۰ اگست ۲۰۰۰ء

۴۲-ارشد، عبدالرشید، پاکستان میں این جی اوز کا اسلام دشمن کردار اور عمر اصغر خان، ماہنامہ عرفات، جامعہ نعیمیہ، علامہ اقبال روڈ، لاہور، اگست، ستمبر ۲۰۰۰ء، ص: ۶۱

۴۳-ایضاً، ص: ۶۱

۴۴-اسماعیل، عنایت اللہ، اباحی معاشرے کے لیے عالمی کوششیں، ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، مئی ۲۰۰۰ء، ص: ۶۰، ۶۱

۴۵- عبدالمغنی، پروفیسر، خواتین کی طاقت: بیسویں صدی کا فریب، ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، اپریل ۲۰۰۰ء، ص: ۴۹، ۵۰

۴۶-ارشد، عبدالرشید، پاکستان میں این جی اوز کا اسلام دشمن کردار اور عمر اصغر خان، ص: ۶۱

۴۷-صدیقی، عطاء اللہ، پاکستانی این جی اوز کی آئین سے محبت، ماہنامہ محدث، لاہور، ستمبر ۲۰۰۰ء، ص: ۲، ۳

۴۸-عارف، نجم الحسن، این جی اوز اور بیرونی ممالک سے بھاری فنڈز، ص: ۷۹

۴۹-صدیقی، عطاء اللہ، پاکستانی این جی اوز کی آئین سے محبت، ص: ۶

۵۰-القرآن، ۱:۴

۵۱-علوی، ڈاکٹر خالد، اسلام کا معاشرتی نظام، المکتبۃ العلمیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص: ۹۵

۵۲-ایضاً، ص: ۹۲

۵۳-منو سمرتی، ۱۴۵/۵ بحوالہ اسلام کا معاشرتی نظام، ص: ۹۷

۵۴-القرآن، ۱۶:۵۸

۵۵- مسلم، ابوالحسن بن الحجاج النیشاپوری، کتاب البر والصلہ، باب فضل الاحسان البنات، دارالفکر، بیروت، ج ۴، ص: ۳۸، ۳۹

۵۶-ایضاً

۵۷- تبریزی، محمد بن عبداللہ الخطیب، مشکوۃ المصابیح، کتاب العلم، دارالفکر، بیروت، ۱۹۹۱ء، ج ۱، ص: ۱۰۸

۵۸-جلال زئی، موسیٰ خان، این جی اوز اور قومی سلامتی کے تقاضے، ص: ۱۸، ۱۹

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۵۹-اصلاحی، امین، احسن، اسلامی معاشرے میں عورت کا مقام، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۶، ۱۷

۶۰-ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، ۲۷ اپریل ۱۹۴۹ء

۶۱-اصلاحی، امین احسن، اسلامی معاشرے میں عورت کا مقام، ص: ۷۴

۶۲-رخسانہ جبین، ڈاکٹر، بہبود آبادی پروگرام، پس منظر و مضمرات، خواتین میگزین ۴۲ چیمبر لین روڈ کیمرہ مارکیٹ، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص: ۹، ۱۰

۶۳-جلال زئی، موسیٰ خان، این جی اوز اور قومی سلامتی کے تقاضے، ص: ۱۹

۶۴-عمری، جلال الدین، مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ، ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ، ۱۹۸۶ء، ص: ۱۳، ۱۲

۶۵-تبریزی، محمد بن عبداللہ الخطیب، مشکوۃ المصابیح، کتاب النکاح، دارالفکر، بیروت، ۱۹۹۱ء، ج ۲، حدیث نمبر ۳۵۵۲

۶۶-القرآن، ۴:۱۹

۶۷-اسلام کا معاشرتی نظام، ص: ۱۹۳

۶۸- محمد سلیم، پروفیسر، سید، مسلمان اور مغربی تعلیم، ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان اچھرہ لاہور، ۱۹۸۹ء، ص: ۹، ۱۰

۶۹-القرآن، ۹۶:۱

۷۰-القرآن، ۹:۳۹

۷۱-صدیقی، ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن، قومی تعلیم اور اس کے تقاضے، شعبہ قومی تعلیمی امور تنظیم اساتذہ بہاول شیر روڈ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص: ۳

۷۲-قریشی، ڈاکٹر وحید، اسلامی تعلیم (چند نظریاتی مباحث) آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس ملتان روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص: ۵۶

۷۳- محمد سلیم، پروفیسر، سید، مغربی فلسفۂ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ، ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ، پاکستان، ۱۹۸۹ء، ص: ۱۴۰، ۱۴۱

۷۴-مغربی فلسفۂ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ، ص: ۱۸۲، ۱۸۳

۷۵-اسلام کا معاشرتی نظام، ص: ۲۹۲

۷۶-اقبال خان، فلسفۂ تعلیم اور سیاست اور پاکستان کا مستقبل، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص: ۵۱، ۵۲

۷۷- سلیم احمد بحوالہ ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی تعلیم و تدریس، پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۰۸

۷۸-علوی، ڈاکٹر خالد، مغرب کا چیلنج اور ہمارا نظام تعلیم، بحوالہ ماہنامہ افکار معلم بہاول شیر روڈ مزنگ، لاہور، فروری ۱۹۹۴ء، ص: ۲۵، ۲۴

۷۹- نصر، سید حسین، مترجم سید محمد سلیم، انسان اور تہذیب کا مستقبل، بحوالہ ماہنامہ افکار معلم بہاول شیر روڈ مزنگ لاہور، جولائی ۱۹۹۴ء، ص: ۱۱، ۱۲

۸۰- Nasr, Syed Hussein, Islam and the plight of modern man, Suhil Academy Lahore, 1994, P:125

۸۱-شہاب، قدرت اللہ، شہاب نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص: ۸۹۰، ۸۹۰

۸۲-Dr. M. Zafar, Teachers training (The Islamic Perspective), Institute of Policy Studies and International Institute of Islamic Though Islamabad, 1996, P:7

۸۳-مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، تہذیبی کشمکش میں علم و تحقیق کا کردار، ادارہ معارف اسلامی، کراچی، جون ۲۰۰۰ء، ص: ۹، ۱۰

۸۴-جالبی، ڈاکٹر جمیل، پاکستانی کلچر، ص: ۱۹۰، ۱۹۲

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب چہارم

پاکستان کی بقاء — امکانات و مسائل

فصل اول: لبرل جمہوریت اور اسلام

فصل دوم: جمہوری جدوجہد اور اسلامی حکومت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فصل اول

لبرل جمہوریت اور اسلام

قوموں کے افکار اور نظریات کی صحیح تفہیم کے لیے مروجہ اصطلاحات کے صحیح مفہوم کا تعین آسان کام نہیں ہے اس لیے کہ جب ایک قوم کی اصطلاح دوسری قوم اختیار کرتی ہے تو تاریخی پس منظر اور معاشرتی اقدار کے اختلافات کے باعث مفہوم بدل جاتا ہے بعض اوقات زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ کثرت استعمال سے بھی اصطلاحات کے مفہوم اور معانی میں تبدیلی آجاتی ہے جمہوریت کی اصطلاح اگرچہ اس وقت عالمی سطح پر رائج ہے مگر اس اصطلاح کا کوئی ایک مفہوم متعین کرنا مشکل ہے اگر مغربی دنیا میں جمہوریت کی اصطلاح اور نظام فرد کی فلاح کا ضامن سمجھا جارہا ہے تو تیسری دنیا کے ممالک میں استعمار کی نگرانی میں پرورش پانے والی جمہوریتیں انسانی زندگی کے کرب اور دکھ کی ذمہ دار قرار دی جارہی ہیں چنانچہ جب ہم آج کے پاکستان میں جمہوریت کی اصطلاح کا شور سنتے ہیں تو اس اصطلاح کے ساتھ معاشرے کے عام فرد کے قلب و دماغ میں امید اور امنگ پیدا ہونے کی بجائے ناآسودگی اور مایوسی کا احساس غالب آتا ہے پھر جہاں تک پاکستان میں مذہبی، معاشرتی اور سیاسی میدانوں میں آزاد خیالی کی تحریکات اور ان کے اثرات و نتائج کا تعلق ہے تو اس ضمن میں لبرل ازم کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کرنے والے جن محاذوں اور محرکات کا تذکرہ کیا جاچکا ہے وہ جتنے بھی مؤثر کیوں نہ ہوں جمہوریت کی راہ سے فروغ پانے والے لبرل ازم کے مقابلے میں ان کے اثرات و نتائج محدود اور جزوی ہیں جب ہم تاریخ پاکستان کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں تو پاکستانی معاشرے میں جمہوریت سے زیادہ لبرل ازم کے فروغ کا قوی محرک کوئی نہیں ہے۔ یہ بات بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ بیسویں صدی کے سماجی و سیاسی علوم میں جمہوریت کو لبرل جمہوریت (Liberal Democracy) کا نام دیا جاتا رہا ہے کیونکہ جمہوریت اپنی ہر شکل میں عوام کی حاکمیت اور سیکولرازم کی دعویدار ہوتی ہے۔ مولانا گوہر رحمٰن لکھتے ہیں:

> عوام کی حاکمیت اور سیکولرازم کا منطقی نتیجہ بے قید اور مادر پدر آزادی ہی ہو سکتا ہے اور یہ ایک جمہوری حق مانا جاتا ہے اس آزادی کے تحت مغرب کا ایک شخص

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خدا اور رسول کو گالی دے سکتا ہے ماں، بہن اور بیٹی کے ساتھ جنسی تعلق قائم کر سکتا ہے مادر زاد ننگا ہو سکتا ہے اور گلی کوچوں میں بر سر عام جماع کر سکتا ہے لڑکی جب بالغ ہو جائے تو جہاں چاہے رنگ رلیاں منا سکتی ہے۔ والدین اگر اعتراض کریں تو گرفتار ہو کر سزا پائیں گے اس لیے کہ کسی کی نجی زندگی میں دخل دینا قانوناً جرم ہوتا ہے اور جمہوری حقوق کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ ماں باپ اور بڑوں کا احترام کرنا لبرل ازم اور ماڈرن ازم کے خلاف ایک دقیانوسی خیال سمجھا جاتا ہے سیاسی آزادی کے تحت اگر کوئی تحریک چلانی ہو، احتجاج یا مظاہرہ کرنا ہو تو آگ لگانا، سنگ باری کرنا، گھیراؤ کرنا اور ہر قسم کے تخریبی کام کرنا جمہوری حق سمجھا جاتا ہے لبرل ازم بادشاہ یا پوپ کی غلامی ہی سے آزادی کا نام نہیں ہے بلکہ ان کے ساتھ خدا، رسول، مذہب اور اخلاقی قدروں سے بھی آزادی کا نام ہے یہ ہے وہ آزادی جس پر جمہوریت کے علمبردار بڑا ناز کرتے ہیں۔(۱)

یہ ایک بیّن حقیقت ہے کہ لبرل ازم کے لیے جمہوریت سے زیادہ سازگار فضا کسی اور ذریعے سے ہموار نہیں ہوتی گو کہ پاکستانی معاشرہ اپنے جمہوری تجربے اور روایات میں ان انتہاؤں سے کافی حد تک محفوظ ہے جہاں مذہب اور اخلاق ماتم کرتے ہیں اور انسان حیوانیت کی سطح سے بھی گر جاتا ہے مگر بحیثیت قوم جمہوریت سے پچھلے نصف صدی سے زائد عرصے میں پاکستانی معاشرے کو جو واسطہ رہا ہے اس کے نتیجے میں لبرل ازم کے سکوپ میں اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔ جمہوریت دراصل مغربی معاشرے میں پروان چڑھی تو اس کا اپنا مخصوص تاریخی پس منظر ہے یہ محض انسانی حقوق اور آزادی کے تحفظ کے طور پر متعارف نہیں ہوئی بلکہ اس نے مغرب میں مذہب اور اخلاقی اقدار کے ہر نظام کو شکست سے دوچار کر کے اپنی بنیاد لادینیت (Secularism) پر استوار کی مگر آگے چل کر جمہوریت کے تحت جو مغربی معاشرہ تشکیل پایا اس میں سیکولرازم (یعنی انفرادی زندگی میں مذہبی آزادی) کے امکانات کو مسدود کر کے فرد کو خواہش کے معبود کی پرستش کا راستہ دکھایا گیا تو اس کا نام ہی جمہوریت، لبرل جمہوریت اور لبرل ازم قرار پایا۔ مسلمانوں کے ہاں جمہوریت عالمی سطح پر مسلمانوں کے زوال کے بعد آئی لیکن لفظ جمہوریت عربی اور علومِ اسلامیہ میں کثرت سے استعمال ہونے والے لفظ جمہور سے ماخوذ ہے، اٹھارویں صدی میں ترکی میں

جمہوریت کی اصطلاح عربی میں مستعمل لفظ جمہور سے ہی اخذ کی گئی جس کا مطلب آدمیوں کا مجموعہ، مجمع عام یا عام طور پر سارے لوگ ہے۔(۲)

چنانچہ جمہوریت کے اصطلاحی مفہوم میں اس سے مراد ایک ایسا نظام حکومت ہے جو لوگوں کی اکثریت کی مرضی سے (People's will) سے وضع کیا جاتا ہے یعنی لوگوں کی اکثریت خود اپنے بھلے اور برے کا فیصلہ کرے گی اور اس کا دوسرا مطلب یہ لیا گیا کہ اس مرضی سے بالاتر کوئی ہستی اور قانون کا کوئی منبع تسلیم نہ کیا جائے گا، جمہوریت کا یہی تصور جب مغربی استعمار کے ذریعے نوآبادیاتی نظام میں عالمِ اسلام میں متعارف ہوا تو ایک زبردست فکری کشمکش کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجے میں دو نمایاں طبقات سامنے آئے۔

- چونکہ مسلمان اسلام سے کسی بھی دور میں اس طرح بدظن اور بددل نہیں ہوئے جس طرح سترھویں اور اٹھارویں صدی کی عیسائیت نے اپنے پیروکاروں کو کیا چنانچہ جب جمہوریت عالمِ اسلام میں اپنا راستہ بنا رہی تھی تو تجدد پسند طبقے نے جمہوریت کی جڑیں مغرب کے معاشرے سے زیادہ قرآن و سنت میں تلاش کرنے کی منظم کوشش کی اور یہ نتیجہ نکالا کہ اسلام تو سراسر ہے ہی جمہوریت لہٰذا اس طبقے نے اسلامی جمہوریت کی اصطلاح متعارف کروائی۔
- دوسرا طبقہ وہ ہے جو ہر اعتبار سے اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات اور نجات کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور مغربی جمہوریت کو بیّن دلائل سے رد کرتا ہے جبکہ اس کے برعکس پیش کیے جانے والے خلافت یا اسلامی حکومت کے تصور کا کوئی عملی ماڈل موجود نہیں ہے اس لیے جمہوریت کے مخالف اسلام پسندوں کو اپنی فکر سمجھانے کے لیے کافی مشکل پیش آتی ہے۔

پاکستان میں جمہوریت کا تجربہ

پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی یہاں جمہوریت کو ایک نجات دہندہ نظام کے طور پر لانے کی کوشش کی گئی مگر تاریخ پاکستان میں نصف سے زائد عرصہ تک جمہوریت کی ناکامی کا ثبوت فوجی آمریتیں ہیں جس سے ملک کے اندر اور باہر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ پاکستانی سیاست میں قوت کا اصل سرچشمہ عوام نہیں، فوج ہے۔ ایسا کیوں ہوا ہے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ من حیث القوم جمہوریت کو پاکستان میں قبول نہیں کیا گیا یہی وجہ ہے کہ ایک طبقہ اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے جب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلام سے زیادہ جمہوریت کو سازگار اور معاون پاتا ہے تو پھر اسلام میں جمہوریت بلکہ اسلام کو جمہوری ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اس دعوے کی صداقت کے لیے بانیٔ پاکستان محمد علی جناح کے اقوال اور نظریات کو بنیاد بنایا جاتا ہے مثلاً اسلامی جمہوریت کے تعارف میں مولانا رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں۔

> لیکن اسلام کیا ہے؟ اس کی تعلیم کیا ہے؟ اس کی روایات کیا ہیں؟ اس کی تاریخ کیا ہے؟ اسکے قائم کیے ہوئے اقدار کیا ہیں؟ ان چیزوں پر ابھی تک انہوں نے پورے طور پر غور نہیں کیا تھا چنانچہ ان کی ابتدائی تقریروں میں ابہام زیادہ ہے اور تشریح کم۔ وہ نعرے کے طور پر، سیاسی اسٹنٹ کے طور پر اس لفظ کو استعمال کرنا نہیں چاہتے تھے رفتہ رفتہ جب اسلام سے متعلق ان کی معلومات وسیع ہوئیں اور وہ اس کی تاریخ اور روایات سے آشنا ہو گئے تو انہوں نے صاف، واضح اور غیر مشتبہ الفاظ میں اعلان کیا کہ پاکستان میں جو جمہوریت نافذ ہو گی وہ خالص اسلامی ہو گی یہ ایک ایسا اعلان تھا جس کی جرأت عالم اسلام میں سے کسی ملک نے اب تک نہیں کی تھی کئی اسلامی ممالک میں جمہوریت تو رائج تھی لیکن "اسلامی جمہوریت" تو کہیں بھی نافذ نہیں۔(۳)

قائدِ اعظم نے جس خالص اور اسلامی جمہوریت کا وعدہ کیا تھا اس کے اثرات و نتائج کا تفصیلی جائزہ باب دوم میں لیا جا چکا ہے۔ معروف دانشور اور صحافی ارشاد احمد حقانی پاکستان میں جمہوریت کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں بلکہ اس کے حق میں لکھنے میں معروف ہیں وہ گزشتہ برسوں کی جمہوریت کے تجربے پر درج ذیل تبصرہ کرتے ہیں:

> بد قسمتی سے پاکستان میں اسلام کا نام تو بہت لیا گیا اسے سیاسی مقاصد کے لیے بھی بہت سے حکمرانوں نے استعمال کیا ہے لیکن اسلام کی اقتصادی اور سماجی اور سیاسی تعلیمات کو ایک زندہ حقیقت بتانے کے لیے کوئی قابلِ ذکر کاوش دیکھنے میں نہیں آئی۔(۴)

جناب حقانی صاحب کے جمہوریت بلکہ اسلامی جمہوریت کے حامی ہونے کے باوجود جمہوری تجربے کی ناکامی اب نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جمہوریت کے

حامیوں کا یہ استدلال درست ہو کہ پاکستان میں جمہوریت کو فروغ پانے کا موقع ہی نہیں ملا البتہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ پاکستانی معاشرے کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں لبرل ازم نے جمہوریت کے راستے اپنے قدم آگے بڑھائے ہیں حتیٰ کہ ٹھیٹھ اسلامی تہذیب و اقدار کی علمبردار جماعتیں بھی اس کی زد میں آگئی ہیں ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری رقمطراز ہیں:

> پاکستان میں وہ حالات نہ آج ہیں نہ پہلے کبھی تھے جو اسلامی جماعتوں کی جمہوری فتح کے لیے ضروری ہیں پاکستانی سیاست ہمیشہ سے غرض کی سیاست رہی ہے اس میں غرض ہی کی بنیاد پر سیاسی گروہ بندی عمل میں آتی ہے اور غرض کے بندے ہی انتخابی عمل میں شریک ہوتے ہیں پاکستانی عوام کی روحانی اور اخلاقی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی ہے ان حالات میں ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے ذاتی اغراض کو پسِ پشت ڈال کر اسلامی حمیت اور عصبیت کی بنیاد پر جمہوری عمل میں حصہ لے کر اسلامی نمائندہ منتخب کریں گے (جیسے کہ الجزائر کے عوام نے کیا تھا) نہایت غیر حقیقت پسندانہ ہے تحریکاتِ اسلامی پاکستان ان مراحل سے کبھی نہیں گزریں جن سے گزر کر الجیریا کی تحریک نے عوام کو اس قابل بنایا تھا کہ وہ ذاتی مفاد پر اسلامی تقاضوں کو فوقیت دیں۔

پاکستان کی تمام اسلامی تحریکات نے اس حقیقت سے بھی سہوِ نظر کیا ہے کہ عوام کی اخلاقی اور روحانی حالت غلبۂ دین کی جدوجہد کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے جمہوری اور دستوری عمل کی تصدیق کر کے اسلامی جماعتیں عوام کی اخلاقی گراوٹ کا جواز پیش کرتی ہیں وہ عوام کو اسلامی معیارات پر نہیں پرکھتیں بلکہ ان معیارات کو پست کرتی چلی جاتی ہیں اور نفاذِ اسلام کو خواہشاتِ نفسانی کے حصول کے ذریعہ کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ انتخابی عمل میں شمولیت کے نتیجہ میں عوام میں قربانی دینے کا جذبہ نہیں ابھرتا بلکہ عوام اسلامی جماعتوں کو بھی انہی پیمانوں پر پرکھنے لگتے ہیں جن کی بنیاد پر وہ سیکولر جماعتوں کو پرکھتے ہیں۔ اسلامی جماعتوں کا دینی اور اخلاقی تشخص مجروح ہوتا ہے اور ان کا سیاسی پروگرام اس دعوے پر مرکوز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو جاتا ہے کہ وہ جمہوری اور سرمایہ دارانہ عمل کو شفاف اور غیر کرپٹ بنا دیں گی سرمایہ داری اور جمہوریت کرپشن ہی کا دوسرا نام ہے غیر کرپٹ جمہوریت اور غیر کرپٹ سرمایہ داری نہ کبھی دنیا میں موجود رہی ہے نہ اس کا وجود ممکن ہے لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ عوام اسلامی جماعتوں کے انتخابی منشور کو رد کر دیتے ہیں۔(۵)

جمہوری راستہ اختیار کرنے سے عام سیاسی جماعتوں کے ساتھ مذہبی سیاسی جماعتوں کو بھی جمہوری عمل میں بعض لبرل رویے اختیار کرنے پڑتے ہیں اگرچہ وہ ان لبرل رویوں کو اسلامائز کرنے کی کوشش میں لگے رہنے کے باعث داخلی طور پر کشمکش اور تضادات میں مبتلا رہتے ہیں مثلاً جماعتِ اسلامی پاکستان آج تک صدر ایوب کے خلاف انتخابی جدوجہد میں محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت پر ہدف تنقید بنتی ہے اسی طرح دیوبند کے راہنما مولانا حسین احمد مدنیؒ کانگرس کے حمایتی رہے جس میں عورتیں سرگرم اور نمایاں تھیں پھر اسی تسلسل میں مولانا فضل الرحمٰن نے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۸ء تک بے نظیر بھٹو کے ساتھ ایم آر ڈی کے پلیٹ فارم پر جمہوری جدوجہد میں حصہ لیا۔ ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں مولانا فضل الرحمٰن نے کھل کر بے نظیر بھٹو کا ساتھ دیا اور وزارت میں بھی حصہ دار بنے۔(۶)

پاکستان عوامی تحریک کے بانی اور سربراہ ڈاکٹر طاہر القادری سب سے بڑے مذہبی مسلک اور گروہ بریلوی مکتب فکر کی زبردست تائید اور حمایت سے میدانِ سیاست میں سرگرم ہیں دوسری طرف ان کی علمی تحریک کا نام تحریک "منہاج القرآن" ہے مگر یہ لبرل جمہوریت کا کمال ہے کہ وہ جمہوری اہداف کے حصول کے لیے شوبز اور میڈیا کے لبرل ترین افراد کو اپنی تحریک میں نمایاں مقام دیتے ہیں اسی سلسلے میں قومی اخبارات میں ان کے حوالے سے شائع ہونے والی درج ذیل خبر لبرل جمہوریت کے اثرات کی گواہ ہے۔

پاکستان عوامی تحریک کے وائس چیئرمین محمود بخاری نیشنل لٹریسی موومنٹ کے تحت لاہور پریس کلب میں ہونے والے مذاکرے میں شریک ہوئے جہاں پاکستان عوامی تحریک کے چیئرمین پر شدید تنقید کی گئی خاتون مقرر تسنیم پیرزادہ نے عوامی تحریک کے وائس چیئرمین محمود بخاری سے پوچھا آپ بتائیں

طاہر القادری مولانا ہیں یا ڈاکٹر؟ انہوں نے قیمتی جیپ کہاں سے حاصل کی؟ وہ اپنے کالجوں میں کتنے پیسے تعلیم کے نام پر کما رہے ہیں؟ خواتین کے حقوق کے بارے میں ان کا کیا نظریہ ہے؟ محمود بخاری نے جواب دیا طاہر القادری مولانا نہیں ڈاکٹر ہیں وہ بطورِ چانسلر منہاج یونیورسٹی کی جیپ استعمال کرتے ہیں اور خواتین کے بارے میں عوامی تحریک کا نقطۂ نظر ہے کہ ہم اقتدار میں آکر ماسوائے ہاسٹلوں میں رہائش کے ہر جگہ مخلوط نظامِ تعلیم قائم کر دیں گے طاہر القادری لبرل انسان ہیں۔(۷)

جمہوریت جو مذہب سے بغاوت کے نتیجے میں وجود میں آئی اور دین سے بیزاری جمہوری اقدار کی بنیاد ہے مگر قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ۱۹۴۹ء میں علماء کی جدوجہد سے آئینی طور پر قراردادِ مقاصد کی منظوری گو کہ خوشگوار فیصلہ تھا لیکن اس نے مذہبی جماعتوں کو جمہوریت کے بارے میں پرامید کر دیا اس قرارداد کی منظوری میں اسمبلی کے اندر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور اسمبلی سے باہر عوامی سطح پر مولانا مودودیؒ نے نمایاں کردار ادا کیا چنانچہ اس کے بعد مولانا مودودیؒ نے اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جمہوری جدوجہد کو اپنایا جس کے باعث جماعت اسلامی میں شامل چند نامور علماء نے مولانا مودودیؒ سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی راہ الگ کر لی مگر مولانا مودودیؒ عمر بھر جمہوری جدوجہد کے حامی رہے۔

Following the creation of Pakistan, Mawdudi forced the party, at the cost of dissensions and defections, to accept the legitimacy of the state. As pragmatic political considerations began to replace revolutionary idealism, the Jammat began to look like a controlled and responsible party, aiming to form a government and rule the country, In 1957, when he outlined the Jammats, new policy, Mawdudi drove the last nail into the coffin of revolution by declaring that "transforming the political system can be done only through Constitutional means elections ..... transformation of the political order through unconstitutional means is forbidden by the shariah.(۸)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قراردادِ مقاصد کی منظوری کے بعد جمہوریت کے بارے میں جو خوش فہمی پیدا ہوئی اس کی وجہ عوام کے فہمِ دین اور اسلامی شعور کی بجائے تحریکِ پاکستان کی جذباتی فضا تھی لہٰذا یہ سمجھ لیا گیا کہ عوام کی اکثریت نہ صرف اسلامی نظامِ حیات کا فہم رکھتی ہے بلکہ روحانی و اخلاقی اعتبار سے اسلامی حکومت کے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے تیار بھی ہے جس کا ثبوت قراردادِ مقاصد ہے جس کے نتیجے میں بقول مولانا مودودیؒ "ریاست نے آئینی طور پر کلمہ پڑھ لیا ہے چنانچہ مغربی طرزِ انتخاب کو اسلامی حکومت کے قیام کے لیے اپنا لیا گیا مگر بدقسمتی سے ہر مرحلہ اس حوالے سے نقش بر آب ثابت ہوا اور اسلامی انقلاب کے لیے اٹھنے والی ہر آواز پاکستانی معاشرے کی جمہوری تاریخ میں صدا بصحرا ثابت ہوئی حتیٰ کہ بعض علماء اور دینی راہنماؤں کے ذہن بھی ان سانچوں میں ڈھل گئے جو مغربی طرزِ جمہوریت اور انتخابات کا لازمی نتیجہ ہے جس کی مثالیں ایوب کے مقابلے میں فاطمہ جناح کی حمایت، مولانا فضل الرحمٰن کا بے نظیر بھٹو کے ساتھ تعاون اور سب سے بڑھ کر طاہر القادری کا لبرل ہونے پر فخر کرنا ہیں۔

امت مسلمہ بالعموم اور پاکستان کے اسلام پسند سیاستدان اور دانشور بالخصوص مغربی افکار کی واقفیت نہ ہونے کے باعث ایک نظریاتی بحران کا شکار ہیں اپنی جداگانہ اور منفرد تہذیب چھوڑ کر مغرب کے نظری معیارات پر اعتماد جدیدیت اور لبرل ازم کا وہ رویہ ہے جو شاید مغرب کی تہذیبی یلغار سے بھی زیادہ نقصان دہ ہے اسی رویے کے باعث روشن خیالی، معیارِ زندگی اور مساواتِ مرد و زن اور وسیع المشربی کی اقدار کو محبوب و مطلوب ٹھہرایا گیا ہے اور مزید ستم یہ ہے کہ ان مغربی اقدار کو اسلامی قالب میں پیش کرنے کے لیے بعض تحریکیں بھی سرگرم عمل ہیں ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری لکھتے ہیں:

> جمہوریت سے برأت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک استعمار سے ڈائیلاگ کی پالیسی کلیتاً ترک نہ کر دیں اس ملک میں ہم نے ہی اہلِ دین کو امریکی استعمار کے خلاف صف آراء کیا ہے اس سے بڑی ستم ظریفی کیا ہو گی کہ آج ہم ایک معتدل اور موڈرنسٹ اسلام کی بات شروع کر دیں۔(۹)

ڈاکٹر انصاری نے مغربی فکر اور بطورِ خاص مغربی جمہوریت کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے۔ موصوف مزید واضح کرتے ہیں:

> جمہوری ریاستی اور معاشرتی عمل خود غرضی اور نفس پرستی کو فروغ دیتا ہے اور فطری اسلامی قلبی کیفیات کو مسخ کر دیتا ہے مغرب کی دو سو سالہ تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ جمہوریت کا فروغ اخلاقی اور روحانی تنزل کا دوسرا نام ہے ایک جمہوری معاشرہ میں اہلِ تقویٰ ذلیل اور بے بس ہو جاتے ہیں اور اقتدار حریص، حاسد، سفاک اور ملحد دنیاداروں کے ہاتھ میں مرتکز ہو جاتا ہے۔(۱۰)

پاکستانی معاشرے میں جمہوری عمل کا دیانتدارانہ اور حقیقت پسندانہ مطالعہ و تجزیہ کرنے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ہمارے ہاں جمہوریت نے مادیت اور لادینیت کو مستحکم کیا ہے مال کی محبت اور خواہش کی پیروی دورِ حاضر کا فتنہ نمبر ایک ہے جس کے باعث عبادات، معاملات، روابط اور معاشرتی اقدار سب متاثر ہوئے ہیں بظاہر تو یہ لگتا ہے کہ جمہوریت اقتدار کے عمل اور حکومت کے قیام میں عوام کی شرکت کا ذریعہ ہے اس میں کیا سچائی ہے اس کا تجزیہ کیا جا چکا ہے لیکن اس سے بڑھ کر قابلِ غور اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ یہ عوام کی نفسیات، مزاج اور فکر کو متاثر کرنے والا مکمل طرزِ زندگی ہے جو خدا کے بندوں کے حقوق کے نام پر حرص و ہوس اور طمع و خواہش کا بندہ بناتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر انیس احمد کا خیال ہے:

> دوسری جانب گزشتہ دو سو سال کے عرصہ میں مسلم آبادیوں پر مغربی استعمار، ثقافتی یلغار اور مسلم آبادیوں کے فکری جمود کے نتیجہ میں مغرب کے لادینی تعلیمی نظریات اور طبقاتی نظام کے زیرِ اثر ذہنی طور پر محکوم ایک ایسی پوری نسل وجود میں آگئی جس نے مغربی اقدارِ حیات، معیارِ حق و باطل، ثقافتی رجحانات اور علمی روایت کو صحیفہ آسمانی سمجھتے ہوئے اپنے قلب و نظر کا حصہ بنا لیا اور مغربی تعبیرِ تاریخ کی روشنی میں اسلام کو بھی ساتویں صدی میں منظرِ عام پر آنے والا ایک "مذہب"، تصور کرتے ہوئے معاشرتی، سیاسی اور معاشی و قانونی معاملات کے حوالے سے یہ سوال اٹھایا وہ رسوم و رواج جو ماضی میں ایک "بدویانہ" ثقافت کی پیداوار تھے آج کیوں اختیار کیے جائیں۔(۱۱)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کا معاشرہ اپنی ایک جداگانہ تہذیب اور ثقافت کا آئینہ دار ہوتا ہے تاریخ اسلام میں ایک طویل عرصے تک جب مسلمانوں کے ہاں بادشاہت (جس کو جمہوریت پسند آمریت کا نام بھی دیتے ہیں اور مغرب کے سامنے شرمندہ بھی ہوتے ہیں) کا نظام رائج تھا تو معاشرتی زندگی میں عدل وانصاف، ایثار وقربانی، مساوات، حریتِ فکر، اتحاد ویگانگت، امن اور بھائی چارے کے خدوخال صدیوں تک نمایاں رہے چنانچہ جب قیام پاکستان کا عظیم واقعہ رونما ہوا تو مسلمانانِ پاکستان ایک ایسے ہی معاشرے کی تعمیر اور تشکیل کے آرزومند تھے مگر نصف صدی سے زائد کے سفر میں بقول شاعر:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

جمہوریت کو اپنے خوابوں کی تعبیر کا ذریعہ قرار دے کر پاکستان مسلسل اپنی حقیقی منزل سے دور ہوتا چلا گیا جب کہ اقتدار کی ہوس نے یوں رنگ جمایا کہ مکروفریب، بددیانتی اور جھوٹ شاہراہِ جمہوریت کے سنگِ میل ٹھہرے۔ ریاستی قوت کو استعمال کر کے ایسی حلقہ بندی کروائی جاتی ہے جس سے اپنی پارٹی کا اقتدار ہی یقینی ہو اور حریف کے ووٹوں کا تناسب کم ہو جائے۔ اس کے بعد آزادئ رائے کے جمہوری ماحول میں ایسی حریفانہ فضا پروان چڑھتی ہے جب ایک فریق کو اپنی آنکھ کا شہتیر بھی نظر نہیں آتا اور فریق ثانی کی آنکھ کے تنکے کو بھی شہتیر بنا کر پیش کیا جاتا ہے خود کو فرشتہ ثابت کیا جاتا ہے جو کہ اسلام کے اصولِ تربیت کے سراسر منافی ہے جبکہ حریف کی تذلیل کرنے کے لیے اسکی خامیوں کی تشہیر کی جاتی ہے اسے غدار اور ملک دشمن ثابت کیا جاتا ہے حتی کہ فلاں مردہ باد اور فلاں کتا ہائے ہائے کے نعرے زور پکڑتے ہیں اب چونکہ جمہوریت ایک لبرل نظام ہے اس لیے اس غیر اخلاقی طرزِ عمل پر کوئی قانونی گرفت "آزادی" کے اس تصور کے منافی ہے جس کی ضمانت مغرب نے مہیا کی ہے۔ اس طرح جمہوریت سیاسی دھڑے بندی کا ذریعہ ہی نہیں بنتی بلکہ معاشرے میں عداوت اور نفرت کی راہ ہموار کرتی ہے اتحادِ ملی کے امکانات مسدود ہو جاتے ہیں۔ مخصوص اور مطلوب نتائج کے حصول کے لیے جرائم پیشہ افراد کی خدمات لی جاتی ہیں اور پھر بعض اوقات یہی جرائم پیشہ افراد پارٹیوں میں پناہ لیتے ہیں اور بعض اوقات پارٹی سیاست پر حاوی ہو کر قیادت کو بھی یرغمال بنا لیتے ہیں۔ حزبِ اقتدار اور اختلاف دونوں ہی ہر سطح پر ووٹ خریدتے ہیں اسمبلی میں قومی سطح کی قیادت کے انتخاب کے لیے ووٹروں کے منتخب

نمائندوں کو نسلروں اور صوبائی و قومی ممبران تک کو لالچ اور خوف میں مبتلا کر کے حتی کہ اغوا کر کے اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے کی کوشش ہر جمہوری دور کی تلخ مگر ٹھوس حقیقت ہے پھر اس کے بعد اگر کوئی جمہوری حکومت قانون سازی کرتی بھی ہے تو پارٹی مفادات کے تابع ہو کر نیز یہ قانون سازی ناپائیدار اور عارضی ہوتی ہے کیونکہ اگلی حکومت پرانے قانون کو منسوخ کرتی ہے اور اپنے مخصوص مفادات کی تکمیل کے لیے قانون بناتی ہے اس لبرل جمہوری فضا نے مادیت کے ہتھیار استعمال کرتے ہوئے بدتر غلامی کو رواج دیا ہے جس کی مثال پاکستانی صحافت ہے جس کی تفصیل گزشتہ باب میں لبرل ازم اور ذرائع ابلاغ کے تحت آچکی ہے صحافت دل ودماغ اور ضمیر کی آواز کی بجائے سیاست کے میدان میں زرخرید غلامی کی گھناؤنی شکل اختیار کرتی ہے صحافی اپنے مخصوص جمہوری آقاؤں کی زبان بولتے ہیں۔ جمہوری حکومتیں صحافیوں کو بے پناہ مراعات دے کر اپنے حق میں پروپیگنڈہ کرواتی ہیں جو صحافی مراعات اور حکومتی نظرِ عنایت سے محروم رہ جاتے ہیں ان کو حزبِ اختلاف اپنے جمہوری مقاصد کے لیے نوازتے ہیں۔ جمہوریت جن سیاستدانوں کو اقتدار تک پہنچا دیتی ہے وہ عالمِ اسلام، امتِ مسلمہ اور قومی ترقی اور اتحاد کا درس دیتے ہیں جبکہ اقتدار سے محروم رہ جانے والے اپنی سیاسی دکان چمکانے کے لیے فرقہ ورانہ لسانی، مذہبی اور علاقائی تعصبات کو اپنے سیاسی کاروبار کا ذریعہ بنا لیتے ہیں لہٰذا جمہوریت کے علمبردار عوام کو کوئی اعلیٰ نصب العین اور ہدف دینے کی بجائے ایسے سلگتے مسائل کا منفی شعور عطا کرتے ہیں جس سے ان کی زندگی میں سکون، اطمینان اور توکل وقناعت کی جگہ بے چینی اور انتشار پیدا ہوتے ہیں پاکستان کے جمہوری تجربے کی مذکورہ بالا صورتحال کی گواہی کے لیے تاریخ پاکستان کا ہر جمہوری دور گواہ اور شاہد ہے ایک طرف تو جمہوریت ایسی بدتر صورتحال پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف اگر جمہوری استحکام آنے لگتا ہے تو پس پردہ سرگرم عمل مقتدر طبقات عدمِ استحکام کی پالیسی پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں اور اب تو اس حقیقت کو بے شعور عوام بھی تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستانی جمہوریت میں قوت کا اصل سرچشمہ سول اور فوجی بیوروکریسی ہے پاکستان کے اعلیٰ منصب سے ریٹائر ہونے والے بیوروکریٹ قدرت اللہ شہاب بیوروکریسی کی جمہوری تصویر پیش کرتے ہیں:

بیوروکریسی کا نشہ ایسا نہیں جسے تُرشی اتار دے خاص طور پر جس بیوروکریٹ پر وی آئی پی کے تین حرف پڑ جائیں وہ دھوبی کے کتے کی طرح نہ گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا۔ یہ تین حرف صرف سول بیوروکریسی کی ذات ہی نہیں بگاڑتے بلکہ مسلح افواج ،عدلیہ اور سیاسی بیوروکریسیوں پر بھی یکساں اثرانداز ہوتے ہیں جس شخص کا قدم ایک بار وی آئی پی کی شاہراہ پر پڑ گیا بعد میں وہ کسی عام راہ گزر پر گامزن ہونے سے ناکارہ ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر ہوائی اڈوں کے وی آئی پی لاؤنج (Lounge) دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ کوڑھیوں کے لیے ایک الگ احاطہ قائم کیا گیا ہے جس میں وہ باقی مخلوق کی نظروں سے پوشیدہ رکھے جا سکیں سربراہانِ مملکت اور غیر ملکی اکابرین کے لیے وی آئی پی لاؤنج استعمال کرنا تو واجب اور مناسب ہے لیکن اپنے وطن کے وزیروں، سفیروں اور اعلیٰ افسروں کو اپنے ہی ہم وطن عوام سے کاٹ کر چھوت چھات کے مریضوں کی طرح خصوصی لاؤنج میں محبوس کرنا باعثِ شرم ہے اگر یہ حضرات بھی عام لاؤنجوں سے گزریں تو لازم نہیں کہ عوام الناس کے دوش بدوش چل کر ان کی ناک کٹ جائے گی البتہ وی آئی پی کا لبادہ اوڑھ کر ان کے دماغ کا ٹیڑھا ہو جانا زیادہ قرینِ قیاس ہے وی آئی پی کو برہمن اور عوام کو شودر کا درجہ دینا اسلامی اخوت اور مساوات کے تقاضوں کی تذلیل کے مترادف ہے۔(۱۲)

سول اور فوجی بیوروکریسی پاکستان میں جمہوری ارتقاء کے بارے میں اپنی ترجیحات متعین کرتی ہیں اور ہر دور میں پسِ پردہ یا منظرِ عام پر کلیدی کردار ادا کرتی ہیں کرسٹینا لیمب (Christina Lamb) ضیاء دور میں دونوں طرح کی نوکر شاہی کے کردار اور گٹھ جوڑ کے بارے میں لکھتی ہیں:

> Zia and the bureaucracy developed a good understanding. His only real interference in the working of their empire can be seen by going into any government department around 1p.m coming out of the lift at this time, one has to be careful not to trip over the rows of prostrate civil servants on straw mats. Zia declared that they must all pray in a certain way, as well as ordering them to wear shalwar kamiz instead of western dress. Ross Masood, a senior bureaucrat, explained to me: Civil servants like military rule because, the two

> organizations have a lot in common. The army are military bureaucrats but they don't know the system so need us to guide them.
> The bureaucracy was less sure of political government. Before the elections a friend from the Development Finance Institute, which with large grants at its disposal was much sought after admitted, we are very worried that when the politicians move in they will have constant favours to grant to keep in with their constituents. Zia never had any constituents to worry about so we could get on as we liked. One senior civil servant confessed, we hold politicians in utter contempt. We get round them by playing an elaborate version of "Yes Minister" we call "But then back it up with 150 buts. "But minister the rules do not permit this". Or "Have you considered the implications of regulations 1241?" etc, etc. It is by the number of buts that one can tell who is gaining the upper hand. If the civil servants could not have military rule then they favoured weak government. Ross Masood explained, "Inexperienced politicians do not know how things are done, so are at our mercy."(۱۳)

کہنے کی حد تک پاکستانی سیاست نے جمہوریت کے کئی دور دیکھے ہیں مگر نصف سے زائد عرصے تک فوجی بیوروکریسی اور اس کے چالاک مددگار اور معاون کے طور پر سول بیوروکریسی ہی اختیار اور قوت کا اصل مرکز ہے۔ ایسے درجنوں واقعات کی مثال پاکستانی سیاست سے دی جا سکتی ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی نے قوت کے اصل مرکز سے تصادم کی راہ اختیار کی تو اس کے اقتدار کے ساتھ ہی جمہوریت کی بساط لپیٹ دی گئی لیکن یہ ناانصافی کا رویہ ہے کہ محض بیوروکریسی کو ہی مطعون قرار دیا جائے۔ حقیقت میں جمہوری سیاست کا ہر کوچہ اور ہر کونہ ہی تضادات کا آئینہ دار ہے کرسٹینا مزید لکھتی ہیں:

> The problem is that no consensus has been reached on what it means to have a country based on Islam. Too much stress on religion as a common bond provokes the unsolved argument as to whether Pakistan should be a theocracy where Islam is used

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

by government to dictate all important social and individual behaviours, and where the bench mark for every thing from education to law to the media is whether it is Islamic, or whether Islam should be kept separate from the working of government, simply providing a broad set of guidelines for policy makers to refer to. Zia and Benazir Bhutto are the extremes of these views, with Bhutto favouring secular government but forced by fear of the religious lobby to pander to their wishes, From their crushing defeats in Pakistan's few elections it is clear that the religious parties' ideal is not shared by the majority of Pakistanis, but religion has been a powerful tool for undoing governments. Starting in 1953, with riots against the Ahmadi sectnecessiating martial law in Lahore, time and again religious slogans have been used to destabilize those in power.

Islam is a very different thing in the opulent air conditioned houses where politicians argue points over whisky and soda in cut crystal glasses from what is in rural villages, where the mullah is often a man to be feared, his battery powered mega phone the closest thing to modernization.(۱۴)

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

جمہوری جدوجہد اور اسلامی حکومت

لبرل جمہوریت کے تصور نے ریاست، حکومت اور اقتدار کا مفہوم ہی بدل کر رکھ دیا ہے اسلام میں ان سے خدمت اور عبادت کا تصور وابستہ کیا گیا ہے اقتدار کے حصول کے لیے کوشش ناپسندیدہ ہے اور ہمارے اسلاف اقتدار اور حکومت کو ایک گرانقدر اور عظیم ذمہ داری تصور کرتے تھے جس کے ساتھ کمر توڑ دینے والا احساسِ جوابدہی وابستہ ہے جس کی درخشاں مثالوں سے اسلامی تاریخ بھری پڑی ہے خاص طور پر حضرت عمرؓ بن خطاب اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ادوار۔۔۔۔ مگر یہ مغربی جمہوریت کے اپنانے کا نتیجہ ہے کہ سیکولر جماعتوں کے علاوہ دینی جماعتوں میں بھی ترجیح اول اقتدار کا حصول ہے اور اس کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کیے جاتے ہیں اگرچہ اقتدار کے حصول کی جدوجہد میں کہا تو یہی جاتا ہے کہ کلمۂ حق کے نفاذ اور سربلندی کے لیے اقتدار ناگزیر ہے مگر اس جمہوری فضا میں عوام کو یہ باور کرانا کہ ہم اقتدار اپنے لیے نہیں اسلام کے لیے طلب کرتے ہیں نیز جمہوری جدوجہد میں اسلام اور غیر اسلام کے فرق کو قائم رکھنا تقریباً ناممکن ہے اس لیے ایک طرف وہ قوتیں ہیں جو عوامی مسائل کے حل اور حقوق کی بحالی کا وعدہ کرتی ہیں اور اسلام کا نفاذ ان کی ترجیحات اور نعروں میں شامل نہیں ہے تو دوسری طرف وہ جماعتیں ہیں جو اسلامی حکومت اور انقلاب کی دعویدار ہیں نیز اسلام کے نفاذ کو تمام مسائل کا حل قرار دیتی ہیں مگر جمہوریت کے اس سفر میں دینی سیاسی جماعتوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اسلام کو اپنے اقتدار کے حصول کے لیے نعرے کے طور پر استعمال کر رہی ہیں اور اصل ہدف اسلام نہیں اسلام آباد ہے لہٰذا اسلام پسندوں کے فکری و نظری طور پر بہتر اور عملی طور پر صالح ہونے کے باوجود عوامی سطح پر ان کے بارے میں بداعتمادی کی فضا عام ہے جماعتِ اسلامی پاکستان جسے بلاشبہ ایک منظم اور انقلابی تحریک سمجھا جاتا ہے اور پاکستانی جمہوریت و سیاست میں جس نے ایک فعال کردار ادا کیا ہے دیگر اکثر جماعتوں سے زیادہ سرگرم ہونے کے باوجود انتخابی سیاست میں بے وزن رہتی ہے جماعتِ اسلامی پاکستان کے سابق امیر قاضی حسین احمد اپنے جمہوری اور سیاسی تصورات اور خوابوں کا اظہار کرتے ہیں جو بلاشبہ بڑا حقیقت پسندانہ ہے تاہم سابقہ جمہوری تجربے کی بنیاد پر اس کا امکان کم ہے کہ جمہوری معیارات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو اختیار کر کے اسباب کی دنیا میں جماعتِ اسلامی پاکستانی معاشرے کی عظیم اکثریت کو اپنا ہمنوا بنا سکے قاضی صاحب لکھتے ہیں:

> آج لوگوں کے لیے اقتدار پر کشش چیز ہے اس لیے کہ یہ مال و دولت لوٹنے اور لوگوں کو غلام بنانے کا ہتھیار ہے کرسی چاہے ایک پٹواری کی ہی کیوں نہ ہو، لوگ بڑی سے بڑی قیمت ادا کر کے حاصل کرنا چاہتے ہیں ہمارے پیشِ نظر یہ ہے کہ اس طرح کا نظام لائیں جس میں خود غرضی اور مادہ پرستوں کے لیے اقتدار اور کرسی میں کوئی کشش نہ رہے وہاں کسی کو حق سے زیادہ کچھ بھی نہیں ملے گا۔ عدل وانصاف ہو گا کوئی یہ نہ سمجھے گا کہ وہ اسمبلی کا ممبر ہے اس لیے اسے خصوصی حیثیت ملے گی یا وہ مال بنائے گا ہر فرد صرف بے لوث خدمت کے جذبے سے آگے آ کر کام کر سکے گا آج صدر، وزیر اعظم، وزراء، کمشنر اور ڈپٹی کمشنروں نے اپنے لیے الگ الگ محلات قائم کر رکھے ہیں، جرنیلوں نے اپنے لیے الگ اور اعلیٰ معیارِ زندگی بنا رکھا ہے اس معیار کو بدلنا ہو گا ہم حکام اور افسروں کو عوام کے خادم بنائیں گے اور محلات کو مسکن نہ بنا سکیں گے ہمارے ملک میں ایک لاکھ سے زیادہ باوردی فوجی جوان افسروں کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں وہ ان کے باغوں میں کام کرتے، جوتے پالش کرتے اور کپڑے استری کرتے رہتے ہیں یہ بہت افسوسناک بات ہے سول اور فوجی بیوروکریسی سے ان روایات کو ختم کیے بغیر وہ حقیقی تبدیلی نہیں آسکتی جو جماعتِ اسلامی لانا چاہتی ہے۔

انگریزی دور میں جو فاصلہ افسر اور عام شہری کے بیچ میں رکھا گیا تھا وہ آج بھی قائم ہے اعلیٰ افسر آج بھی درخواست لے کر آنے والوں کو اپنا غلام سمجھتے ہیں یہ دلچسپ مگر تلخ حقیقت ہے کہ ڈپٹی کمشنر کی مہر پر آج بھی انگریزی میں تو صرف ڈپٹی کمشنر ثبت ہوتا ہے مگر اردو میں "ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر" لکھا ہوتا ہے یہ "صاحب بہادری" بھی انگریزی دور کی یادگار ہے دورِ غلامی کی اس منحوس روایت کو ختم کیے بغیر اخوت اور محبت کی بنیاد پر وہ معاشرہ کس طرح قائم ہو سکتا ہے جسے ہم

> لانا چاہتے ہیں ہمارا افسر تفوق کی اس بلندی پر نہیں ہو گا اسلامی نظام میں حکومت، علاقے، رنگ و نسل اور دولت و ثروت کی بنیاد پر قائم تمیز کو ختم کیا جائے گا غریب کو عزت و توقیر ملے گی اور اس سے محبت کی جائے گی مسکین اور کمزور کی عزت و توقیر ہو گی۔(۱۵)

اسلامی حکومت کا یہ تصور جماعت اسلامی کے بانی سید مودودیؒ کی فکر کا تسلسل ہے مگر اس کے ابلاغ یا تشکیل میں کوئی ایسا بنیادی سقم موجود ہے جس کے باعث عوامی سطح پر اجنبیت کے پردے حائل ہیں مولانا مودودیؒ نے پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جمہوریت کی راہ منتخب کی تو اس کی بنیاد وہ افکار و نظریات ہیں جن کو ذہنی و فکری سطح پر تو معاشرے کے ذہین اور جدید تعلیم یافتہ افراد کی ایک قابلِ ذکر مناسب تعداد نے نہ صرف قبول کیا بلکہ اسلامی نظامِ حیات کے ترجمان مفکرین اور علماء میں سے سب سے زیادہ پذیرائی سید مودودیؒ کو ہی حاصل ہوئی حتیٰ کہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ سید مودودیؒ نے اپنی قوتِ استدلال سے انسانی عقل کو کلمہ پڑھا دیا مگر جمہوریت کے سفر میں ہر دفعہ مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے تو اس کے اسباب اور تجزیے تو بے شمار ہیں لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کے اس سفر میں اسلامی تحریک کے اپنے اندر بھی پورا اطمینان موجود نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی ڈپریشن کی فضا ہے۔ کسی بھی جماعت یا تحریک کے لیے علمی سطح پر معاشرے کے ایک قلیل گروہ کو متاثر کرنا ہی ممکن ہوتا ہے جبکہ معاشرے کی عظیم اکثریت کو ساتھ ملانے کے لیے عملی ماڈل پیش کرنے سے کامیابی کی راہیں روشن ہوتی چلی جاتی ہیں جمہوریت کے ذریعے اسلامی حکومت کے خوابوں کی تعبیر حاصل نہ ہونے کے باعث پاکستان میں اسلام پسندوں کے نعرے، دعوے، اہداف اور عزائم بے وقعت ہوتے چلے گئے ہیں مثلاً ہم ایک بار پھر سید مودودیؒ ہی کی مثال کو لیتے ہیں جن کی فکر نے پاکستان کے اندر اور باہر اپنے معتقدین اور متاثرین کا خاصا طبقہ پیدا کیا ہے مگر انتخابی ناکامی کے باعث ان کے بارے میں تنقید اور تبصرے بھی اپنا سکوپ (Scope) رکھتے ہیں۔ مولانا مودودیؒ کی سیاسی فکر کا مطالعہ کرنے والے ایک امریکی مفکر جان ایل ایسپوسیٹو (John. L. Esposito) کا مولانا مودودیؒ کے بارے میں خیال ہے:

> His concern....and this seems to be true of Islamic revivalist movements in the twentieth century in general....was always with abstract philosophical or religious consideration that would form the ideological basis of an Islamic constitution.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Mawdudi himself admits the visionary and ideal nature of much that he had to say about the Islamic state. At several places he speaks of the characteristics of the Islamic state that are realizable only in the context of an ideal Islamic society which does not now exist.(۱۶)

اسی سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی بھی مولانا مودودیؒ پر ناقدانہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مولانا مودودیؒ کے خیال میں جمہوریت کسی حد تک اسلامی چیز ہے چاہیئے کہ شوریٰ کا نظام قائم کیا جائے مگر خلیفہ کو حق حاصل ہے کہ جب چاہے شوریٰ کے فیصلے کو مسترد کر دے انتخاب کا اصول اسلامی چیز ہے مگر انتخاب ایسے لوگوں کا کیا جائے جو انتخاب کے لیے کھڑے نہ ہوں مولانا اپنی تحریروں میں جابجا عہدِ حاضر کے مسائل کا جائزہ لیتے ہیں اور دنیا کے مروجہ نظاموں پر کڑی تنقید کرتے ہیں ان کی تنقید بیشتر برمحل اور درست ہوتی ہے لیکن جب وہ مروجہ نظاموں کو مسترد کر کے ان کے مقابلے پر اپنا نظام پیش کرتے ہیں تو خیالات بہت سطحی اور ہلکے نظر آتے ہیں۔(۱۷)

امرِ واقعہ یہ ہے کہ نصف صدی سے زائد عرصہ ہو چکا ہے کہ لبرل جمہوریت کا جادو تو سر چڑھ کر بول رہا ہے جبکہ اسلامی فکر یا تو علمی سطح پر ہی پیش کی گئی یا پھر جمہوریت کی فضا میں آلودگی کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ آلودگی کا شکار متجددانہ فکر جدید نظامِ سیاست کو اور مغربی اصطلاحات کو اسلامی ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتی ہے یہ سلسلہ سر سید اور پرویز سے بڑھ کر ہندوستانی مفکر وحید الدین خان تک پہنچتا ہے یہ مفکرین مغربی فکر کی حمایت میں بہت دور نکل جاتے ہیں اسلامی حکومت کو مذہبی جبر کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں اور حکومت اور ریاست کا رشتہ مذہب سے توڑنے پر زور دیتے ہیں مگر ان کے ساتھ بھی المیہ یہ ہے کہ تجدد پسند مفکرین کو بھی عوامی سطح پر کوئی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی لہٰذا بحیثیت قوم ہمارا واسطہ ایک ایسی جمہوریت سے ہے جو ایک طرف تو اسلام کی ضد ہے مگر مغرب بھی اس جمہوریت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں اور نہ ہی اس کا امکان ہے جب جمہوریت انسانی رائے اور حقوق کو یکساں عظمت عطا کرتی ہے تو پھر معاشرے میں اقدار کا فروغ کیسے ممکن ہو سکتا ہے جب جمہوریت مساوات اور مذہبی رواداری کی یقین دہانی کرواتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرد اپنے لیے خیر اور شر

کے پیمانوں کا تعین خود کرے گا لیکن انسانی تاریخ کی روشنی میں اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ جمہوریت کے ذریعے مساوات اور رواداری کا معاشرہ تعمیر نہیں ہو سکتا۔ جمہوریت کا یہ تصور بااثر اور طاقتور افراد کو شخصی آزادی کی آڑ میں ظلم اور استبداد کی راہ دکھاتا ہے اور موقع عطا کرتا ہے کہ وہ پورے سماج پر اپنا رنگ غالب کر لیں۔ کتابی دنیا میں جمہوریت افراد کی عمومی رائے (General will) کی بناء پر عوام کو حاکمیت کا حق دیتی ہے اس فکر کے حامل لوگ منظم ہو کر پارٹیاں بناتے ہیں اور عوامی فلاح و بہبود کے دعوے کرتے ہیں۔

لبرل جمہوریت افسانہ اور حقیقت

اگر جمہوریت عوام کی مرضی سے حکومت کی تشکیل کا نام ہے تو پاکستان کی جمہوریت کا سارا عروج و زوال شاہد ہے کہ عوام کی مرضی نام کی کوئی شے اس عمل میں کردار ادا نہیں کر پاتی اگر بیرونی استعمار اپنے ایجنڈے کے مطابق جمہوریت کے عمل کو جاری رہنے دیتا ہے تو یہ مقتدر طبقات (جن میں سول اور فوجی بیوروکریسی کا تذکرہ کیا جا چکا ہے) کے رحم و کرم پر ہوتی ہے نیز اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ اکثریت کی حکومت کو یقینی بناتی ہے تو حکومت تو چند ہی کرتے ہیں اکثریت کا حکومت کرنا عملاً محال ہے نیز چند بااثر اپنے مخصوص ہتھکنڈوں اور حربوں پر جمہوریت کا لیبل چسپاں کر کے اکثریت کو یرغمال بنا لیتے ہیں پھر ایک ایسے معاشرے میں جہاں اسلام ہی سماج کی پہچان ہو اکثریت تو معیارِ خیر اور حق ہو ہی نہیں سکتی قوموں کی تاریخ میں بارہا ایسے مواقع آتے ہیں جب قلیل اور چند افراد نے ہی اکثریت کے مقابل کلمۂ حق بھی بلند کیا اور اس پر استقامت دکھائی خاص طور پر اسوۂ انبیاء اس کی روشن دلیل ہے جبکہ جمہوریت قابلیت، صلاحیت اور کوالٹی (Quality) کو نظر انداز کر کے اکثریت (Majority) یا مقدار (Quantity) کو معیار بناتی ہے اگر فرض کر لیا جائے کہ جمہوری نظام میں کثرتِ آراء مثلاً اکاون فی صد نے ایک فیصلہ کر لیا ہے تو پھر باقی انچاس فیصد کے لیے لبرل ازم کو کیسے یقینی بنایا جائے جو رائے ذوق انتخاب اور فکر کا اختلاف رکھتے ہیں اکثریت کی قائم کردہ حکومت کو من مانے اندازِ حکمرانی سے روکنا عملی طور پر مشکل ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ جمہوریت کی نمائندہ پارلیمنٹ مشرق سے لے کر مغرب تک قانون سازی کے مثبت عمل سے زیادہ تصادم اور الجھاؤ کا شکار نظر آتی ہے جمہوریت کے ذریعے عوام کی حکومت میں شمولیت ایک مغالطے کے سوا کچھ نہیں ہر جگہ چند بااثر لوگ مادی پیمانوں سے اکثریت کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رائے پر اثر انداز ہوتے ہیں پھر پاکستان جیسے معاشرے میں جہاں جہالت کی اندھیر نگری ہو اور عوام بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم ہوں، مادیت اور دولت و ثروت ہی سکہ رائج الوقت قرار پاتے ہیں دلچسپ امر یہ ہے کہ جب پاکستان میں جمہوریت کی خرابیوں کا تذکرہ کیا جائے تو اس کے حامی کہتے ہیں جمہوریت پاکستان میں اپنے عبوری دور سے گزر رہی ہے مگر ستم یہ ہے کہ تحفہ جس سرزمین سے لایا گیا ہے وہاں بھی یہ سیّال صورت میں ہے مثلاً بورسٹن لکھتا ہے:

> When we think about American Democratic Society, then we must learn not to think about a condition, but about a process, not about Democracy, but about the quest for democracy, which we might call democratizing.(۱۸)

جمہوریت کی سیّال صورت اور عبوری دور کا قافلہ خود امریکہ میں کس مرحلے میں ہے اس کا اندازہ تازہ ترین صدارتی انتخابات سے کیا جا سکتا ہے(۱۹) جس میں تیسری دنیا کو مہذب اور جمہوری بنانے کے دعویدار سامراج کی جمہوریت کی اصل صورت بے نقاب ہوئی ہے امریکی جمہوریت میں انتشار، تصادم، ناجائز ذرائع کا استعمال اور فسادات جیسے تمام گھناؤنے پہلو پوری دنیا کے سامنے آئے ہیں جبکہ پاکستانی جمہوریت تو اس کا عکس ہے کہ جس کی کرسٹینا(Christina) نے درج ذیل تصویر کھینچی ہے۔

> The ambiguous results of the 1988 elections, in which neither of the main parties had won a majority, had meant that independent MPs had become a very high priced commodity, well worth the $100,000 investment it had generally cost them to get elected. Money, ministries, licences, jobs for relatives all were on offer. As soon as the results had come in, the PPP and IDA had engaged in a battle of purse strings, first to secure their majorities in the national and Punjab assemblies respectively, and then to try and destroy each other cobbled....together majorities.(۲۰)

اس ساری بحث کے اختتام کے لیے ادیب اور نقاد ڈاکٹر تحسین فراقی کا مشورہ قابلِ غور ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ یونان کی City States کی ابتدائی جمہوریت سے لے کر امریکہ کی ڈالر ڈیموکریسی تک جمہوریت کا دامن ان گنت جرائم سے داغدار ہے جمہوریت کے خمیر اور نہاد میں ایسی

خرابیاں ابتداء ہی سے موجود تھیں جو ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود اصلاح پذیر ہونا تو کجا الٹا بڑھتی ہی چلی گئیں اس کے آزادی، مساوات اور ہمہ گیر رائے دہی کے تصورات مادی اور معاشی تھے گویا جمہوریت ایک جزوی، کسری انسان کے لیے وجود میں آئی تھی ایک مکمل نامیاتی وجود کے لیے نہیں۔ ایک پورے انسان کے لیے نہیں جس کا خمیر روحانیت سے اٹھایا گیا تھا جس کے خمیر میں میثاقِ ازلی کا لہو دوڑتا تھا۔

جمہوریت مسائل کا حل نہیں، آفات و بلیات کا "پنڈورا بکس" ہے اگر آپ میری بات نہیں مانتے تو ان مغربیوں کی بات مان لیں جو مغربی معاشرے کے نمائندہ دانشور، ادیب، ماہر نفسیات اور فلسفی ہیں آج جمہوریت اسی سرزمین پر اپنے اصلی روپ میں بے نقاب ہو رہی ہے جو اس کا مولد اور منشا تھا ہمارے خیال میں جمہوریت ایک پیاز کی مانند ہے جس میں چھلکے ہی چھلکے ہوتے ہیں مغز نام کو نہیں ہوتا اگر ہمیں عظیم اسلامی اقدار اور فکریات کے ساتھ زندہ رہنا ہے تو ہمیں قشر پرستی کو خیر باد کہنا ہو گا حکمتِ یونانیاں تو ہم نے بہت پڑھ سیکھ لی اب حکمتِ ایمانیاں سمجھنے اور سمجھانے کا وقت ہے۔(۲۱)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حوالہ جات باب چہارم

۱-رحمان، مولانا گوہر، اسلامی سیاست، دارالعلوم تفہیم القرآن، مردان، ۱۹۸۲ء، ص: ۸۲

۲-اردو دائرہ معارف اسلامیہ، زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۱ء، جلد ۷، ص: ۴۳۰

۳-جعفری، رئیس احمد، مولانا، اسلامی جمہوریت، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۶۸ء، ص: ۳۶۵

۴-حقانی، ارشاد احمد، جمہوریت—خلافِ اسلام، روزنامہ جنگ، ۸ فروری ۲۰۰۱ء

۵-انصاری، جاوید اکبر، ڈاکٹر، پاکستان میں تحریکِ غلبۂ دین استعمار کو شکست کیسے دے، ماہنامہ ساحل، فیڈرل بی ایریا کراچی، جنوری ۲۰۰۱ء، ص: ۱۳

۶-خرم مراد، لمحات، منشورات منصورہ، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص: ۳۳۹

۷-روزنامہ جنگ، لاہور ۱۶ اکتوبر ۲۰۰۰ء

۸-Nasr, Syed Wali Reza, Mawdudi and the making of Islamic Revivalism, Oxford University Press, New York, 1996, P:73

۹-انصاری، جاوید اکبر، ڈاکٹر، ماہنامہ ساحل کراچی، ص ۱۶۱

۱۰-ایضاً، ص: ۱۶۰

۱۱-انیس احمد، ڈاکٹر، جدیدیت، تجدید، تجدد، مغرب اور اسلام، سہ ماہی "مغرب اور اسلام"، مرکز ایف سیون، اسلام آباد، جنوری، مارچ ۱۹۹۹ء، ص: ۴

۱۲-شہاب قدرت اللہ، شہاب نامہ، س۔ن، ص: ۷۴۳

۱۳-Lamb, Christina, Waiting for Allah, Penguin Books India (P) Ltd, New Delhi India, 1991, P:197

۱۴- Ibid, P: 30, 31

۱۵-قاضی حسین احمد، ہم کیسا پاکستان بنائیں گے، منشورات منصورہ لاہور، ۱۹۹۷ء، ص: ۱۹، ۲۰

۱۶- John, L, Esposito, Voices of Resurgent Islam, Oxford University Press, New York, 1983, P:129

۱۷-جالبی، ڈاکٹر جمیل احمد، پاکستانی کلچر، ص: ۱۶۱

۱۸- بحوالہ ڈاکٹر تحسین فراقی، مغربی جمہوریت اہلِ مغرب کی نظر میں، دیال سنگھ، لائبریری، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص: ۷۵

۱۹-روزنامہ نوائے وقت وروزنامہ جنگ ۹ نومبر ۲۰۰۰ء تا ۲۱ نومبر ۲۰۰۰ء

۲۰- Christina Lamb, Waiting for Allah, P:49

۲۱-فراقی، ڈاکٹر تحسین، مغربی جمہوریت اہلِ مغرب کی نظر میں، ص: ۷۷، ۷۸

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خلاصۂ بحث

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خلاصۂ بحث

لبرل ازم اپنے لغوی و اصطلاحی مفہوم میں اختلافات کے باوجود بد قسمت انسانوں اور معاشروں کا محبوب نظریہ قرار پایا تو قرآن کی صداقت صدیوں کے سفر میں روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔

﴿والعصر ان الانسان لفی خسر﴾ (۱)

زمانے کی قسم بلاشبہ انسان گھاٹے میں ہے۔

آزاد خیالی اور وسیع المشربی یا آزادی و مساوات کی خوش کن اصطلاحات کی آڑ میں انسان کا بنایا ہوا یہ نظریہ اور نظام باطل قرار پاتا رہا بڑے بڑے انقلابات افراط و تفریط پر مبنی معاشرے تشکیل دیتے رہے مگر جو قدر سارے اختلافات کے باوجود نمایاں اور مشترک تھی وہ مذہب بے زاری کا رویہ تھا جس کی وجوہات کچھ بھی کیوں نہ ہوں لبرل ازم میں مذہب بے زاری کی پوری چھوٹ اور آزادی تھی مگر مذہب پسندی کا اختیار دینے کی گنجائش ختم کر دی گئی تھی اس جبر کا نشانہ صرف مغرب کا کلیسائی نظام نہیں بنا بلکہ بیسویں صدی کے وہ مسلمان معاشرے بھی اس لبرل ازم اور آزادی و مساوات سے محفوظ نہ رہ سکے جہاں مغربی تہذیب کے طرفدار حکمران آئے عالم اسلام میں ترکی اس کی واضح مثال ہے۔ تاریخ انسانی اس بات پر بھی شاہد ہے کہ انسانی اخلاق اور اقدار کا ماخذ بھی مذہب ہی رہا ہے مگر مذہب بے زاری کے رجحان نے محض مابعد الطبیعاتی بالادستی سے انکار ہی نہ کیا بلکہ اخلاقی اقدار کا قتل عام ہوا حتی کہ ایسے فلسفے اور نظریات نے فروغ پایا جو اخلاق کی بنیادیں متزلزل کر کے بداخلاقی کی ترویج و اشاعت کو ضروری خیال کرتے تھے مثال کے طور پر اٹلی کے شہرۂ آفاق مفکر میکاولی کی کتاب "دی پرنس" کو سیاسیات میں کلیدی اہمیت حاصل ہے میکاولی سیاسی قیادت کے لیے کن اوصاف کا خواہاں ہے اس کی ایک ہی مثال کافی ہے۔

ہر ایک مانتا ہے کہ ایک حکمران کے لیے اپنے وعدوں کو نباہنا اور اپنے معاملات میں چالاک ہونے سے راست باز ہونا کتنا قابل تعریف ہے پھر بھی عہد حاضر کے واقعات بتاتے ہیں کہ جن حکمرانوں کو بڑی مہموں میں کامیابی ہوتی ہے وہ، وہ تھے جنہوں نے بآسانی وعدہ کیا اپنی چالاکی سے لوگوں کو دھوکا دینا جانتے تھے اور بالآخران پر حاوی ہو گئے جو اپنے دیانتدار اصولوں پر قائم رہے۔ (۲)

جس وقت مغربی معاشرہ مذہب اور اخلاق سے عاری ہو کر خود غرضیانہ مادیت کا درس دے رہا تھا برصغیر میں اسلامی تہذیب کے مخلوط ماڈل کے باوجود معاشرہ بہتر اخلاقی اقدار کا نمائندہ تھا پھر جب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برطانوی اقتدار پاک وہند میں اپنے "مہذب" عزائم کے ساتھ آگے بڑھا تو تہذیبی کشمکش میں اقوام عالم کی دیگر نو آبادیوں کی نسبت برصغیر کے مسلمان کہیں زیادہ سخت جان ثابت ہوئے۔ اپنے اقتدار کو طول اور دوام دینے کے لیے برطانیہ کے لیے محض سیاسی غلبہ کافی نہ تھا بلکہ تہذیبی غلبے کے بغیر سیاسی و عسکری غلبہ بھی نامکمل اور کمزور رہتا ہے اس لیے بڑی کوشش کی گئی اور کسی بھی دوسرے ہتھیار سے کارگر ہتھیار نظامِ تعلیم تھا جیسا کہ اقبال نے کہا ہے:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو

ہو جائے اگر موم تو پھر چاہے جدھر موڑ

آج پاک وہند کی ملتِ اسلامیہ اور بالخصوص مسلمانانِ پاکستان کا اصل المیہ ہی یہ ہے کہ ہم سیاسی سے زیادہ تہذیبی سطح پر مفتوح ہوئے ہیں جب مفتوح اپنی روایت اور ماضی سے کٹ جائے تو اس کی آئندہ نسلوں کا حافظہ کمزور ہو جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ حافظے کے کمزور ہونے حتیٰ کہ چھن جانے کا یہ کربناک عمل دنوں اور ہفتوں میں ہوا، نہیں یہ صدیوں کا المیہ ہے مگر پھر بھی قومی و ملی سطح پر اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا گیا اس کے خلاف بڑی مؤثر اور توانا آوازیں اٹھتی رہیں جو آج بھی امید کے چراغ روشن کرتی ہیں ان آوازوں کے نقیب دیوبند کے مدارس بھی ہیں اور علمائے حق کے دیگر مکتبہ ہائے فکر بھی پھر مغرب ہی کی نبضوں پر ہاتھ رکھ کر مغرب کے فریب کا پردہ چاک کرنے والے اکبر، اقبال اور مودودی بھی جنہوں نے ملت کے حافظے کو زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ ٹوٹے ہوئے دلوں میں امید کی شمع روشن کی اور تہذیبِ مغرب کے اندر کی تاریکی سے مسلمانوں کو خبردار کیا مگر مجموعی طور پر ان قابلِ تحسین کوششوں اور خدمات کے باوجود برصغیر کی ملتِ اسلامیہ تہذیبی جنگ میں پسپا ہوتی چلی گئی اس پسپائی میں ایک اہم کردار اس مغرب نواز طبقے کا تھا جو مسلمان تھا مگر اس کی ساری کوشش اور کاوش کا محور تہذیبِ مغرب کا فروغ اور نفاذ تھا جس کی سب سے اولین اور مؤثر نمائندگی علی گڑھ نے کی۔ علم کو معرفت کی شاہراہ سے ہٹا کر معاش سے وابستہ کیا گیا حکیم الامت نے اسی کا ماتم کیا ہے:

عصر حاضر ملک الموت ہے ترا جس نے

قبض کی روح تیری دے کے تجھے فکر معاش

اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا

جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش

پاک وہند میں مسلمان فکری رویے کے اعتبار سے پورے عالم اسلام میں نمایاں مقام رکھتے تھے بلکہ علوم نبوت کی خدمت اور اشاعت کے لحاظ سے قابلِ مثال تھے گویا کہ مغرب کا فلسفہ اور سماجی علوم ہندوستانی مسلمانوں کی ضرورت نہ تھے لیکن فاتح اپنے مفتوح کے ساتھ اپنی ترجیحات کے مطابق معاملہ کرتا ہے نہ کہ مفتوح کی ضروریات کے مطابق۔ اگر برطانوی اقتدار ہندوستان کی رعایا کو علم کی دولت سے ہمکنار کرنا چاہتا تھا تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی فنی مہارتیں سکھائی جائیں مگر برطانوی استعمار نے اپنی ترجیحات کے مطابق پاک وہند کی نئی نسل کو اپنے تعلیمی نظام میں جو فلسفہ، سماجی علوم، فن، شاعری، آرٹ اور ادب سکھایا اس نے ماضی سے تو کاٹ کر رکھ دیا اور آئندہ کے لیے ایسا ذہن تیار ہوا جو اپنی تہذیب اور روایت کے معاملے میں بدگمان تھا جبکہ مغرب کا دیا ہوا ہر پیمانہ قابل اعتماد تھا۔ مرعوب اور مفتوح ذہنیت کی حامل ایک نسل اور طبقے کا پیدا ہونا کوئی اتفاق نہیں بلکہ ایک گہرے منصوبے کا نتیجہ تھا اس منصوبے میں زبان کے مسئلے کو کلیدی اہمیت حاصل ہے ہندوستان میں فارسی زبان کی بندش اور انگریزی زبان کی ترجیح کا فیصلہ آج تک اپنا رنگ دکھا رہا ہے مسلمانوں کا سارا علمی ذخیرہ اور علوم عربی اور فارسی میں تھے معاشی استحصال کا کارگر حربہ یہ تھا کہ ملازمت کو انگریزی زبان سے وابستہ کیا گیا چنانچہ مزاحمت کے باوجود بتدریج مسلمانوں کو انگریزی زبان کی طرف متوجہ ہونا پڑا اور پھر بقول شاعر

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

ڈاکٹر جمیل جالبی اس تبدیلی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سرسید احمد خان نے جب مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی طرف متوجہ کرنا چاہا اور سہارنپور میں انگریزی مدرسے کی بنیاد ڈالنا چاہی تو اہلِ زبان ڈنڈے لے کر ان کے پیچھے پڑ گئے اور سرسید کو بھاگ کر علی گڑھ میں پناہ لینی پڑی آج اسی عمل کی دوسری انتہا ہم پر مسلط ہے انگریزی زبان کی افادیت اس درجے مسلم ہو چکی ہے کہ ہم اسے کسی قیمت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں اہلِ سیاست نے فرمایا کہ انگریزی زبان چھوڑنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے ساری دنیا سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا ہے لیکن اس کے بعد اپنے معاشرے سے خود ہمارا اکتسابی رشتہ باقی رہ گیا ہے اس پر کسی کی توجہ نہیں گئی۔(۳)

چنانچہ جن حالات میں تحریکِ پاکستان نے زور پکڑا مسلمان اپنی شناخت اور تشخص کے مسئلے پر کمزوری کا شکار تھے پھر دلچسپ امر یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کی قیادت جدید تعلیم یافتہ طبقہ کر رہا تھا مگر علماء کی ایک کثیر تعداد اس تحریک کی معاون و مددگار تھی تو اس وجہ سے پاک و ہند کے مسلمان اپنی اسلامی شناخت اور روایت کی بحالی کے لیے سرگرم عمل ہوئے تھے اس تحریک کو بھرپور عوامی تائید حاصل ہوئی جس کا ثمر پاکستان ہے عوام اسلام کا عالمانہ فہم تو نہ رکھتے تھے مگر اسلام سے جذباتی طور پر شدت سے وابستہ تھے اور اسلام کے سوا پاک و ہند کے مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کی اور کوئی بنیاد نہ ہو سکتی تھی اگر کا تحریکِ پاکستان کے کسی مرحلے میں لبرل ازم یا سیکولر ذہنیت کا غلبہ ہوتا تو مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا ظفر احمد انصاریؒ جیسے راسخ العقیدہ علماء اس تحریک کی ہرگز حمایت نہ کرتے۔ باقی پاکستان کے متعدد اقوال اور فرمودات کا باب اول میں تجزیہ پیش کیا جا چکا ہے کہ قائداعظم کے نزدیک تحریک پاکستان کا مقصد صرف آزادی نہیں بلکہ اسلامی نظریہ ہے جس کے لیے آزادی ایک ذریعہ بھی ہے اور زینہ بھی۔ اور یہ محض قائداعظم کے اقوال کا معاملہ نہیں ہے بلکہ پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ کا وژن (Vision) ہے جس پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور جس کی حیثیت اللہ اور بندوں کے درمیان ایک عظیم عہد اور قیادت اور عوام کے ساتھ ایک عمرانی معاہدے کی طرح ہے اسی حقیقت پر پاکستان قائم ہے اور قائم رہنا ہے نیز یہی پاکستان کے نظریاتی مملکت ہونے کا اصل امتیاز ہے۔

مغربی تہذیب کی اساس لبرل ازم ہے جو فی الحقیقت دین و دنیا، مذہب و ریاست اور اخلاق و سیاست کی دوئی کے تصور کی نمائندہ ہے چنانچہ لبرل ازم کے علمبرداروں سے اسلامی نظریے کی بنیاد پر پاکستان کو منوانا بیسویں صدی کا معجزہ ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی تائید اس طرح شاملِ حال ہوئی کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ۲۷ رمضان المبارک کی سعادت بھی اس دن کے ساتھ جمع ہو گئی۔

پاکستان کے اندر اور باہر لادین طبقہ پاکستان کو ایک لبرل ریاست قرار دینے کے لیے کچھ ہی کیوں نہ کرے یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ پاکستان کی اساس اسلام کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی

پھر نصف صدی سے زائد تاریخ پاکستان کے سارے برس ساری بے وفائیوں، آزمائشوں اور فتنوں کے باوجود قراردادِ مقاصد اور تین دساتیر ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء کے شاہد ہیں۔

تحریکِ پاکستان خوبصورت ڈرائنگ روم کی سیاست نہ تھی بلکہ ایک عظیم الشان عوامی لہر تھی جس میں دس کروڑ مسلمانوں کی عظیم اکثریت جوش و خروش سے حصہ لے رہی تھی مگر جب پاکستان کا خواب حقیقت کا روپ دھار رہا تھا تو بعض ایسے عناصر ہوا کا رخ دیکھ کر اس تحریک کا حصہ بن گئے جن کے نظریات تحریکِ پاکستان کے مقاصد سے ہم آہنگ نہ تھے چنانچہ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستانی ریاست اور معاشرے کو جس فکری کشمکش کا چیلنج پچھلی نصف صدی سے درپیش ہے اس میں ایک طرف وہ لبرل عناصر ہیں جو نفاذِ اسلام کو اپنے مفادات کی راہ کا روڑا سمجھتے ہیں تو دوسری طرف وہ دینی قوتیں ہیں جو پاکستان کو ایک مکمل اسلامی ریاست بنانے کے لیے اپنے اپنے انداز میں سرگرم عمل ہیں اس فکری کشمکش کے اثرات سیاسی، مذہبی اور معاشرتی سطح پر مرتب ہوئے ہیں تو پاکستانی معاشرہ ایک اعلیٰ نصب العین سے محروم ہو گیا ہے بداعتمادی اور ڈیپریشن کی فضا ہے جس میں پاکستان کی بقا اور استحکام کا سوال بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ جہاں ایک طرف عالمی سطح پر پاکستان میں شرح خواندگی کی سطح شرمناک حد تک گری ہوئی ہے یعنی پاکستان دیگر ممالک کے درمیان شرح خواندگی کے اعتبار سے ۱۳۲ ویں نمبر پر ہے مگر دوسری طرف امید کا پہلو یہ ہے کہ ایٹمی صلاحیت اور قوت کے اعتبار سے پاکستان چھٹے نمبر پر ہے گویا کہ راستے مسدود نہیں ہیں امکانات کی شاہراہ روشن ہے۔ ایرانی سکالر سید حسین نصر مستقبل کے رجحانات کا تذکرہ کرتے ہیں:

> دنیا کا وہ حصہ جسے اسلامی دنیا کہا جاتا ہے وہ بہت گہرے مفہوم میں اسلامی ہے اس لیے کہ صدیوں سے مروج قوانین، تہذیب معاشرتی ڈھانچے، یوں کہیئے کہ یہاں بسنے والوں کے پورے تصورِ کائنات کو اسلام نے بڑی گہرائی سے ڈھالا ہے مزید براں مغرب کے سامنے ایک صدی سے زیادہ مدت کی پسپائی اور کبھی کبھار خلاصہ دہرانے کے بعد اسلامی کہلائی جانے والی دنیا کے بہت سے لوگ مختلف ذرائع اور طریقوں سے اسلام کی طرف مراجعت کی کوشش کر رہے ہیں حتیٰ کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلام سے متعلق ایک نہ ایک قسم کے احیاء کی صورت بہت سے مسلم ممالک میں نظر آتی ہے۔(۴)

بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں مسلمان ممالک نے بڑی تعداد میں آزادی حاصل کی مگر عوام کی اسلام سے جذباتی وابستگی کے باوجود مسلم دنیا کی سیاسی قیادت لبرل عناصر کے پاس رہی پاکستان جہاں احیائے اسلام کی تحریک کے لحاظ سے عالم اسلام میں ممتاز ہے وہاں قیادت کے معاملے میں محرومی کا شکار رہا ہے قائداعظم کے بعد آنے والے حکمران پاکستان کی فکری و نظریاتی بنیادوں کو مستحکم کرنے سے زیادہ عالمی سطح پر غالب، قابض اور منظم مغربی تہذیب اور لبرل ازم کے مہرے کے طور پر کام کرتے رہے۔ چنانچہ کبھی سیاستدانوں کی شکل میں کبھی نوکر شاہی کے روپ میں اور کبھی فوجی قیادت کے لبادے میں پاکستان پر لبرل قیادت کے تسلط کے باوجود پاکستانی معاشرہ اسلامی شعائر اور اقدار کا ہی نمائندہ ہے، تو خیر کا یہ پہلو ایک بہتر مستقبل کی ضمانت بھی ہے تاہم آج کے پاکستان میں اسلام سے معاشرتی سطح پر جذباتی وابستگی لبرل ازم کی تحریکات کی راہ میں رکاوٹ تو ہے مگر لبرل ازم کا راستہ روکنے میں ناکام بھی ہے ڈاکٹر جمیل جالبی آج کے پاکستان کا بڑا فکر انگیز تجزیہ کرتے ہیں کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اس مملکت کے عوام کا ان کے مذہب سے گہرا جذباتی رشتہ ہے اور اسے وہ زندگی کی اہم ترین قدر جانتے ہیں پاکستان میں مذہب نہ صرف معاشرے اور کلچر کا بنیادی عمل ہے بلکہ یہ معاشرے میں ایک مؤثر قوت کی حیثیت رکھتا ہے مؤثر ان معنی میں کہ اس سطح پر اس معاشرے کا ایک انسان دوسرے انسان سے زیادہ قربت اور مماثلت محسوس کرتا ہے، اس رشتے کے ذریعے اس کے اندر ایک دوسرے سے رواداری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کے تحفظ کے لیے ایک زبان ہو کر متحد ہو جاتے ہیں ایک طرف تو مذہب کا یہ عمل واثر ہے اور دوسری طرف ہمارا سوچنے والا ذہن یہ محسوس کر رہا ہے کہ مذہب یک جہتی کی بنیادی قوت ہونے کے باوجود زندگی کے زندہ مسائل کا ساتھ نہیں دے رہا ہے ہم اپنی عقبیٰ سنوارنے کے لیے دوسرے عمل کرتے ہیں اور دنیا سنوارنے کے لیے دوسرے عمل۔ اور ان دونوں میں کوئی مضبوط رشتہ باقی نہیں رہا ہے ایسے میں یہ کہا جائے کہ اس میں مذہب کا کیا قصور۔ مذہب نے تو راستہ دکھا دیا ہے جو منزل پر پہنچے گا جو اس پر نہیں چلے گا بھٹکتا پھرے گا مجھے بھی یہی کہنا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ ہم نے مذہب کی جس شکل کو قبول کر کے معاشرے کو چلنے کا راستہ دکھایا ہے وہ راستہ بذات خود ہمیں منزل تک نہیں

لے جاتا اس ثنویت اور تضاد کو ابھار کر عقبیٰ اور دنیا کو الگ الگ کر دیا ہے اور خود اس کا نظام خیال ایک جگہ ٹھہر گیا ہے مذہب کی موجودہ شکل ایک جذباتی قدر کی حیثیت تو ضرور رکھتی ہے لیکن مذہب کے ذریعے پیدا ہونے والی یک جہتی کی وہی نوعیت ہے جو دشمن کے خوف سے متضاد انسانوں میں اتحاد پیدا ہو جانے کے عمل میں نظر آتی ہے اس جذباتی رشتے نے مذہب کو رسومات کی حد تک غیر معمولی اہمیت دے دی ہے اور اسی لیے یہ رسومات و عبادات مذہب کے واحد مظہر بن گئے ہیں لیکن اس کے علاوہ مذہب کا رشتہ زندگی کے متنوع نظام، سائنسی و عقلی علوم و دنیاوی و مادی زندگی، صنعت و تجارت اور تحقیق و تفکر سے باقی نہیں رہا ہے۔(۵)

آج کے پاکستان میں لبرل اور سیکولر عناصر کے لیے معاشرتی سطح پر عوام الناس کی مذہب سے جذباتی و سطحی وابستگی کی فضا اس صورتحال سے زیادہ سازگار ہے کہ پاکستان کے عوام مذہب کو ایک مکمل دین اور قابل عمل ضابطۂ حیات سمجھیں اور نعمت سمجھ کر شعوری طور پر اختیار کریں لہٰذا اس سازگار معاشرتی صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لبرل ازم کے علمبردار خوش کن اصطلاحات کا جادو جگاتے ہیں حسن عسکری بجا طور پر نشاندہی کرتے ہیں کہ جدیدیت الفاظ کے جادو سے کام لیتی ہے اور لوگوں کے ذہنوں کو مسحور کر کے سوچنے سمجھنے کی طاقت کو معطل کرنا چاہتی ہے چنانچہ کسی چیز کی تحسین کے لیے اسے "جدید" یا "سائنٹفک" کہہ دینا کافی سمجھا جاتا ہے اسی طرح کے الفاظ ہیں "آزادی"، "انسانی مسرت"، "خوش حالی"، "زندگی کا معیار بلند کرنا"، "روزمرہ کی زندگی"، "عام آدمی"۔(۶)

اگرچہ علامہ اقبال نے قصہ قدیم و جدید کو دلیل کم نظری قرار دیا ہے مگر پاکستان میں ایک طرف تو جدیدیت کے رجحانات کے حامل گروہ اور تحریکیں سرگرم عمل ہیں تو دوسری طرف مذہبی رجحانات کے حامل وہ طبقات ہیں جنہوں نے عین اسلام کی روح کو نظر انداز کر کے تن آسانی کا راستہ اختیار کیا ہے ان میں زیادہ تر تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کے اصل چیلنج کا ادراک ہی نہیں رکھتے اور محض لکیر کے فقیر ہیں۔ اسلامی روایت اور فکر میں اجتہاد تازہ ہوا کے جھونکوں کی مانند ہے مگر اس کے لیے جس محنت اور جدوجہد کی ضرورت ہے اس سے جی چرا کر اسلاف کی صدیوں پہلے کی گئی محنت کو ہی کافی سمجھا جا رہا ہے ڈاکٹر جمیل جالبی اس صورتحال کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ وہ قوتیں جو آزادیٔ اظہار کو روک رہی ہیں ان میں ایک طرف وہ تنگ نظر لوگ شامل ہیں جو روایتی و مروجہ خیال میں کسی قسم کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تبدیلی کو کفر سمجھتے ہیں اور دوسری طرف سیاست وتدبر کے وہ اجارہ دار ہیں جو سارے معاشرے کی آنکھوں پر وہ ہی عینک چڑھا دینا چاہتے ہیں جو خود ان کے اقتدار کی آنکھوں پر چڑھی ہے۔ پہلے گروہ میں وہ لوگ ہیں جو اپنے عقائد کے سلسلے میں اتنا تشدد کرتے ہیں کہ ہر اس فکر یا طرزِ عمل کو جو ان سے مطابقت نہیں رکھتا، گردن زدنی قرار دیتے ہیں ان کے لیے مذہب کے معنی صرف و محض وہ قصہ کہانیاں اور معجزوں بھری روایات ہیں جن کی مدد سے وہ اپنے وعظوں میں گرمی بھر کر ملک کی غالب آبادی کو ضعیف الاعتقادی کے طلسم میں گرفتار رکھتے ہیں مذہب کے اجارہ داروں کا کاروبار چونکہ صرف توہم پر قائم ہے لہٰذا وہ ہر نئے خیال کو بار آور ہونے سے پہلے کچل دینا چاہتے ہیں نتیجہ اس کا یہ ہے کہ مذہب کی سطح پر ذہنی آزادی کا مسئلہ ایک ایسی صورتحال سے دوچار ہے جس میں خیال غائب ہے اور توہم زندگی کا راستہ روکے کھڑا ہے کوئی نیا خیال جب بھی حال کی گود میں آکر بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے معاشرہ اسے چھپکلی سمجھ کر دامن جھٹکنے کا عمل کرتا ہے اور جھٹ اپنے مروجہ عقیدے یا خیال کے بے جان بچے کو گود میں بٹھا کر جذبے کی پوری شدت سے پیار کرنے لگتا ہے اس وقت اس کے ذہن کی حالت یہ ہوتی ہے جیسے اس کے لاڈلے بچے کو چھین کر ایک نامعلوم باپ کے بچے سے اس کی گود بھری جارہی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو تاریخی بہاؤ سے الگ کھڑے ہیں اور جنہوں نے ذہنی آزادی کو خوف اور احساسِ زیاں کے تصور سے دبا کر خیال کے ارتقاء کو روک دیا ہے آج انہی لوگوں کی وجہ سے نیا خیال دھول اور گرد میں اٹا کچی سڑک کے کنارے پڑا بھیک مانگ رہا ہے۔

دوسرے گروہ میں جیسا کہ میں نے کہا ہے سیاست وتدبر کے وہ اجارہ دار شامل ہیں جو مملکت کے تحفظ کا نام لے کر ہر اس آواز کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کے اقتدار کے لیے ذرا سا خطرہ بھی بن سکتی ہے ذہنی آزادی کے یہ اس لیے دشمن ہیں کہ یہ صرف و محض اقتدار کے خواہاں ہیں اور معاشرے کو اپنے اقتدار کی برکات سے مستفیض کرنے کے لیے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ صرف ان کی آواز ہی معاشرے تک پہنچے۔ اس سطح پر اصولی یا اصولی سطح پر مخالفت کا عمل بھی ذات کی مخالفت بن جاتا ہے ایسے میں ہر اس شخص کو اقتدار حاصل ہو سکتا ہے جو ان کی فکر میں جذب ہو جائے۔ (۷)

جہاں تک پاکستان میں لبرل ازم کے اثرات کا تعلق ہے اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ بھی ہے کہ لبرل ازم اگر کسی خاص مفہوم اور درجے میں معاشرے کے افراد کو درکار فطری آزادی کا نام

ہے تو یہ ایک ناگزیر ضرورت بھی ہے اور مستحسن قدر بھی۔ اسلام اس آزادی حتی کہ جدت پسندی پر کوئی پابندی نہیں لگاتا جس کے نتیجے میں انسانیت نے پتھر کے زمانے سے ایٹمی توانائی کے دور کا سفر کامیابی سے مکمل کیا ہے اگر لبرل ازم اپنے اصطلاحی اور تاریخی پس منظر کے ساتھ محض ایجادات اور مادی ترقی کے لیے سازگار فضا نہیں ہے بلکہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو نہ صرف کسی بالاتر ہستی کا منکر ہے بلکہ ہر قانون اور ضابطے کو توڑ کر انسان کو افادیت پسند بناتا ہے گویا کہ کائنات اور دنیا ایک چراگاہ ہے اور انسان اس میں آزادانہ چرنے والے جانور۔ یہ درست ہے کہ مذہبی ترجمان تنگ نظری کا ثبوت دیتے ہیں جدت پسندی کی مخالفت میں انتہا پسندی کا رویہ اختیار کرتے ہیں تو یہ ردعمل ہے لبرل ازم کے اس تاریخی سفر کا جس نے انسانیت کو تباہی کے دہانے پر پہنچایا ہے عریانی وفحاشی کا سیلاب اسی لبرل ازم کے نتیجے کے طور پر اقدار کو پامال کر رہا ہے باہمی رضامندی سے زنا کو سند جواز عطا کی گئی ہے برطانیہ جیسے مہذب اور ترقی یافتہ ملک کی پارلیمنٹ نے قحبہ گری کا بل منظور کیا ہے حتی کہ محرم عورتوں سے شادی کی اجازت کا مطالبہ بھی کیا جا چکا ہے اور اس ساری صورتحال میں انسانی عقل کو خیر وشر کے تعین کے لیے معیار بنایا گیا ہے چنانچہ یہ معیار ہی سارے فساد کی جڑ ہے گو کہ انسانی عقل ایک عظیم نعمت ہے مگر بقول اقبال:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں

لبرل ازم میں انسانی آزادی یا جدت پسندی کی اقدار جس قدر انسان کی فطری ضرورت ہیں اسلام ہی ان کی حقیقی ضمانت فراہم کرتا ہے مگر پاکستانی معاشرہ سیاسی، معاشرتی حتی کہ مذہبی سطح پر بھی دینِ اسلام کے فہم سے عاری ہے مزید ستم یہ ہے کہ علم کے نام پر جو سرگرمی ہو بھی رہی ہے وہ یا تو محض حروف شناسی ہے یا محض معلومات کا حصول۔ پاکستانی معاشرہ پاکستان کے نظریاتی مملکت ہونے کے دعوے کے باوجود اس یقین اور اعتماد سے محروم ہے کہ اگر آزادی، جدت پسندی، مساوات اور حقوق درکار ہیں تو وہ اسلام کی چوکھٹ پر ہی دستیاب ہیں ممتاز عالم دین تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ "جدت پسندی" کی ان حدود کو پہچانے اور اسلام نے "جدت پسندی" کا جو وسیع دائرہ انسان کو دیا ہے اسے چھوڑ کر اس مختصر دائرے میں دخل اندازی نہ کرے جس کے احکام شریعت نے خود مقرر کر دیے ہیں اور جو ناقابل تغیر ہیں اس کے برعکس عالم اسلام کا موجودہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرزِ عمل یہ ہے کہ جس دائرے میں اسے جدید طرزِ فکر اختیار کرنا تھا وہاں تو اس کی تگ و تاز انتہائی سست اور محدود ہے اس کے برعکس جو احکام الٰہی ناقابل تغیر تھے مسلمانوں نے اپنی "جدت پسندی" کا رخ ان کی طرف کر رکھا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ عصرِ حاضر نے جو اچھائیاں انسانیت کو دی ہیں ان سے تو ہم محروم ہیں اور جو برائیاں اس نے پیدا کی ہیں وہ سب تیز رفتاری سے ہمارے معاشرے میں سرایت کر رہی ہیں۔(۸)

چنانچہ اس تناظر میں پاکستان مطلوب جدید ترقی سے تو محروم ہے بے پناہ اور وافر قدرتی وسائل سے مالا مال ہو کر بھی پاکستانی معاشرہ کا خواندگی اور جہالت کے گڑھوں میں گرا ہوا ہے معاشی ابتری بڑھتی جا رہی ہے معاشرتی زندگی بے سکون اور انتشار کا شکار ہے لیکن اس کے برعکس وہ جدت پسندی اور آزاد روی جس کے نہ تو ہم دنیاوی اعتبار سے متحمل ہو سکتے ہیں نہ اخلاقی و دینی اعتبار سے۔ وہ تیز رفتاری سے غلبہ اور استحکام حاصل کر رہی ہے جدید عہد میں ریاست کا ادارہ بے پناہ قوت اور اختیار کا حامل ہے مگر لبرل ازم اور مغربی تہذیب جن حقوق اور آزادیوں کے ضامن بنتے ہیں پاکستان کی ریاستی تاریخ ان سے سدا محروم رہی ہے جمہوری حکومت یا فوجی آمریت کا رنگ غالب رہا ہے پھر انتظامی معاملات اور معاشرتی زندگی پر اثر انداز ہونے والے اہم شعبے مثلاً ذرائع ابلاغ، الیکٹرانک میڈیا، این جی اوز اور نظام تعلیم لبرل ازم کے فروغ کے لیے سرگرم عمل ہیں معاشرہ کسی اعلیٰ وارفع نصب العین سے محروم ہے لیکن ریاست کے مستحکم ادارے کی پشت پناہی سے لبرل ازم اور مغربی تہذیب کے سارے مفاسد اور نقائص سیاسی، مذہبی اور معاشرتی زندگی پر اثرات مرتب کر رہے ہیں کہنے کی حد تک پاکستان کے ماتھے پر "اسلامی جمہوریہ" کا عنوان بھی موجود ہے مگر جو جمہوریت پاکستان کے تجربات کا حصہ بنی ہے وہ اسلامی تو کیا مغربی بھی ثابت نہیں کی جا سکتی۔ ایک طبقہ ساری ناکامیوں کے باوجود مغربی جمہوریت کی جڑیں قرآن و سنت میں تلاش کر کے اسلامی جمہوریت کے لیے چشم راہ ہے تو دوسرا طبقہ جمہوریت کو دلائل و براہین سے رد کر کے خلافت اور اسلامی حکومت وغیرہ کے خواب دیکھتا اور پیش کرتا ہے مگر خلافت اور اسلامی حکومت کا کوئی عملی ماڈل نہ ہونے کے باعث اس طبقے کو محض علمی اور فکری انداز میں اپنی بات سمجھانا مشکل ہے۔ پاکستانی جمہوریت پر مفادات اور اغراض کا رنگ غالب ہے انتخابی عمل اسی غرض کے گرد گھومتا ہے۔ عوام کی اخلاقی حالت پست ہوتی جا رہی ہے ٹھیٹھ اسلامی فکر کی ترجمان

جماعتیں بھی محض الیکشن جیتنے کے لیے وہ حربے استعمال کرتی ہیں جن سے اخلاق اور اقدار کی پامالی کی قیمت پر بھی الیکشن جیتنا ہی اصل ہدف قرار پاتا ہے فکری طور پر اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات سمجھنے اور سمجھانے کے باوجود سیاست کے ہر رجحان کا دین سے تعلق کمزور ہے اور اگر مروجہ سیاست میں آگے بڑھنا ہے تو ضروری ہے کہ دین کو سیاست کے تابع کیا جائے چنانچہ جب سیاسی مجبوریوں سے لادین عناصر اور اسلام پسندی میں انتخابی اتحاد بنتے ہیں مشترکہ جدوجہد ہوتی ہے تو اسلام پسندوں اور لادین عناصر کے درمیان امتیاز کی لکیر مدہم پڑ جاتی ہے۔ اس ساری صورتحال کا امید افزا پہلو یہ ہے کہ جذباتی طور پر ہی سہی معاشرہ اسلام اور علوم نبوت سے وابستہ ہے مگر دین کا صحیح فہم نہ ہونے کے باعث اسلام کو محض رسوم و رواج کا مجموعہ نیز سزا اور تعزیرات کا نظام سمجھتا ہے اگر پروردگار کے اعلان کے مطابق اسلام کو ایک نعمت کے طور پر قابل عمل ضابطۂ حیات سمجھے، اس کا یقین حاصل کرے تو پاکستان کے مستقبل کے روشن ہونے کی ضمانت مل سکتی ہے۔

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾۔(۹)

پس جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی نہ ٹوٹے گا اور اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ایمان لانے والوں کا کارساز اللہ تعالیٰ خود ہے وہ انہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لے جاتا ہے اور کافروں کے اولیاء شیاطین ہیں، وہ انہیں روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں، یہ لوگ جہنمی ہیں جو ہمیشہ اسی میں پڑے رہیں گے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حوالہ جات خلاصۂ بحث

۱-القرآن،۱۰۳:۱،۲

۲-میکاولی نکولو "دی پرنس" مترجم ڈاکٹر ایس ایم قریشی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ص: ۱۰۵

۳-جالبی، ڈاکٹر جمیل، پاکستانی کلچر، نیو مجاز پریس، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص: ۱۶۴

۴-نصر، سید حسین، جدید دنیا میں روایتی اسلام، مترجم سید باقر رضوی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۶ء، ص: ۱۶۷

۵-پاکستانی کلچر، ص: ۱۲۶، ۱۲۷

۶-عسکری، حسن، جدیدیت، ادارہ فروغ اسلام، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص: ۱۳۷، ۱۳۸

۷-پاکستانی کلچر، ص: ۱۹۸، ۱۹۹

۸-عثمانی، محمد تقی، اسلام اور جدت پسندی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۹ء، ص: ۱۹

۹-القرآن، ۲:۲۵۶، ۲۵۷

مصادر و مراجع

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مصادر و مراجع

- القرآن الحکیم
- آزاد، مولانا ابوالکلام، آزادیٔ ہند، مرتبہ ہمایوں کبیر، ارشد بک سیلر، میرپور، ۱۹۹۶ء
- اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۱
- اسرار احمد، ڈاکٹر، اسلام اور پاکستان، مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۹۸۴ء
- اسرار احمد، ڈاکٹر، استحکام پاکستان، مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۹۹۱ء
- اشعر مسعود، پاکستانی معاشرہ اور عدم رواداری، تالیف حسن عابدی، مشعل عثمان بلاک نیو گارڈن، لاہور، ۱۹۹۷ء
- اصغر خان، صدائے ہوش، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء
- اصلاحی، امین احسن، مولانا، اسلامی معاشرے میں عورت کا مقام، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۹۸ء
- اقبال خان، فلسفہ تعلیم اور سیاست اور پاکستان کا مستقبل، فکشن ہاؤس لاہور، ۱۹۹۶ء
- اکبر علی، پاکستان جدید دور کے تقاضے، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۰ء
- انصاری، محمد الیاس، وڈیو جنریشن، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۷ء
- تبریزی، خطیب، محمد بن عبداللہ، مشکوۃ المصابیح، دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۱ء
- جالبی، ڈاکٹر جمیل، پاکستانی کلچر، نیو حجاز پریس، کراچی، ۱۹۹۷ء
- جعفر احمد، ڈاکٹر، ارتقاء، ارتقاء مطبوعات ولدیت آباد، منگھو پیر کراچی، ۱۹۹۴ء
- جعفری، رئیس احمد، اسلام جمہوریت، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۶۸ء
- جلال زئی، موسیٰ، خان، این جی اوز اور قومی سلامتی کے تقاضے، فیروز سنز، لاہور، ۲۰۰۰ء
- حسن محمود، مخدوم زادہ، سید، میرا سیاسی سفر، جنگ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء
- حسین احمد، قاضی، ہم کیسا پاکستان بنائیں گے، منشورات منصورہ، لاہور، ۱۹۹۷ء
- خان، رشید الدین، ابوالکلام آزاد، شخصیت سیاست، پیغام، مکتبہ قدوسیہ اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۲ء
- خرم مراد، مسائل و افکار، البدر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء
- ڈوگر، رفیق، سیاسی ملاقاتیں، (انٹرویو حنیف رامے) سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

- راٹھور، افضال مظہر، پاکستان لوٹنے والے چہرے، اے ایچ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۷ء
- ربانی، خالد محمود، قائداعظم کے آخری ۵۰ دن اور ان کے ذاتی معالج، پاکستان سٹڈی سنٹر، نیو کیمپس، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۹ء
- رحمان، آئی اے، مذہبی تعصب، پاکستانی معاشرہ اور رواداری، تالیف حسن عابدی، مشعل، لاہور، س ن
- رحمان، مولانا گوہر، اسلامی سیاست، دارالعلوم تفہیم القرآن، مردان، ۱۹۸۲ء
- زاہد اسلام، آج کے پاکستان کی ترقی پسند سیاست، مکتبہ فکر و دانش، لاہور، ۱۹۹۰ء
- زیدی، مسعود سید، پاکستان کا مقدمہ، کلاسک لاہور، ۱۹۸۸ء
- شاہتاز، نور احمد، تاریخ نفاذِ حدود، فضل سنز اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۸ء
- شوکت علی، موجودہ سیاسی صورتِ حال اور پاکستان کا مستقبل، مزدور کسان پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۳ء
- شہاب، قدرت اللہ، شہاب نامہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء
- صدیقی، مشتاق الرحمان، ڈاکٹر، تعلیم و تدریس، مباحث و مسائل، پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء
- صدیقی، مشتاق الرحمان، ڈاکٹر، قومی تعلیم اور اس کے تقاضے، شعبہ قومی تعلیمی امور تنظیم اساتذہ، لاہور، ۱۹۹۸ء
- ظفر، ایس ایم، ڈکٹیٹر کون، الفیصل ناشران و تاجران کتب، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۶ء
- ظفر علی، چوہدری، پاکستان کی ترقی پسند تحریکیں اور تنظیمیں، گندھارا راولپنڈی، ۱۹۹۱ء
- عبدالرشید، جو میں نے دیکھا، آتش فشاں پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء
- عثمانی، محمد تقی، اسلام اور جدت پسندی، مکتبہ دارالعلوم، کراچی، ۱۹۹۹ء
- عسکری، حسن، جدیدیت، ادارہ فروغ اسلام، لاہور، ۱۹۹۷ء
- عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریکِ آزادی میں اردو کا حصہ، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۶ء
- علوی، ڈاکٹر خالد، اسلام کا معاشرتی نظام، المکتبہ علمیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء

- عمری، جلال الدین، مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ، ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ، ۱۹۸۶ء
- فراقی، ڈاکٹر تحسین، مغربی جمہوریت، اہل مغرب کی نظر میں، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، ۱۹۸۳ء
- فرید احمد، مولوی فرید احمد کی ڈائری، فرنٹئر پوسٹ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء
- قریشی، ڈاکٹر وحید، اسلامی تعلیم چند نظریاتی مباحث، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس، ملتان روڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء
- قریشی، ڈاکٹر وحید، پاکستان کی نظریاتی بنیادیں، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس، ملتان روڈ، لاہور، ۱۹۷۳ء
- کوثری، آزاد، پاکستانی کلچر کی مختلف جہتیں، ری پبلکن بکس ٹمپل روڈ، لاہور، ۱۹۸۸ء
- گوندل، اقبال، ہماری سیاست اور اکیسویں صدی، آزادی انٹرپرائزز، لاہور، ۱۹۹۹ء
- گوہر، الطاف، ایوب خان فوجی راج کے پہلے دس سال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء
- گوہر، الطاف، لکھتے رہے جنوں کی حکایت، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء
- گوہر، وسیم، گواہی، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۳ء
- مجاہد حسین، کون بڑا بد عنوان، پرنٹ لائن پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۰ء
- محمد سعید حکیم، اکیسویں صدی کی جانب، ہمدرد فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۹۳ء
- محمد سلیم، سید، مسلمان اور مغربی تعلیم، ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ، لاہور، ۱۹۸۵ء
- محمد سلیم، سید، مغربی فلسفۂ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ، ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ، لاہور، ۱۹۸۹ء
- محمد عثمان، مسعود اشعر، پاکستان کی سیاسی جماعتیں، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۰ء
- مرزا، محمد منور، دیوارِ برہمن، مکتبہ وحدت ملی اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۲ء
- مرزا، محمد منور، پاکستان حصارِ اسلام، گوہر سنز اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۸ء
- مسلم، محمد بن مسلم، الجامع الصحیح، دارالفکر، بیروت، ۱۹۹۱ء
- منیر، احمد منیر، سیاسی جوار بھاٹا، انٹرویو غلام نبی خان پٹھان، آتش فشاں پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

- مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، تہذیبی کشمکش میں علم و تحقیق کا کردار، ادارہ معارفِ اسلامی، کراچی، ۲۰۰۰ء
- میکاولی نکولو، "دی پرنس"، مترجم ڈاکٹر ایس ایم قریشی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء
- نصر، سید حسین، جدید دنیا میں روایتی اسلام، مترجم سید باقر رضوی، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۶ء

رسائل و جرائد اور اخبارات

- پاکستان ٹائمز، ۹ دسمبر ۱۹۴۹ء
- ترجمان القرآن، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۶ء، مئی ۲۰۰۰ء، جنوری ۱۹۸۷ء، جون ۱۹۸۷ء، مارچ ۲۰۰۱ء، اپریل ۲۰۰۰ء، اگست ۱۹۴۹، فروری ۱۹۵۶، نومبر ۱۹۹۵ء، اکتوبر ۱۹۴۹ء، مارچ ۱۹۵۶ء، اپریل ۱۹۶۰
- چراغِ راہ، نظریہ پاکستان نمبر، کراچی، دسمبر، ۱۹۶۰ء
- خواتین میگزین، چیمبرلین روڈ لاہور، ۲۰۰۱ء
- روزنامہ امروز ۲۵ فروری ۱۹۶۰ء
- روزنامہ جنگ لاہور، ۸ فروری، ۱۶ اکتوبر ۲۰۰۰ء
- روزنامہ نوائے وقت، ۹ نومبر ۲۰۰۰ء تا ۲۱ نومبر ۲۰۰۰ء
- سہ ماہی مغرب اور اسلام، مرکز ایف سیون، اسلام آباد، جنوری—مارچ ۱۹۹۹ء
- سیارہ ڈائجسٹ، گولڈن جوبلی نمبر اللہ والا پرنٹرز، ریواز گارڈن، لاہور، ۱۹۹۷ء
- ماہنامہ افکار معلم، فروری ۱۹۹۹ء، جولائی ۱۹۹۴ء
- ماہنامہ الفجر کراچی
- ماہنامہ ساحل فیڈرل بی ایریا کراچی، جنوری ۲۰۰۱ء
- ماہنامہ عرفات جامعہ نعیمیہ، لاہور، اگست، ستمبر ۲۰۰۰ء
- ماہنامہ محدث، لاہور، ستمبر ۲۰۰۰ء
- ڈیلی سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور، ۲۷ اپریل، ۱۹۴۹ء

- ہفت روزہ اسلامی جمہوریہ، رانا چیمبرز، پرانی انارکلی، لاہور، اپریل ۱۹۷۷ء
- The News, International, July 4, 2000
- Pakistan Times, Press, 1982

ENGLISH BOOKS

- Ansari, Zia-ud-Din, The Analytical and Critical Essays on Pakistan Affairs, Azeem Academy Lahore, 1995.
- Bashir Ahmad Dar, Letters of Iqbal , Lahore: Iqbal Academy, 1978.
- G.W Chaudhary, Pakistan Transition from military to civilian rule, Scorpion Publishing Ltd, England, 1988.
- Iqbal, Allama Mohammad, Reconstruction of Religious Thought in Islam, Sixth lecture, Sh, Mohammad Ashraf, New Anarkali, Lahore, 1988.
- Ishtiaq Ahmad, The Concept of an Islamic State, Frances Printer (Publisher), London, 1987.
- Jamil-ud-Din Ahmad, Speeches and Writings of Mr. Jinnah (Lahore, Sheikh Mohammad Ashraf) .
- John, L, Esposito, Voices of Resurgent Islam, Oxford University Press, New York, 1983.
- Khan, Gul Mohammad, Justice (Retd), Quest for Islamization, Pakistan Study Centre Punjab University Lahore, 1999.
- Lamb, Christina, Waiting for Allah, Penguin Books India (P) Ltd, New Delhi India, 1991.
- Nasim Hassan, .Shah, Dr., Quaid-i-Azam Whether Secularist or Fundamentalist published in Al-Hibba (Journal) Lahore, May 2000.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اشاریہ

- Nasr, Syed Hussein, Islam and the plight of modern man, Suhil Academy Lahore, 1994.
- Nasr, Syed Wali Reza, Mawdudi and the making of Islamic Revivalism, Oxford University Press, New York, 1996.
- Qureshi, Dr. Wahid, Jinnah's and Iqbal's Pakistan, Published in Pakistan between secularism and Pakistan by Tank Jan Institute of Policies studies Islamabad, 1998.
- Safdar Mahmood, Dr, The Constitution of Pakistan, A.H Publishers Urdu Bazar, Lahore, 1994.
- Satish Kumar, The New Pakistan, Allah wala Printers, The Mall, Lahore, 1987.
- Shireen Pasha, A historical overview of television in Pakistan, published in The News International, July 4, 2000.
- Surendra Nath Kaushik, Politics of Islamization in Pakistan, South Asian Publishers PVT, Ltd, New Delhi, 1993.
- Zafarm M., Dr., Teachers training (The Islamic Perspective), Institute of Policy Studies and International Institute of Islamic Though Islamabad, 1996.
- Zulfiqar, G. H, Dr., Pakistan as visualized by Iqbal and Jinnah (selected and Compiled) Bazm-i-Iqbal, Lahore.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسماء واماکن

اسماء

آ

آزاد سبحانی، ۲۳، ۲۴

ا

ابوالکلام آزاد، ۴، ۲۰، ۲۱

اتاترک، ۵۶، ۱۴۳

اجمل خٹک، ۱۳۴

اچکزئی، عبدالصمد خان، ۷۱

احمد شاہ بخاری، ۳۹

اختر عبدالرحمان، جنرل، ۸۳

اسرار احمد، ڈاکٹر، ۷، ۱۵، ۲۰، ۱۰۲

اسلم اظہر، ۱۲۸، ۱۲۹

اسلم بیگ، جنرل، ۸۴

اشتیاق حسین قریشی، ۳۸

اشرف علی تھانوی، ۷، ۲۲۰

اشفاق احمد، ۱۰۵

اصغر خان، ۸۲، ۸۳، ۱۰۳، ۱۳۸

افتخار الدین، ۳۷

افضل الحق، ۲۳

افغانی، جمال الدین، ۹، ۱۰

افلاطون، ۱۴۷

اقبال خان، ۱۶۹

اقبال، علامہ، ۳، ۴، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۱۰۶، ۱۷۲، ۱۷۵، ۱۸۱، ۲۱۸، ۲۲۳، ۲۲۵

اکبر الٰہ آبادی، ۱۴۰، ۱۷۲، ۱۷۸

اکبر، شہنشاہ، ۵۳

الطاف گوہر، ۴۲، ۵۱، ۶۰، ۶۸، ۱۱۸، ۱۲۸، ۱۲۹

الٰہی بخش، ڈاکٹر، ۲۸

امیر محمد خان، ۶۵

امین احسن اصلاحی، ۱۵۲

انتظار حسین، ۱۰۱

انصاری، الیاس، ۱۰۶، ۱۲۶

انصاری، جاوید اکبر، ۱۹۵، ۱۹۸

انصاری، ظفر احمد، ۲۳، ۲۴، ۲۲۰

انصاری، ظفر اسحاق، ۱۷۸

انیس احمد، ڈاکٹر، ۱۹۹

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایوبی، صلاح الدین، ۵۶

ایوب خان، جنرل، ۳۳، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۷۶، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۶، ۱۱۸، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۲۸، ۱۷۷، ۱۹۶، ۱۹۸

ب

بزنجو، غوث بخش، ۶۰

بلھے شاہ، ۱۷۲

بورسٹن، ۲۱۰

بھاشانی، ۳۷

بھٹو، ذوالفقار علی، ۳۳، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۱۱۹، ۱۲۴، ۱۲۸، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷

پ

پروٹاگورس، ۱۶۶

پرویز، ۲۰۸

پیر پگاڑا، ۷۴

پیرزادہ، تسنیم، ۱۹۶

پیرزادہ، جنرل، ۶۳، ۶۴

پیرزادہ، حفیظ، ۷۱

ت

تالپور، میر غلام علی، ۳۷

تھانوی، اشرف علی، ۷، ۱۹، ۲۲۰

تھیچر، مسز، ۱۶۹

ج

جالبی، جمیل، ڈاکٹر، ۹، ۲۱، ۹۵، ۱۰۱، ۱۱۹، ۱۸۰، ۲۰۸، ۲۱۹، ۲۲۲، ۲۲۳

جان ایل ایسپوسیٹو، ۲۰۷

جاوید جبار، ۱۴۳

جاوید نذیر، ۷۱

جبریلؑ، ۵۲

جعفر احمد، ڈاکٹر، ۷۹

جعفری، رئیس احمد، ۱۹۴

جلال زئی، موسیٰ خان، ۱۲۵، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۵۰، ۱۵۴

جمیل الزمان، ۱۲۳

جنرل جیلانی، ۷۵، ۸۳

جونیجو، محمد خان، ۸۱

جی ڈبلیو، چوہدری، ۱۱

جے اے رحیم، ۷۰

ح

حافظ، ۱۷۱

حسن عسکری، ۲۲۳

حسن محمود، مخدوم زادہ، ۶۱، ۶۴، ۶۷، ۷۲، ۷۴، ۸۲

حسین احمد، قاضی، ۲۰۵، ۲۰۶

حسین احمد مدنی، ۱۹۶

حضور اکرمؐ، ۱۴۹

حقانی، ارشاد احمد، ۱۹۴

حمید، جنرل، ۶۰

حناجیلانی، ۱۵۴

خ

خرم مراد، ۷۶، ۹۵، ۹۷

خلیفہ عبدالحکیم، ۳۹

خواجہ رفیق، ۷۱

د

دریاآبادی، عبدالماجد، ۲۴

دولتانہ، ممتاز، ۳۷، ۶۹

ڈ

ڈیگال، ۵۶

ذ

ذوالفقار بخاری، ۱۱۲

ر

راشدی، علی محمد، ۱۱۹

رامے، محمد حنیف، ۶۹، ۱۱۹

ربانی، خالد محمود، ۲۷، ۲۸

رحمان، آئی اے، ۴۳، ۸۰

رسل، ۱۶۷

رسولؐ، ۴۲، ۴۳

رشید، راؤ، ۶۰، ۷۸

رشیدالدین خان، ۴

رضوی، بن یامین، ۱۳۸

رعنالیاقت علی خان، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۵۲

رکلے، ۱۷۱

روبس پیئر، ۴۹

روتھ بورل، ۴۵، ۴۶

روسو، ۱۶۶

روشن آراء بیگم، ۵۵

ریاض، ڈاکٹر، ۲۸، ۲۹

ریگینالڈ، ۲۷

ز

زاہداسلام، ۹۶، ۹۷

زبیدہ جلال، ۱۴۳

زیدی، مسعود، ۱۶، ۴۲، ۴۳

س

سارتر، ژاں پال، ۱۶۶

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرسید احمد خان، ۱۶۴، ۲۰۸، ۲۱۹
سکندر مرزا، ۴۸
سلہری، زیڈ اے، ۴، ۵
سلیم احمد، ۱۷۱، ۱۷۲
سلیمان ندوی، ۲۴
سوار خان، جنرل، ۸۳
سہروردی، حسین شہید، ۳۷
سی آر اسلم، ۹۷

ش

شامی، مجیب الرحمان، ۷۲، ۷۶
شاہتاز، نور احمد، ۱۱۱
شاہ حسین، ۵۵
شاہین عتیق الرحمان، ۱۳۸، ۱۴۳
شریف المجاہد، ۳۸، ۳۹، ۱۲۴
شمس الدین، مولانا، ۷۱
شمیم احمد، پروفیسر، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰
شوکت صدیقی، ۱۲۴
شوکت علی، ۷۷
شہاب، قدرت اللہ، ۳۵، ۴۵، ۴۹، ۵۲، ۵۵، ۵۹، ۶۳، ۱۷۷، ۲۰۱
شیر زمان، ڈاکٹر، ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۸
شیریں پاشا، ۸۰، ۱۱۰
شیکسپیئر، ۱۷۱

ص

صدیقی، عطاء اللہ، ۱۴۳، ۱۴۵
صدیقی، مشتاق الرحمان، ڈاکٹر، ۱۰۷، ۱۱۶، ۱۶۴، ۱۷۱
صدیقی، نعیم، ۳۹، ۱۲۱، ۱۲۴
صفدر محمود، ۵

ض

ضیاء الحق، جنرل، ۳۳، ۷۳، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۱۱۰، ۱۲۱، ۱۲۳، ۱۳۶، ۲۰۲

ط

طاہر القادری، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸

ظ

ظفر احمد انصاری، ۲۳، ۲۴، ۲۲۰
ظفر، ایس ایم، ۴۶، ۴۸، ۶۴، ۶۵، ۷۵
ظفر علی، چوہدری، ۲۹

ع

عاصمہ جہانگیر، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۵، ۱۵۴
عائشہؓ، ۱۵۹
عبدالجبار خان، ۵۷
عبدالرشید ارشد، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۱

عبدالرشید، سردار، ۳۷
عبدالوحید، ۷۱
عبدالوحید، جنرل، ۸۴
عبدالمغنی، پروفیسر، ۱۴۰
عثمانی، تقی، ۲۲۵
عثمانی، شبیر احمد، ۷، ۱۹۷، ۲۲۰
عثمانی، ظفر احمد، ۷
عزیز احمد، ۴۵
عطیہ عنایت اللہ، ۱۴۳
علوی، انعام الرحمان، ۶۱
علوی، ڈاکٹر خالد، ۱۴۷، ۱۶۰، ۱۶۸، ۱۷۲، ۱۷۴
عمرؓ، ۱۶۰، ۲۰۵
عمر اصغر خان، ۱۳۸، ۱۴۳
عمر بن عبدالعزیزؒ، ۲۰۵
عمر حیات، ۳۸
عمری، سید جلال الدین، ۱۵۴
عنایت اللہ اسماعیل، ۱۳۹
عیسیٰؑ، ۵۲

غ

غالب، ۱۸۱
غلام اسحاق خان، ۸۴، ۸۵، ۸۶
غلام جیلانی، ملک، ۶۴
غلام نبی پٹھان، آغا، ۷۸

ف

فاطمہ جناح، ۳۵، ۱۹۶، ۱۹۸
فراقی، تحسین، ۲۱۰
فرانکو، ۱۲۲
فرید احمد، ۵۱، ۵۲، ۵۳
فرید، گنج شکر، ۱۷۲
فضل حق، جنرل، ۸۳
فضل الحق، مولوی، ۳۷
فضل الرحمان، ڈاکٹر، ۵۲، ۵۳
فضل الرحمان، مولانا، ۱۹۶، ۱۹۸

ق

قائداعظم، محمد علی جناح، ۳، ۴، ۵، ۶، ۸، ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۲، ۲۳، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۴۸، ۱۹۴، ۲۲۰، ۲۲۲
قیوم خان، ۳۷

ک

کپلنگ، ۱۷۱
کرسٹینا لیمب، ۲۰۲، ۲۱۰
کوثر نیازی، ۷۱، ۱۱۹

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوشک، ڈاکٹر، ۷۵
کھر، غلام مصطفیٰ، ۶۹

گ

گل محمد خان، جسٹس، ۲۷
گوہر رحمان، مولانا، ۱۹۱

ل

لغاری، فاروق احمد، ۸۵
لیاقت علی خان، ۲۳، ۳۵، ۳۷، ۳۹، ۴۰، ۴۶، ۴۸، ۱۵۲

م

مجاہد حسین، ۸۵
مجیب الرحمان، ۶۲، ۶۵، ۶۶، ۶۸
محبوب الحق، ڈاکٹر، ۸۳،
محمد ﷺ، ۱۱، ۵۲، ۵۳
محمد احمد خان، نواب، ۷۱، ۷۳
محمد انور سمہ، ۷۱
محمد سلیم، سید، ۱۶۱، ۱۶۶، ۱۶۷
محمد شفیع، مفتی، ۷
محمد عثمان، ۱۳، ۲۲، ۹۹
محمد علی، چوہدری، ۳۵
محمود بخاری، ۱۹۶، ۱۹۷
محمود حسین، ڈاکٹر، ۳۸
مستری، ایم اے ڈاکٹر، ۲۷، ۲۸
مسعود اشعر، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۴
مشرف، پرویز، ۳۳، ۷۵، ۱۴۳
معین قریشی، ۸۵
مفتی محمود، ۷۳
ممتاز بھٹو، ۷۱
منور مرزا، ۵، ۱۱، ۱۲، ۱۴
منیر نیازی، ۳
مودودی، سید ابوالاعلیٰ، ۱۱، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۳۶، ۳۸، ۴۰، ۷۳، ۱۷۹، ۱۹۷، ۱۹۸، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۱۸
موسیٰ خان، جنرل، ۵۴
میر جعفر، ۱۳۹
میر صادق، ۱۳۹
میکاولی، ۲۱۷

ن

ناظم الدین، ۳۷
ناؤکی سوزوکی، ۱۳۳
نپولین، ۴۸، ۴۹
نجم الحسن عارف، ۱۳۳، ۱۴۴
نعیم صدیقی، ۳۹، ۱۲۱، ۱۲۴
نسیم حسن شاہ، ۱۸

نصر، حسین سید، ۱۷۵، ۱۷۶، ۲۲۱
نگار احمد، ۱۵۴
نگہت سعید خان، ۱۵۴
نواز شریف، ۸۴، ۸۵، ۸۶
نورانی، شاہ احمد، ۷۳
نولز، کرنل، ۲۸

و

وارث شاہ، ۱۷۲
وحید الدین خان، ۲۰۸
وحید قریشی، ڈاکٹر، ۸، ۲۵، ۱۶۵

ی

یحییٰ خان، جنرل، ۳۳، ۴۸، ۵۶، ۵۷، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۸، ۱۲۳، ۱۲۴
یوسف بچ، ۱۱۹

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اماکن

اردن، ۵۵
اسرائیل، ۱۳۵
افغانستان، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷
الجزائر، ۱۹۵
الجیریا، ۱۹۵
امریکہ، ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۴۴، ۲۱۰
انگلستان، ۹، ۱۴۹، ۱۶۹
ایران، ۱۳۵، ۱۴۸، ۱۸۱

ب

بابل، ۱۴۷، ۱۴۸
برطانیہ، ۹، ۱۶۷، ۲۲۵
بلوچستان، ۷۱، ۱۲۴
بنگلہ دیش، ۱۳۶
بھارت، ۹، ۶۵، ۱۳۵

پ

پٹنہ، ۱۴۰
پشاور، ۶۱

ت

ترکی، ۱۳۵، ۱۹۲، ۲۱۷

ج

جے پور، ۷۵

چ

چین، ۱۴۷

ح

حیدر آباد، ۸۱

ڈ

ڈھاکہ، ۶۰، ۶۲، ۶۴، ۶۵، ۶۸

ر

راجستھان، ۷۵
راولپنڈی، ۵۵، ۵۷
روس، ۹
روم، ۱۴۸

س

سپین، ۱۲۲
سرحد، ۷۱
سکھر، ۵
سندھ، ۷۰، ۷۴، ۷۸، ۸۰
سوویت یونین، ۱۳۵، ۱۳۷
سوئٹزرلینڈ، ۱۱۷
سہارنپور، ۲۱۹

ش

شکاگو، ۱۳۷

ع

علی گڑھ، ۱۷۹، ۲۱۸، ۲۱۹

ف

فرانس، ۵۶

ک

کانپور، ۵
کراچی، ۲۷، ۲۸، ۶۰، ۸۱، ۱۲۴
کوئٹہ، ۲۸

ل

لاڑکانہ، ۶۲، ۶۵
لاہور، ۵، ۸، ۵۷، ۶۵، ۷۳، ۱۱۷، ۱۳۸، ۱۵۴، ۱۹۶
لندن، ۱۷۱
لنڈی کوتل، ۵۷

م

مصر، ۱۴۷
ملتان، ۱۱۱، ۱۲۳

ن

نینوا، ۱۴۷

و

واشنگٹن، ۴۵

ہ

ہندوستان، ۵، ۶، ۹، ۶۵، ۲۱۹

ی

یورپ، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۴۴
یونان، ۱۴۷، ۲۱۰

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

P.U.
PRESS